ہیرے کا جگر
غنڈہ گردی، پولیس اور سُراغرسانی کی سچی روئیداد
(میں مرجاؤں گا تو ایک اور جیدا میری جگہ لے لیگا)
عنایت اللہ

پیش لفظ

۶ر اپریل ۱۹۸۱ء کی صبح لاہور میں بنک ڈکیتی اور قتل کے ایک مشہور مجرم غیاثا کو پھانسی دی گئی اور اُسی روز لاہور کی اعظم کلاتھ مارکیٹ میں یونائیٹڈ بنک کی برانچ میں ڈکیتی کی واردات ہوئی جس میں بنک کا چوکیدار قتل ہو گیا۔

ان دو خبروں میں جرم و سزا کا فلسفہ پوشیدہ ہے میں نے اس ناول میں اسی فلسفے کو واقعات اور زیر زمین دنیا کے کرداروں کی صورت میں اس امید پر پیش کیا ہے ـــــ شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات!

غیاثا کی زندگی کے آخری روز بہت سے اخباری نمائندے اُسے ملنے گئے تھے۔ اُس نے سب کو بتایا کہ وہ کون سے عناصر تھے جنہوں نے اُسے سکول ٹیچری سے ہٹا کر اتنا خطرناک مجرم بنایا تھا کہ پولیس اور قانون کا نظام ہل گیا تھا۔ وہ تو سکول میں اُستاد تھا۔ اُس کے ساتھی بتاتے ہیں کہ اُس میں مجرمانہ رجحان کا شائبہ تک نہ تھا مگر مدرسے کا اُستاد مجرموں کا استاد بن گیا۔

جرم و سزا کا دوسرا پہلو ملاحظہ فرمایئے ـــــ جس روز بنک ڈکیتی اور قتل کا ایک مجرم پھانسی چڑھا، اُسی روز بنک ڈکیتی اور قتل کی ایک اور واردات ہو گئی۔

میرے اس ناول کا مرکزی کردار، جیدا آخر میں کہتا ہے ـــــ "میں جا رہا ہوں کل ایک اور جیدا میری جگہ لے لے گا"۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے ـــــ "کیا سزا جرائم میں کمی کر سکتی ہے؟"

بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہرین نفسیات اس سوال کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے تجربوں، تجزیوں اور مشاہدوں کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ سزا یعنی سزائے قید مجرم پیدا کرتی ہے اور جیل خانہ جرائم پیشہ دنیا کا صدر دروازہ ہے۔

۱۹۵۶ء میں ایک غیر ملکی اخبار نے لکھا تھا کہ پاکستان کا دارالحکومت کراچی بین الاقوامی سمگلروں اور جرائم پیشہ گروہوں کا مرکز بن گیا ہے۔ اس اخبار کے حوالے سے یہ خبر پاکستان کے اخباروں میں بھی شائع ہوئی تھی ـــــ یہ خبر غلط نہیں تھی۔

سیاسی لیڈر کرسی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ اس جنگ میں پیشہ ور کرائے کے غنڈوں کا استعمال کھلم کھلا ہو رہا تھا۔ برسر اقتدار پارٹی غنڈوں کے علاوہ پولیس کو بھی مخالفین کی سرکوبی کے لیے استعمال کرتی تھی۔ اس صورت حال میں غنڈہ گردی اور بدمعاشی باعزت پیشہ بن گیا کسی کے متعلق پتہ چلتا کہ سرکاری غنڈہ ہے تو لوگ اُس سے ڈرتے اور اُس کی عزت کرتے تھے۔

اب غنڈہ گردی ہماری سیاست کا باقاعدہ حصہ بن گئی ہے۔

CRIMINOLOGY ، PSYCHOLOGY اور SOCIOLOGY میرے محبوب موضوعات ہیں علمی مطالعہ تو خاصا تھا عملی مطالعہ کے لیے میں نے کراچی کی جرائم پیشہ دنیا کو بہت قریب سے دیکھا۔ اتنی قریب سے کہ میں

اس خوفناک اور پُراسرار مخلوق کے دلوں کی دھڑکنیں سن سکتا تھا اور ان کی سانسوں کی تپش کو محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے چرس کبھی نہیں پی لیکن میں جرائم پیشہ لوگوں میں جن کے ہر سگریٹ میں چرس بھری ہوتی تھی، اس قدر گھل مل گیا تھا کہ ان کی سانسوں سے مجھ پر چرس کا نشہ طاری ہو جاتا تھا۔

میں خاموش تماشائی نہیں محقق تھا۔ میں جرم و جاسوسی کی سنسنی خیز کہانیوں کی تلاش میں نہیں تھا۔ میں ان قانون شکنوں کے سینوں میں جھانک رہا تھا — ان سینوں میں مجھے وہ نظر آ گیا جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں ان سوالوں کے جواب ڈھونڈ رہا تھا:

انسان جرائم پیشہ کیوں بنتا ہے؟

کیا صرف سزا کسی عادی مجرم کو شریف شہری بنا سکتی ہے؟

پولیس اور جرائم پیشہ لوگوں میں دوستانہ مراسم کیوں؟

کتابیں مجھے ان سوالوں کے جواب دے چکی تھیں لیکن زمیں دوز دنیا کی عملی اور حقیقی زندگی کو دیکھنا ضروری تھا کہ کتابیں کہاں تک سچ بولتی ہیں۔

میں ان سوالوں کے جواب اپنی دو کتابوں — "اُس بستی میں" اور "دھتکارے ہوتے انسان" میں اور بے شمار مضامین میں جو مختلف جرائد میں چھپتے رہے ہیں، مشاہدات، دلائل اور علمِ نفسیات کی روشنی میں پیش کر چکا ہوں۔ اِس موضوع پر یہ تیسری کتاب "ہیرے کا جگر" ناول ہے جو تین برسوں کی کاوش سے مکمل ہُوا تھا۔

اِس ناول کا مرکزی کردار "جیدا" مجھے اسی عرصے میں زمیں دوز دنیا میں ملا تھا۔ وہ عربی اور انگریزی بول سکتا تھا اور ڈائری بھی لکھتا تھا لیکن وہ جیب کترا تھا، عام قسم کا جیب کترا نہیں، وہ جرائم پیشہ مخلوق کا پیر و مرشد تھا، بلکہ یوں سمجھیں کہ وہ زمیں دوز دنیا کے شاہی خاندان کا فرد تھا۔

بظاہر ناقابلِ یقین لگتا ہے کہ ایک جرائم پیشہ آدمی اپنی ڈائری لکھتا تھا لیکن میں نے مجرموں کی دنیا میں دو حافظِ قرآن بھی دیکھے ہیں۔

جیدا میرے لیے گائیڈ ثابت ہُوا کئی اور اُستادوں نے مجھے اپنی اپنی پُراسرار زندگی کے مختلف شعبے دکھائے میں نے عصمت فروش بھی دیکھے، ایمان فروش بھی جیبیں کاٹنے والوں سے بھی لمبی لمبی ملاقاتیں ہوئیں اور گردنیں کاٹنے والے رہزنوں سے بھی۔ رشوت خوری کے جرم میں سزا بھگتنے والے تھانیداروں سے بھی گپ شپ رہی اور حریف سیاسی پارٹیوں کے جلسوں میں ہنگامے بپا کرنے والے پیشہ ور غنڈوں اور بدمعاشوں سے بھی تفصیلی بات چیت ہوتی۔

ان سب نے مل کر میرے لیے ایک ناول کا پلاٹ مکمل کر دیا۔ اس کے واقعات اور کردار میری تخلیق نہیں، نہ میں کسی کردار کو کہانی میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے گھسیٹ کر لایا ہوں — یہ ہمارے معاشرے کی کہانی ہے۔ تمام کردار معاشرے کی پیداوار ہیں۔

اس ناول میں آپ کو وہ عوامل اور محرکات دکھائے جا رہے ہیں جو اچھے بھلے بچوں میں مجرمانہ رجحانات پیدا کر دیتے ہیں۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو جنّت کے پانی کی مانند پاک ہوتا ہے۔ اس کے ذہن کو پراگندگی گھر، مدرسے، معاشرے اور ماحول سے ملتی ہے۔ گھر کی گھٹن، پیار اور شفقت سے محرومی اور جذباتی تشنگی گرہ کٹ، اٹھائی گیر، ڈکیت، قاتل، رہزن اور بردہ فروش پیدا کرتی ہے۔

ناول کا عنوان "ہیرے کا جگر" اس لیے رکھا ہے کہ ہیرا بڑی سخت چیز ہوتی ہے مگر، علامہ اقبال کے الفاظ میں — پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر!

کسی کا دل ہیرے کی طرح سخت ہو جائے تو اُسے محبت اور پیار کے پھول کی صرف ایک پتی سے کاٹا جا سکتا ہے۔

میں نے بات ۱۹۵۶ء کی کی ہے لیکن ۱۹۸۱ء تک زمیں دوز دنیا کی آبادی بڑھی ہے کم نہیں ہُوتی — کیوں؟ — جواب اِس ناول میں موجود ہے۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ حکایت لاہور

کراچی کی ہنگامہ پرور رات دامن میں ہزاروں اسرار چھپاتے سلیٹی بادلوں کے ساتھ اڑی جا رہی تھی —— رُت بہار کی تھی —— رومان انگیز، قیامت خیز، سہمی سہمی، علیل سی رُت۔

میونسپل کارپوریشن کی عالیشان عمارت کے گھڑیال نے رات کی نسوں میں مترنّم ارتعاش پیدا کر دیا —— اڑھائی بج رہے تھے۔ رات کی آغوش میں سحر مچلنے لگی تھی۔ جیدا جیب کترا جاگ رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی پاؤں کے چکر اور ہاتھوں کی صفائی سے فارغ ہو کر اپنی زمین دوز بستی میں واپس آیا تھا۔ اپنے ساتھیوں میں بیٹھ کر چرس بھرے سگریٹ کے دو تین لمبے لمبے کش لگا کر اپنے کمرے میں گیا، دیا سلائی جلائی اور میز پر رکھی ہوئی لالٹین کو روشن کیا۔ زرد پیلی روشنی میں چھت کے ساتھ لٹکتے جالوں سے کمرے کی وحشت نکھر آئی۔ اس نے کرسی گھسیٹ کر میز کے قریب کی، دراز میں سے ایک کاپی نکالی اور اسے غور سے دیکھا۔

اُس نے ذرا سی دیر ورق گردانی کی پھر پنسل ہاتھ میں لے کر چند سیکنڈ خلاؤں میں گھورا اور لکھنا شروع کیا:

۳ مارچ ۱۹۵۶ — میری یہ ڈائری پولیس، قانون اور سوسائٹی کے لیے کھلا چیلنج ہے۔ سوسائٹی مجھے ہتھکڑیاں لگا لے، یہ ڈائری قبضے میں لے لے اور میرے خلاف ڈکیتی، سرقہ، جیب تراشی، قتل، اغوا اور بردہ فروشی کے مقدمات چلائے۔ یہ تمام مقدمات خارج ہو جائیں گے —— کیوں؟ — اس "کیوں" کا جواب ڈائری میں موجود ہے۔ قانون اِس کھلی شہادت کو دیکھ کر سر جھکا لے گا اور مجھے جیل میں بند نہ کر سکے گا۔

کل رات ایک سیٹھ کو قتل کیا ہے۔ موت کے خوف سے لوگ کیا کچھ نہیں بتا دیتے میں نے خنجر اُس کے پیٹ پر رکھ کر پوچھا —"اتنی دولت کہاں سے لائے ہو؟"— اُس نے کہا "مہاجرین کے لیے کوارٹر تعمیر کرنے کا ٹھیکہ ملا تھا"— میں نے پوچھا —"کوارٹر کہاں ہیں؟" کہنے لگا —"سکیم ابھی میرے دماغ میں ہے۔ پیسے وصول کر لیے ہیں" — دولت تجوری میں کوارٹر دماغ میں۔ مہاجرین مٹی کی جھونپڑیوں میں اور جھونپڑیاں بارش کے گھٹنے گھٹنے پانی میں کس قدر بھلا منظر تھا۔ خون کے قطرے سبز قالین میں آہستہ آہستہ جذب ہو رہے تھے، اُس کی رگوں میں سے خون نکلتا جا رہا تھا اور یہ خون جیسے میری رگوں میں داخل ہو رہا تھا۔

مجھے انسانوں کے ساتھ ہمدردی نہیں ورنہ یہ دولت مہاجروں میں تقسیم کر دیتا۔ میں خود اپنی دنیا سے نکالا ہوا اور اپنے آپ سے بھاگا ہوا پناہ گزین ہوں۔ مجھے کہیں بھی پناہ نہیں ملی۔ میں کسی کو پناہ نہیں دوں گا۔

جیدا نے تحریر پر نظر ثانی کیے بغیر کاپی دراز میں بند کر دی۔ انگڑائی کے ساتھ جمائی لیتے ہوئے نیچے والے دراز سے بوتل نکال کر ایک نظر دیکھا۔ آدھی وسکی باقی تھی۔ اُس نے بوتل منہ سے لگا لی۔ چند گھونٹ پیئے اور اٹھ کر فرش پر بچھے بستر میں سو گیا —— گہری، اطمینان کی نیند!

اُس کی آنکھ کھلی تو دوسری رات کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔

جیدا کے پاؤں کا چکر زمین و آسمان کی گردش سے کہیں زیادہ تیز تھا۔ ڈوبتے اُبھرتے چاند تاروں نے بے شمار راتیں گزار دیں جن کے اندھیرے اجالوں کی ہولناکیاں اور اسرار، جیدا کی پنسل، جیدا کی ڈائری میں محفوظ کرتی گئی۔

ایک اور رات گزر رہی تھی کتنے ستارے ٹوٹ چکے تھے، کتنے ٹوٹ رہے تھے۔ چاند فلک بوس عمارتوں کے عقب میں اونگھ رہا تھا۔ کراچی شہر دم بھر کے لیے سو گیا تھا۔

جیدا جاگ رہا تھا۔ ڈائری اور وہسکی کی بوتل اس کے سامنے کھلی پڑی تھی۔ چرس کا دھواں کمرے کی ویرانی میں بھٹک رہا تھا اور جیدا لالٹین اور اپنے درمیان پھیلے ہوئے خلا میں گم تھا۔ اس نے پنسل اٹھائی کچھ سوچا پیشانی کے شکن گہرے ہو گئے اور اس نے پنسل میز پر رکھ دی۔ ڈائری کھول کر غیر ارادی طور پر ورق الٹنے لگا۔

وہ کسی صفحے پر رک جاتا، ذرا سا پڑھتا اور ورق الٹ کر کسی اور صفحے پر رک جاتا۔ اس کی نگاہوں میں ایسا تاثر تھا جیسے کوئی انسان کسی آسیب زدہ ویران گھر میں جھانک رہا ہو۔

اکتائی ہوئی سی جمائی لے کر جیدا اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جیسے اُسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈائری بند کر کے دراز میں رکھ دی اور کچھ سوچنے لگا۔ اس نے آنکھوں کو یوں سکیڑا جیسے گزرے ہوئے ماہ و سال میں بہت دور جھانک رہا ہو اور گزری ہوئی عمر کے ریگزار میں بکھرے ہوئے لمحات چن رہا ہو۔

وہ پانچ دفعہ جیل ہو آیا تھا۔ تین دفعہ تشکیلِ پاکستان سے پہلے ہندوستان میں اور دو بار پاکستان میں بھی کبھی چھ ماہ کے لیے کبھی ایک سال کے لیے اور آخری بار اسے نو سال قید کی سزا ملی تھی مگر اپیل میں بری ہو گیا تھا۔ ڈکیتی کا یہ کیس ثابت نہیں ہو سکا تھا۔ اس سے پہلے اُسے سزائے موت بھی مل چکی تھی لیکن وہ ہائی کورٹ میں ختم ہو گئی تھی۔ اُسے شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا گیا تھا اور دو انسانوں کا خون کراچی کی نم آلود فضا میں گم ہو گیا تھا۔

جیدا کراچی کی جرائم پیشہ مخلوق کا نامی گرامی اُستاد تھا۔ گذشتہ پچیس برس سے وہ قانون ہتھکڑیوں اور انسانوں کے خون سے کھیل رہا تھا۔ پاکستان بنتے ہی وہ بمبئی سے کراچی آ گیا تھا اور اس نے یہاں اڈہ قائم کر لیا تھا۔ دو تین ہی سال میں اُس نے یہاں کے چار پانچ جیب تراش اور قفل شکن خرید لیے اور دس بارہ نوعمر لڑکے مختلف جرائم کے لیے تیار کر لیے تھے۔

کراچی کی آبادی نہایت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی چوراچکوں میں بھی اضافہ ہو رہا تھا، مگر ان کی سرگرمیاں غیر منظم تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو بھی اکثر دھوکہ فریب دیتے رہتے تھے۔ یہ جیدا تھا جس نے چار پانچ ماسٹر غنڈوں کو جمع کر کے کراچی کو حصّوں میں تقسیم کیا اور جرائم پیشہ لوگوں کے لیے قواعد و ضوابط بنا دیئے اور ایسی فضا پیدا کر دی کہ وہ ایک دوسرے کا پورا پورا احترام کرنے لگے، پھر ان کے گروہ پھیلتی ہوئی کراچی میں خوف و ہراس بن کے پھیلتے گئے اور کراچی بمبئی بن گیا۔

جیدا ہر جرم میں ماہر تھا لیکن جیب تراشی میں اس کا جواب نہیں تھا۔ بڑے بڑے استاد اُس سے ہاتھ کی صفائی سیکھنے آتے تھے۔ کراچی آنے کے تین سال بعد اس کے گروہ میں کم و بیش چالیس افراد تھے اور جیدا اُن کا پیر استاد تھا۔ اس کے گروہ میں گیارہ سال کے بچے سے لے کر پچاس برس کے بوڑھے تک شامل تھے۔ وہ ہر فن مولا تھا لیکن "جیب کترا" اُس کا تخلص بن گیا تھا۔

سارے پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کے جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ اس کا کاروبار چلتا تھا۔ ان کے ساتھ اُس نے معاہدے طے کر رکھے تھے۔ کچھ عرصے سے اس نے لڑکیوں کی خرید و فروخت کا پیشہ بھی شروع کر

دیا تھا۔ شمالی پاکستان سے اغوا کی ہوئی لڑکیاں کراچی میں اس کے ہاتھوں بکتی تھیں اور وہ انہیں آگے چلا دیتا تھا۔ اُس کے پاس دو بلیک میلر بھی تھے جن کی زد سے کوئی محفوظ نہیں تھا۔ اسی پیشے کو ذرا سا فروغ دے کر اس نے چار مغویہ لڑکیاں اپنے پاس رکھ کر دھندے پر لگا دی تھیں۔

بستے رستے گھر سے پندرہ سولہ برس کی لڑکی کو اغوا کرنا اور اسے بازارِ حُسن کی زینت بنا دینا آسان کام نہیں تھا۔ لیکن جیدا کے پاس کچھ ایسے بے ضرر طریقے تھے کہ وہ شریف گھرانوں کی دوشیزاؤں کو زیادہ سے زیادہ تین ماہ کے عرصے میں نیپئر روڈ کے کسی کوٹھے پہ بٹھا دیتا تھا۔ اگر کوئی لڑکی جیدا کی راہ پر نہ آئے تو اُس کے پاس دو اور بے ضرر طریقے تھے ——— خنجر اور پستول!

ان چاروں لڑکیوں کے لیے ان دونوں چیزوں کو استعمال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس کے دونوں بلیک میلر ایسی لڑکیوں کو راہ پر لانے کے بہت سے گُر جانتے تھے اور اکثر زمین ہموار کر لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ جیدا کی شخصیت میں کچھ ایسا سحر اور جلال تھا جس کے سامنے چاروں لڑکیوں کی تندی اور تیزی پہلے ہی روز ختم ہو گئی تھی۔ وہ چاروں اس کے ہاتھ یکے بعد دیگرے چھ چھ سات سات ماہ کے وقفے سے آئی تھیں پہلے روز تو ان میں سے ہر ایک مرنے مارنے پر تلی ہوئی تھی ——— "ذبح کر دو.... گولی سے اڑا دو.... عصمت نہیں بیچوں گی۔"

چند دنوں کے بعد ہی ان کا یہ حال تھا جیسے انہیں اس شخص کے ساتھ محبت ہو گئی ہو۔ اس لیے نہیں کہ جیدا خوبرو نوجوان تھا بلکہ اس لیے کہ اس کی راہ گم کردہ شخصیت میں کچھ ایسا اثر تھا، ایسا سحر کہ لڑکیاں بے بس ہو جاتی تھیں۔

بالی ان سب سے زیادہ اکھڑ تھی۔ اسے جیدا کا ایک بلیک میلر راولپنڈی سے لایا تھا جو ایک اکھ پتی کو بلیک میل کرنے وہاں گیا تھا۔ بالی دسویں جماعت میں پڑھتی تھی اور چوری چھپے سینما جاتی تھی۔ اس بلیک میلر کی نظر بالی پر پڑی تو اس نے اُسے "دامِ محبت" میں اُلجھا لیا اور وہ اسے کراچی لے آیا۔

بالی کراچی میں پہنچی تو اس کا "محبوب" کراچی کی اندھی گلیوں میں گم ہو گیا۔ اس کی جگہ ماہرینِ فن نے لے لی جنہوں نے بالی کو بیسوائی کی راہ پر ڈالنے کے سب جتن کیے لیکن وہ اس راہ پر نہ آئی۔ جیدا کو علم ہوا تو اس نے اس کے جسم کو ہاتھ لگائے بغیر باتوں ہی باتوں میں اسے یوں رام کر لیا کہ لڑکی محسوس ہی نہ کر سکی کہ اس نے اپنے جسم کو ہر رات بیچنا شروع کر دیا ہے۔

بالی نے کتنی بار جیدا سے رو رو کر کہا ——— "میں نے تو اپنے آپ کو تمہارے لیے بیچ دیا ہے، کبھی تو کہہ دو، بالی! میں تجھے چاہتا ہوں۔ آجاؤ، میرے قریب آجاؤ۔"

جیدا نے اس کا دل رکھ لیا لیکن ذرا دور رہ کر۔ وہ محبّت کرنا نہیں جانتا تھا۔ اُس کی دنیا میں محبّت ایک بے معنی لفظ تھا۔ اس کا کردار نفرت، تشدّد اور اذیّت سے عبارت تھا۔ وہ ڈاکو تھا، دولت لوٹتا تھا لیکن اسے دولت سے بھی محبّت نہ تھی۔ جیب کاٹی یا چوری کی اور مال اپنی نظروں سے بھی اوجھل کر دیا جیسے کسی نے کسی سے کوئی چیز چھین کر پھینک دی ہو۔

اس کی عمر تیس برس تھی۔ چہرے پر حقارت اور بربریّت کا تاثر۔ آنکھوں میں ایک تلاش اور تجسّس۔ پلکوں تلے ایک چمک سی تھی جس میں ایک حد تک جاذبیّت تھی اور اس جاذبیت میں تشنگی کے آثار بھی ملتے تھے۔ خد و خال کا مجموعی تاثر اداس اداس تھا۔ ذرا قریب سے دیکھو تو اداسیوں کے اس گھنے سائے میں معصومیّت کا بھی شک ہوتا تھا اور چہرے کی ان کیفیتوں نے اسے ایسا روپ دیا تھا کہ دیکھنے والے اسے عام سا آدمی سمجھ کر نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ عورتوں کے لیے اس میں کوئی اور ہی کشش تھی۔

جیدا اپنی قوت سے نہیں اپنی کمزوری سے آگاہ تھا۔ جیدا کی باقاعدہ تعلیم حروف شناسی تک ہی تھی لیکن اس کا مطالعہ خاص تھا۔ جرائم پیشہ زندگی میں مصروف رہتے ہوئے اس نے انگریزی اور عربی پڑھ لی تھی جرائم سے متعلق لٹریچر اس کا محبوب موضوع تھا۔

آج کی رات جیدا نے ڈائری کھولی کہیں کہیں سے پڑھ کر اکتاہٹ سے دراز میں بند کر دی اور کچھ سوچنے بیٹھ گیا۔ شام اسے ساتھیوں نے کہا تھا — "ناز نہیں مانتی، تم ہی کچھ کرو استاد!"

کچھ دن پہلے جیدا نے ایک طرح دار، فیشن زدہ نوجوان دوشیزہ —— ناز — پانچ سو روپے میں خریدی تھی اور اسے اپنے تین ساتھیوں —— منّا، ٹیپو اور بادل — کے حوالے کر دیا تھا کہ وہ اسے دھندے کے لیے تیار کریں۔ اس کا خیال تھا کہ ناز چونکہ محبت کے فریب میں گھر سے بھاگی ہوئی ہے اس لیے وہ کنواری نہیں ہو سکتی اور وہ آسانی سے اس پیشے کو قبول کر لے گی لیکن اس کے ساتھی آج تیسری دفعہ اُسے بتا چکے تھے کہ یہ لڑکی مشکل سے ہی مانے گی۔ یہ تو بالی سے بھی زیادہ اکھڑ ثابت ہوئی ہے۔

گیارہ دن اکارت گئے۔ اس عرصے میں دو ایک بار جیدا ناز کے سامنے ہوا تھا اور اسے کہہ آیا تھا کہ اس جال سے نکلنا ناممکن ہے، ناحق اپنے آپ کو پریشان نہ کرو۔

"جان سے مار دو" —— ناز نے سینہ تان کر کہا تھا — "اپنے آپ کو ذلیل نہیں کروں گی۔"

جیدا نے کچھ کہنے کی بجائے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا تھا جن کا ناز سامنا نہ کر سکی تھی اور اُس نے محسوس کیا تھا جیسے ان آنکھوں نے ایسی شعاعیں اس کے جسم میں داخل کر دی ہیں جو اُس کی نس نس میں اُتر گئی ہیں۔ جیدا اور کچھ کہے سُنے بغیر چلا آیا تھا۔

جیدا نے پہلے ہی چار لڑکیوں کو دھندے پر لگا رکھا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اس کاروبار کو وسیع کرے گا۔ ناز کے آنے سے پہلے ایک بار اُسے خیال آیا تھا کہ نوعمر بچیوں کو خرید کر پیشے کے لیے تیار کرنا زیادہ آسان اور مفید ہے۔ پودے سے پنیری زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ پودے کو اکھاڑ کر دوسری جگہ لگانے میں دقّت ہوتی ہے اور مرجھا جانے کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اُس نے آٹھ برس کی ایک مغویہ بچی چار سو روپے میں خرید لی تھی۔ اس بچی کو پنجاب کی ایک پارٹی گوجرانوالہ سے اغوا کر کے کراچی لائی تھی۔ جیدا اسے خرید کر گھر لایا تو اس کا رو رو کر بُرا حال ہو رہا تھا۔

اُس وقت تک اُس کا پالا جوان لڑکیوں کے ساتھ ہی پڑا تھا۔ بچے سے نپٹنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ وہ چاہتا تو اُس کا گلا گھونٹ کر اُسی کمرے میں دفن کر دیتا جہاں چار لاشیں پہلے ہی دفن کی جا چکی تھیں لیکن اس بچی کی چیخ و پکار نے جیدا کا دل ہلا دیا تھا۔

جیدا نے اُسے کرسی پر بٹھایا تو وہ اچھل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ رو رو کر اس کی گھگھی بندھ گئی تھی۔ آنکھیں سوج گئی تھیں معصوم ہچکیاں اور "ہائے امی!" "ہائے ابّو جان!" کی دردناک صدائیں جیدا کے ویران کمرے کی دیواریں ہلا رہی تھیں۔

جیدا نے دیوار کا سہارا لے لیا اور روتی ہوئی بچی کو دیکھنے لگ گیا۔ دوسرے کمرے سے بادل بید کی چھڑی اٹھائے آپہنچا اور کڑک کر بولا — "چپ ہو جا حرامزادی! کھال اُدھیڑ لوں گا۔"

لڑکی ہولناک چیخ مار کر فرش پر گر پڑی — "امّی جان! ابّو جان! جلدی آؤ۔ امّی جان! بھاگ کے آؤ۔"

جیدا نے لپک کر بچی کو اٹھا لیا اور بولا — "بادل! بازار سے ٹافیاں اور دو چار کھلونے لے آؤ۔"

اُس کے ہونٹ مسکراہٹ سے محروم تھے۔ یہ ہونٹ اگر کبھی مُسکراتے تھے تو یہ مسکراہٹ طنز اور زہرخند سے بھرپور ہوتی تھی۔ اس کے پاؤں میں چکر اور ہاتھوں میں بے چینی تھی جسم پھُرتیلا اور بازوؤں میں قوت خنجر بازی اور [illegible] چلانے میں وہ ماہر تھا۔ خالی ہاتھ خوب لڑتا تھا۔

عام چوروں کی طرح وہ زبان کا کچّا نہیں تھا۔ بولتا کم تھا اور جب بولتا تھا تو برموقعہ اور برجستہ بولتا تھا۔ اس کے بولنے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ اس کوشش میں ہو کہ کوئی لفظ بے اثر نہ جائے۔ پستول کی گولی کی طرح کام کرے۔ اس کی زبان اور افعال میں ہم آہنگی تھی۔ جو کہتا تھا وہ کر کے دکھاتا تھا اور جو نہ کر سکے اس کے متعلق بات ہی نہ کرتا تھا۔ اسے نیکی کے نام سے جیسے نفرت تھی اور اپنی اس نفرت کا اظہار وہ ایک ایسی مسکراہٹ سے کرتا تھا جو طنز اور اذیّت پرستی سے بھرپور ہوتی تھی۔

زمین دوز دنیا والے اسے "جیدا جیب کترا" کے نام سے یاد کرتے تھے لیکن وہ عام قسم کے جیب کتروں اور چور اچکوں سے مختلف تھا۔ اس کے ساتھیوں کا تو یہ حال تھا (اور ہر چور کا یہی حال ہوتا ہے) کہ اٹھتے، بیٹھتے، سوتے جاگتے، جرم و گناہ کے خیالات اور نت نئے ارادوں کو سینے سے چپکائے رکھتے تھے۔ لوٹ مار کی جیب کاٹی، کہیں ایک آدھ تالا توڑا، چند روز عیاشی کی اور نئے شکار کی دُھن لگ گئی لیکن جیدا مختلف قسم کا مجرم تھا۔

وہ واردات کر کے بھولتا نہیں تھا اور نہ ہی امیروں کو لوٹ کر غریبوں کی امداد کرنے والا روایتی ڈاکو تھا۔ اس کے جسم میں ایسی قوت تھی کہ اسے جاننے والے اس کے منہ آنے سے ڈرتے تھے کم لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ اُس کی یہ قوت محض جسمانی نہیں۔ وہ خود بھی اس حقیقت سے واقف نہیں تھا۔ وہ اتنا ہی جانتا تھا کہ اس کے سینے میں آگ لگی ہوئی ہے جو صرف خون اور آنسوؤں سے ٹھنڈی ہوتی ہے مگر وہ بھی ذرا سی دیر کیلئے۔ کسی کو قتل کر دینے میں اسے ایک گونہ قرار ملتا تھا کسی کے پاس روپیہ پیسہ دیکھ کر چھین لینے میں اسے مزہ آتا تھا۔ ایسی روحانی لذت حاصل ہوتی تھی کہ اس کی رگ رگ آسودہ ہو جاتی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو کبھی طاقتور نہ سمجھا تھا، اپنے آپ کو کبھی انسان بھی نہیں سمجھا تھا۔

مدت گزری، شاید پچیس برس یا اس سے بھی پہلے کی بات ہے کہ اُس نے انسانیّت کے ساتھ اپنا رشتہ کسی کی جیب کی طرح کاٹ کر پھینک دیا تھا۔ اُس نے اپنی ذات کی زنجیریں توڑ ڈالی تھیں اور وہ آزاد ہو گیا تھا، مگر انسان ہزار کوشش کرے، وہ انسانیّت سے رشتہ توڑ نہیں سکتا، اپنی ذات کی زنجیریں توڑ دینے کے باوجود اپنا قیدی رہتا ہے۔ جیدا کی یہ کیفیّت اُس کی ڈائری کے ہر ورق پر نظر آتی تھی۔

انسانی نفسیات کے کچھ اصول ہیں جو بدل نہیں سکتے۔ یہ اٹل ہیں۔ کوئی انسان ان سے بھاگ نہیں سکتا۔ ان سے منحرف نہیں ہو سکتا۔ شعوری طور پر بعض انسان سمجھتے ہیں کہ انہوں نے نفسیات کے اصولوں کو توڑ دیا ہے لیکن یہ اصول انسان کے ذہنِ لاشعور پر قابض ہوتے ہیں اور اسے اپنے تابع رکھتے ہیں۔

اپنی ڈائری کے ایک ورق پر جیدا اپنے کسی جرم کی مختصر سی روئیداد یوں لکھتا ہے جیسے وہ ہلاکو ہو، ہٹلر ہو، ساری دنیا کو اپنے پاؤں کے نیچے سمجھتا ہو مگر اسی ڈائری میں اس کی نفسیاتی کمزوریاں اور محرومیاں بھی نظر آتی ہیں۔

[illegible] کے بعض اوراق سے پتہ چلتا ہے جیسے یہ کسی نامی گرامی قانون شکن کی نہیں، کسی بچے کی تحریر ہے جو بھٹک [illegible] [illegible] سے محروم کیا ہے، یہ بچہ رو رہا ہے اور اُس انسان کی تلاش میں ہے جو آئے اور اُس کے آنسو پونچھے

تھوڑی دیر بعد آٹھ سال کی بچی رو رو کر اپنے سامنے پڑے ہوئے ٹافیوں کے ڈھیر کو غصّے سے سارے کمرے میں بکھیر رہی تھی "نہیں لوں گی ٹافیاں۔ مجھے امّی جان کے پاس لے چلو" — اس نے سارے کھلونے پاؤں کی ٹھوکروں سے توڑ دیئے اور ہچکیاں لے لے کر روتی رہی۔

"بادل!" — جیدا نے غیر معمولی نرم مزاجی سے کہا — "تم اپنے کمرے میں چلے جاؤ میں سنبھال لوں گا"۔

"اچھا سنو منّی!" — جیدا نے اسے گود میں اٹھاتے ہوئے کہا — "پہلے چپ ہو جاؤ پھر امّی کے پاس لے چلوں گا"۔

بچی چپ ہو گئی۔

"دیکھو منّی! اب رات بہت گزر گئی ہے" — جیدا نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے کہا — "اندھیرے میں گاڑی نہیں چلتی۔ میرے پاس سو جاؤ، صبح سویرے تمہیں امّی کے پاس لے چلوں گا"۔

بچّی کو اغوا کرنے والوں نے نہ جانے کتنی بار یہ وعدے دے کر اسے بہلایا تھا۔ جیدا کوئی نئی بات تو نہیں کہہ رہا تھا۔

"نہیں" — بچی نے ہچکی لے کر کہا — "تم جھوٹ بولتے ہو۔ وہ پہلے والے آدمی بھی ایسے ہی کہتے تھے"۔

جیدا نے بیساختگی سے اپنا گال بچّی کے گال کے ساتھ لگا دیا اور اس کے گال کا بوسہ لے کر کہا — "میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا منّی!.... میں نے ....."

وہ چپ ہو گیا۔ جانے وہ کیا کہنے لگا تھا کہ دل اچھل کر اس کے حلق میں آن اٹکا۔ جیدا کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس نے پیار کیا تھا۔ ایک روئی جیسے ملائم گال کے گداز کو محسوس کیا تھا۔ اس کی روح نے انوکھا سا ذائقہ چکھا اور نہ جانے کس نے اس کے اپنے ہی سینے میں اُٹھ کر اس کی جرائم زدہ آنکھوں میں دو آنسو بھر دیئے۔

بچی کو اغوا کرنے والوں نے کئی بار کہا تھا اور پیار سے کہا تھا کہ وہ اسے امّی کے پاس لے چلیں گے لیکن بچی کے گالوں کو دو ہونٹوں نے کبھی نہیں چھوا تھا اور نہ ہی اس کے رونے پر کسی کی آنکھ میں کبھی آنسو آیا تھا۔ جیدا ابھی محسوس ہی نہیں کر سکا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں لیکن بچی نے یہ آنسو دیکھ لیے تھے۔

اس کے گال جیدا کے پیار کو ابھی تک محسوس کر رہے تھے۔ ایک مہینہ ہوا اُسے اغوا کیا گیا تھا اور اس طویل مدت میں یہ پہلا بوسہ تھا جس سے اُسے تسکین ہوئی تھی۔ وہ چپ ہو گئی۔

"تم میرے اچھے ماموں ہو" — بچی نے دونوں باہیں جیدا کے گلے میں ڈال دیں اور رخسار اس کے گالوں سے رگڑنے لگی تھی۔

جیدا کے سینے میں ہلچل بپا تھی۔ بند توڑ کے آنے والے سیلاب کی طرح امڈتے ہوئے جذبات نے اس کی پسلیاں بھی ہلا ڈالیں۔ اس پر ایسی کیفیت طاری ہو گئی کہ وہ معصوم سی بچی کے سامنے بے بس ہو گیا تھا۔ وہ اور کچھ نہ کہہ سکا نہ ہی کچھ سوچ سکا۔ اُسے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی نے اسے دو ٹکڑے کر دیا ہو اور اس کی ساری قوتیں، قتل اور مار دھاڑ کے تمام حربے، رہزنی اور جیب تراشی کے سارے داؤ پیچ کانچ کی چوڑیوں کی طرح چکنا چور ہو کر بکھر گئے ہوں۔ بجلی کی لپک کی طرح اس کے دل میں یہ خیال بھی کوندا کہ بچی کو کھڑکی سے باہر پھینک دے لیکن یہ خیال آیا اور گزر گیا۔

"ماموں نیند آ رہی ہے" — بچی نے جیدا کو جھنجھوڑ دیا۔

چند لمحے بعد بچی فرش پر بچھے ہوئے بستر پر جیدا کے ساتھ لگ کر سو رہی تھی لیکن جیدا جاگ رہا تھا۔ اس کا انگ

انگ جاگ رہا تھا۔ اس کے وجود میں ایک بچہ — "امّی! امّی" — پکار رہا تھا۔

وہ چت لیٹا ہوا تھا اور اس کی نظریں اندھیرے میں چھت پر کچھ تلاش کر رہی تھی۔ اسے کچھ یاد آیا چاہتا تھا بہت ہی پرانا، صدیوں پرانا زمانہ۔

یادوں کی کڑیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اُس نے خیالوں کی تاریکی سے نکل بھاگنے کو ہاتھ پاؤں مارے مگر دھندلی سی کچھ باتیں اس کے گرد تتلیوں کی طرح اڑتی پھر رہی تھیں کسی ایک تتلی کو بھی پکڑ نہ سکا۔ اسے کچھ یاد آیا چاہتا تھا جسے وہ یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ کچھ یاد کرنا چاہتا تھا جو اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔

بچی کے سوتے ہوئے جسم کے گداز میں وہ بھولے بسرے خیالوں سے آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ وہ رات بھر اذیّت ناک بے چینی اور تلخی سے دوچار رہا لیکن اس تلخی میں اس نے ایک گونہ لذّت بھی محسوس کی اور ایسے ہی تلخ و شیریں خیالوں کے زیر و بم میں رات گذر گئی۔

دوسری صبح پاکستان ایکسپریس جیدا اور بچی کو لیے، سندھ کے ریگستانوں کا سینہ چیرتی، گوجرانوالہ کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ جیدا اپنے ساتھیوں کو کچھ بتائے بغیر جا رہا تھا۔

رات کے دس بج رہے تھے جب جیدا بچی کو انگلی پکڑواتے ہوئے گوجرانوالہ ریلوے سٹیشن سے نکل رہا تھا۔ بچی نے اسے بتایا تھا کہ بسوں کے اڈے سے وہ گھر کا رستہ جانتی ہے۔ جیدا بھلا پاکستان کے کون سے اڈے کو نہیں جانتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اور بچی اڈے کے قریب تانگے سے اترے تو بچی نے کہا — "ماموں اس طرف!"

دس منٹ کا راستہ طے کر کے جب وہ ایک گلی کا موڑ مڑ رہے تھے تو بچّی نے چیخ کر کہا — "وہ رہا ہمارا گھر!"

جیدا رک گیا۔ اس نے بچی سے کہا — "منّی! تم جاؤ۔ میں یہیں سے لوٹ جاتا ہوں"۔

بچی مچلنے لگی "ماموں تم بھی چلو" — مگر جیدا نے اسے اکیلے ہی بھیج دیا۔

بچی کے گھر کے سامنے بجلی کا بلب روشن تھا۔ وہ تیز قدم چلتی اور مڑ مڑ کر دیکھتی اپنے دروازے پر جا پہنچی دستک دے کر چلّائی — "امّی جان! ابّو جان!"

جیدا گلی کی نکڑ میں چھپ چکا تھا اور آنکھ بچا کر دیکھ رہا تھا۔ دروازہ کھلا۔ ماں نے خوشی اور حیرت سے چیختے ہوئے بچی کو سینے سے لگا لیا اور وہ دیوانوں کی طرح چلّائی — "پروین آ گئی، پروین آ گئی"۔

جیدا نے ایک جواں سال مرد کو بھاگ کر باہر آتے دیکھا۔ پھر اس نے محلّے کے کئی اور دروازے کھلنے کی آوازیں سُنیں۔ پھر ایک ہجوم اور ایک شور — "مبارک ہو..... اری! تو کہاں تھی؟"

اس شور و غل میں سے ننھی سی چہکتی ہوئی سی آواز اُبھری — "ایک ماموں مجھے بڑی دور سے لائے ہیں" بچّی نے اشارہ کیا — "وہ وہاں سے واپس چلے گئے ہیں"۔

جیدا نے کئی چہرے اپنی طرف گھومتے ہوئے دیکھے اور وہ سکون کا گہرا سانس لے کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

جب وہ کراچی پہنچا تو ساتھیوں نے بچّی کے متعلق پوچھا۔

"بیچ آیا ہوں مصیبت کو" — جیدا نے صاف جھوٹ بولا اور اُسی روز اپنے تمام گماشتہ اور چھوکروں کو سختی سے کہہ دیا کہ آئندہ کوئی بچہ اغوا نہ کرنا، اور کوئی نئی عورت بھی نہ لانا۔ اپنے ہاں چار چل رہی ہیں، وہی بہت ہیں۔

جیدا نے اس بچی کو بھول جانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اس کے ذہن میں اَنمٹ نقش بنتی چلی گئی۔

جس رات وہ گوجرانوالہ سے واپس آیا تمام رات بے چین رہا تھا۔ چھٹانک بھر چرس پی جانے کے باوجود اُسے نہ چین آیا نہ نیند نصیب ہُوئی تھی۔

مرغ اذانیں دے رہے تھے تو وہ ڈائری کھولے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے لکھا:

۱۵ جنوری ۱۹۵۷ء

میرے سینے میں ایک گمشدہ بچّہ رو رہا ہے۔ پچیس برس پہلے میں نے اسے مار دیا تھا اور خود آرام سے جی رہا تھا۔ ایک معصوم بچی نے اُسے پھر زندہ کر دیا ہے۔ مُنّی کو اُس کے ماں باپ کے حوالے کر آیا ہوں۔ اسے کس کے حوالے کروں؟ میری قوّت اپنی ہی کمزوری میں دم توڑ رہی ہے۔ کسی کے خون کی ضرورت ہے۔

کراچی کا ہنگامہ اور شور اُبھرتے سورج کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ جیدا پر تکلیف دہ سی غنودگی طاری تھی۔ اُس نے ایک بار پھر سونے کی کوشش کی لیکن آنکھ نہ لگ سکی۔ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں جھانکا۔ مُنّا، ٹیپو اور بادل گہری نیند سو رہے تھے۔ برآمدے میں تین نوعمر لڑکے کمبلوں میں لپٹے پڑے تھے۔ وہ جیدا کے نئے شاگرد تھے۔ اُس نے پاجامہ نما پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہُوئے ایک لڑکے کو پاؤں کی ٹھوکر سے جگایا اور دو روپے اُس کی طرف پھینک کر کہا — "یہ لو، روٹی کھا لینا اور آج چھٹی کرو" — اور باہر نکل گیا۔

وہ اس طرح فٹ پاتھ پر سر جھکائے چلا جا رہا تھا جیسے کسی بوجھ تلے دبا ہُوا ہو۔ وہ بے دھیان جا رہا تھا اسی کیفیّت میں بالی کے کوٹھے پر پہنچ گیا جو اپنے کمرے میں بے حس لاش کی طرح پڑی تھی۔ اُس کا دلال جاگ رہا تھا اُس نے جیدا سے کہا — "اسے نہ جگائیے، رات بھر دھندا کمایا ہے۔"

جیدا کچھ کہے بغیر آگے بڑھا اور فرش پر بچھی ہُوئی دری پر لیٹ گیا۔ فوراً ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

اُس کی آنکھ کھلی تو شام کا دھندلکا گہرا ہو رہا تھا۔ اس کے اعصاب ٹھکانے آ چکے تھے۔ اُسی رات ٹیپو نے اُسے بتایا تھا کہ ایک مال ہے، بہت سستا۔ جیدا کہہ چکا تھا کہ آئندہ یہ کاروبار بند کر دیا جائے لیکن ٹیپو نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ ایک جھلک دیکھ لو اور وہ رضامند ہو گیا چنانچہ اگلی شام کو ایک اٹھارہ سالہ حسین و جمیل لڑکی اُس کے ہاتھ آ گئی تھی۔ اس کا نام ناز تھا اور وہ تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔

ناز حیدرآباد سندھ کے ایک متوسط گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے ایک بھائی نے بی۔ اے کر لیا تھا، دوسرا سیکنڈ ایئر میں تھا۔ ناز آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ گریجویٹ بھائی کو اچھی ملازمت مل گئی اور بڑے لوگوں میں اُٹھنے بیٹھنے لگا۔ حادثہ یہ ہُوا کہ اُس نے انگریزی تعلیم، اچھی ملازمت اور اونچے درجے کی سوسائٹی سے مغرب پرستی کے اثرات قبول کیے جنہوں نے اس کی مشرقیت کو ختم کر دیا۔ اسے زندگی میں پہلی بار محسوس ہونے لگا کہ اُس کا خاندان دقیانوسیت کے اندھیروں میں پڑا ہے۔

کالج کے دوران اُس کے شب و روز کا چکر گھر سے کالج اور کالج سے گھر تک محدود تھا، لیکن اس کے سامنے اب حدود نہ تھیں۔ وہ دوستوں کے گھروں میں جانے لگا۔ اس نے وہاں ریڈیو اور صوفے دیکھے ریشمی پردے دیکھے اور دوستوں کی نیم عریاں بیویاں، سالیاں اور بہنیں دیکھیں، نائیلون کی اوٹ سے جھانکتے ہُوئے پُرشباب نسوانی اعضا دیکھے اور فیشن زدہ مسکراہٹیں دیکھیں۔ وہ ان کے قریب پہنچا اور ان سے متعارف ہُوا۔

اس کے برعکس اُس نے جب کبھی اپنے گھر کو دیکھا تو جھینپ گیا۔ اس کی بہن اور ماں برقعے میں باہر نکلتی تھیں، پردے میں رہتی تھیں۔ باپ کو شلوار پہنے دیکھ کر اسے گھٹن محسوس ہُوتی اور اپنا خاندان گھٹیا نظر آیا۔

اُس نے باپ سے پوچھے بغیر ناز کا برقعہ اتروا دیا۔ بوڑھا باپ جو ذرا سی پنشن اور بیٹے کے آسرے پر جی رہا تھا بیٹے کی راہ میں حائل نہ ہو سکا۔ وہ اس کج روی کو ناپسند کرتے ہوتے بھی مزاحم نہ ہُوا۔

اب دونوں بھائی مشرقیّت کو ختم کرنے پر تلے ہُوتے تھے جسے وہ اپنی پسماندگی کا باعث سمجھتے تھے۔ ٹھہرے سُلجھے انداز میں پُروقار زندگی بسر کرنے والے کنبے کی باگ ڈور انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔

بڑے بھائی نے بازار جا کر صوفہ سیٹ، ریڈیو سیٹ، ڈنر اور ٹی سیٹ کی قیمتیں پوچھیں تو اُسے یوں لگا جیسے ایک دھماکا ہُوا ہے اور اس دھماکے نے اسے مغرب کی چمک دمک سے اٹھا کر وہیں پھینک دیا ہے جہاں اس نے جنم لیا تھا۔ وہ بجھا بجھا سا گھر لوٹا۔ کاغذ پنسل لے کر تنخواہ اور ان اشیاء میں توازن قائم کرنے لگا لیکن وہاں تو زمین آسمان کا فرق تھا۔

وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ تھک ہار کر شکست تسلیم کرنے لگا تو اسے اونچی سوسائٹی کا خیال آ گیا۔ یہ خیال آتے ہی وہ زخمی بھیڑیئے کی طرح جھنجھلایا اور ایک بار پھر اسی گورکھ دھندے میں کھو گیا۔

اُسی شام اس کے ایک دوست نے اپنی بہن کی سالگرہ کی تقریب میں گارڈن پارٹی دی تھی جس میں اس کے محکمے کا وزیر بھی مدعو تھا۔ یہ پارٹی اُس کے سینے میں آگ لگاتے ہُوئے تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس دوست کی تنخواہ اتنی نہیں کہ وہ ایسی پارٹی دے سکتا۔ پھر یہ پیسہ کہاں سے آیا؟

اُس کے دماغ میں بجلی کوندی۔ جہاں مایوسیوں کا اندھیرا چھا رہا تھا وہیں ایک راستہ دکھائی دیا۔

"صاحب ہمارے لیے کوئی خدمت ہو تو حاضر ہیں" — اس کے دفتر کے چپراسی کی چھ ماہ پہلے کی آواز اُس کے دماغ میں گونجی۔

ملازمت کی یہ کرسی سنبھالنے کے دو روز بعد اُس کے چپراسی نے اسے رازدارانہ لہجے میں کہا تھا — "ہم بھی بال بچے دار ہیں صاحب! آپ کا دیا کھاتے ہیں۔ پہلے صاحب ہمارا بہت خیال رکھتے تھے۔ صرف آپ کے حکم کی دیر ہے۔"

چپراسی کی یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ چھ ماہ کی ملازمت میں اسے کچھ کچھ پلّے پڑتا جا رہا تھا لیکن چپراسی اسے دیانتدار صاحب کی بجائے "بدھو" سمجھ کر اس سے مایوس ہو چکا تھا اور وہ صرف چلمن اُٹھانے کے دو آنے بخشش لے کر گزارہ کرنے لگ گیا تھا۔ پہلے صاحب کے زمانے میں وہ پانچ سات روپے روز کما لیتا تھا۔

ناؤ کے بھائی کے ذہن میں جب چپراسی کی گئی گزری آواز بیدار ہوئی تو اس نے پنسل کو زور سے میز پر دے مارا اور آرام سے سو گیا۔

دوسری صبح جب وہ دفتر میں پہنچا تو چپراسی کو چپراسی کی بجائے نُور دین کہہ کر آواز دی۔ دروازہ بند کروا کے اسے اپنے قریب بلایا، کچھ سرگوشی کی۔ اب چپراسی جو باہر نکلا تو اس کے چہرے پر پہلے صاحب کے زمانے والی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

اس مسکراہٹ میں سے ایک صوفہ سیٹ نکلا، ایک ریڈیو اور پھر آتے دن اس میں سے ہر وہ شے نکلنے لگی جو نئی تہذیب کا لازمہ تھی اور جس کے بغیر سوسائٹی میں آبرو رکھنا مشکل ہوتا ہے۔

ایک ہی سال کے مختصر عرصے میں آباؤ اجداد کا صدیوں پرانا گھر گرا دیا گیا۔ پرانی تہذیب اس کے ملبے تلے دب کر رہ گئی اور اس ملبے میں سے ایک عمارت نے سر نکالا جس کا تصوّر ناز کا تین سو روپیہ تنخواہ پانے والا بھائی خواب میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔

بھائی نے ناز کو برقعے میں سے نکال لیا اور باپ کو چھپا دیا۔ باپ بھی تو پرانے مکان کا کباڑ تھا، ملبہ حیدر آباد کے مضافات میں اور باپ نئے مکان کے ایک کونے میں پھینک دیا گیا۔

ایک وہ ہوتے ہیں جن میں پیدائشی بڑا پن ہوتا ہے۔ ایک وہ جو اپنی ذہانت اور ہمّت کے بل بوتے پر بڑے بن جاتے ہیں لیکن ناز کا بھائی ان دونوں زمروں میں نہیں تھا۔ وہ تیسرے گروہ کا آدمی تھا جو اپنے اوپر بڑا پن ٹھونس لیتا ہے۔ اُس کی تربیت کسی اور ڈھب پر ہوئی تھی اور وہ کسی اور راہ پر چل پڑا تھا۔ کوّے نے ہنس کے پر اُڑس لیے تھے۔ اُس کا ہر عیب اور مسخرہ پن بددیانتی سے کمائی ہوئی دولت کے پردوں میں چھپنے لگا۔ سوسائٹی کے پرانے کھلاڑیوں نے اسے اپنے ڈھب پہ چلایا جسے وہ اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتا تھا۔

ناز کا رشتہ اُس وقت کا طے ہو چکا تھا جب وہ تیرہ برس کی تھی لیکن اب اس کے بھائیوں کو یہ رشتہ گوارا نہ تھا۔ وہ تمام قدیم بندھن توڑ چکے تھے۔ بڑا بھائی اب چھوٹا آدمی نہیں تھا۔ اس کی آمدنی کا کوئی حساب نہ تھا۔ وہ گردو پیش کو دیکھتا تھا تو اونچی سطح سے دیکھتا تھا۔ اس سفلہ نگاہی نے اُسے اندھا کر دیا۔ وہ اب نیچے نہیں آنا چاہتا تھا اس نے سب سے پہلے نیچے والوں سے ناز کی منگنی توڑ دی۔

وہ ناز کی وساطت سے بڑے آدمیوں کے ساتھ ناطے جوڑ رہا تھا جس کے لیے ناز ہی مؤثر ذریعہ تھی چنانچہ اُس نے ناز کو سوشل بنانا شروع کیا۔ اسے دوستوں کی بہنوں، بیویوں اور سالیوں سے متعارف کرایا اور جب دیکھا کہ وہ کھل گئی ہے تو اس کی ملاقاتیں دوستوں کے ساتھ کرانے لگا۔

ناز اس وقت میٹرک کا امتحان دے چکی تھی اور دونوں بھائی اسے کالج میں داخل کرانے کے منصوبے بنا چکے تھے۔ ان کے تو وارے نیارے تھے۔ رشوت اور بددیانتی نے دولت کی دیوی کو ان کا غلام بنا دیا تھا۔

ناز کا دوپٹہ جو تھوڑا عرصہ پہلے گھونگھٹ کی صورت میں تھا، ڈھلک کر کندھوں پر آ گیا اور جب اسے کراچی کی ہوا لگی تو سینے پر آ پہنچا، پھر غائب ہی ہو گیا۔ قمیض لٹیتے لٹکتے ٹخنوں تک پہنچ گئی اور کندھے ننگے ہو گئے۔

"میرے بھائی جان کہتے ہیں ناز کی گردن اور کندھے بہت خوبصورت ہیں" —— اس کی ایک سہیلی نے ایک روز کہا۔

اُسی شام ناز سہیلی کے "بھائی جان" سے ہاتھ ملا رہی تھی۔

ناز کے باپ کی عمر بیت چکی تھی۔ نظر اتنی کمزور تو نہ ہوئی تھی مگر اب وہ اپنی اولاد کو آنکھیں سکیڑ کر دیکھنے لگا تھا۔ اُسے کئی دفعہ خیال آیا کہ اس کے بیٹے اور بیٹی کسی نے چھین لیے ہیں۔ بڈھا بڈھی کونے میں بیٹھے ماضی کے دھندلکوں میں کھوئے رہتے تھے۔

ناز اب کالج جانے لگی تھی۔

پھر کالج کے بہانے نت نئے پروگرام بننے لگے۔

ناز کے بھائی کا خیال تھا کہ اُس نے گھر سے دقیانوسیّت کو نکال دیا ہے لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ وہی پرانی تہذیب اور دہی تربیت اس کی رگ رگ میں رچی ہوئی ہے۔ اس کے لاشعور پر اسی دقیانوسیّت کا ہی غلبہ تھا۔ اُس نے صرف کینچلی بدلی تھی۔ اس کی مغرب پرستی تو اپنے احساسِ کمتری کو دوسروں کی نظروں سے چھپانے کا ذریعہ

تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ بیداری اور خود فریبی میں ایک خفیف سا فرق ہوتا ہے جو کسی بھی وقت ختم ہو سکتا ہے۔ وہ ناز کو سرکس کے تار پر چلا رہا تھا۔

ناز ابھی فسٹ ایر میں ہی تھی کہ اُس نے بیک وقت دو چاہنے والے منتخب کر لیے تھے جو درحقیقت اُس کے بھائی نے اسے دیتے تھے لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ بھائی نے اسے نیلامی پر چڑھا رکھا ہے۔ اسے یہی کچھ معلوم تھا کہ اس کے سونے کے کمرے میں جو نیا فرنیچر آیا ہے وہ خریدا نہیں گیا تحفے میں آیا ہے اور ریڈیو بھی تحفے کا مال ہے۔ اُس کا بھائی اُس کا رشتہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو دینا چاہتا تھا اور یہ دونوں امیدوار نئے سے نئے تحفوں کی صورت میں بڑھ بڑھ کر بولی دے رہے تھے۔

ناز کا بھائی اچھی طرح جانتا تھا کہ ہر دولت مند اور ہر بڑا آدمی صرف دو چیزوں کا خریدار ہے —— وزارت اور عورت —— وزارتیں آتے دن ٹوٹتی ہیں حسین عورت سے جو کام لیا جا سکتا ہے اسی وقت لیا جا سکتا ہے۔ ادھر ناز کے گاہکوں میں اضافہ ہو رہا تھا اور اس کے دماغ میں فلم اور فیشن کے سوا کچھ نہ تھا۔

حیدر آباد میں ایک نائب وزیر دورے پر آیا جس کے اعزاز میں ایک پارٹی دی گئی۔ ناز کا بھائی ناز کو بھی ساتھ لے گیا۔ وہاں مغربی پاکستان کے ایک سرکاری خانصاحب کی نظر ناز پر پڑی تو انہوں نے حاشیہ برداروں سے ناز کی تفصیلات معلوم کیں۔ انہیں بتایا گیا کہ بکاؤ مال ہے، اچھے گاہک کی تلاش ہے۔

خانصاحب پچاس کے پیٹے میں تھے۔ گھر میں پرانے وقتوں کی ایک بیوی تھی لیکن ناز کے انداز دیکھ کر گہری سوچ میں کھو گئے پھر اس سوچ کی گہرائیوں سے کاروباری مُسکراہٹیں پھوٹنے لگیں جو پارٹی کے دوران ناز اور اس کے بھائی پر ہی مرکوز رہیں۔

ناز اب انگریزی بھی بولنے لگی تھی۔ گرمر کے پیچوں کے ساتھ اس کی گردن کا خم جذبات میں ہیجان پیدا کر دیتا تھا اور اس کے امیدواروں کی قطار لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ اس قطار میں شادی کے امیدوار کم اور شب بھر کے ساتھی زیادہ تھے۔

خانصاحب لاہور پہنچے تو ایک ہی ہفتہ بعد ناز کے بھائی کی تبدیلی لاہور ہو گئی۔ خانصاحب نے سٹیشن پر جا کر اس کا استقبال کیا۔ پھر ایک کوٹھی الاٹ کرا دی۔ چند روز بعد ناز کو بھی لاہور بلا لیا گیا۔ حیدر آباد والی کوٹھی کرائے پر اُٹھ گئی اور بوڑھے ماں باپ بھی لاہور پہنچ گئے۔

لاہور میں ان لوگوں کی ملاقات اسلم سے ہوئی۔ وہ بھی حیدر آباد کا رہنے والا تھا اور کسی دفتر میں معمولی ملازم تھا۔ ناز کو وہ بچپن سے جانتا تھا۔ وہ اس وقت آٹھویں جماعت میں تھی جب اسلم بی۔ اے پاس کر کے لاہور چلا گیا تھا۔ وہ ایک امیر زمیندار کا اوباش بیٹا تھا۔ کلی کلی کا رس چوسنے والا بھنورا تھا۔ خوش شکل اور خوش پوش تھا اور زبان کا بہت میٹھا۔ چکنی چپڑی باتوں سے اس نے کتنے ہی دل موہ کر مسل ڈالے تھے۔

وہ ایف۔ اے پاس کر چکا تھا جب اُس کا باپ مر گیا تھا۔ وہ بہت خوش ہُوا۔ ایک تو باپ کی گھرکیوں سے نجات ملی دوسرے اُس کی جائیداد ہاتھ آ گئی۔ تین سو ایکڑ زمین کے علاوہ چار قلعہ نما حویلیاں کرائے پر تھیں لیکن باپ کے مرنے کے چند روز بعد اُسے علم ہُوا کہ ساری جائیداد سوائے ایک چھوٹے سے مکان کے قرض خواہوں کے پاس رہن ہے۔

باپ کے وقت کی عیاشیاں ہڈیوں میں رچی ہوئی تھیں۔ اسلم نے اپنے آپ کو اونچی سوسائٹی کا فرد بنا رکھا تھا۔ اب اصلی حیثیت جو سامنے آئی تو پریشان ہونے کی بجائے اس نے مکر و فریب سے اپنے اس ٹھاٹھ کو قائم رکھا۔ وہ

ٹھری کیسل کے سگریٹ پیتا اور بلا ناغہ پکچر دیکھتا تھا اور یوں اس نے سوسائٹی میں بھرم قائم کر رکھا تھا۔

ایک شام اس نے لاہور کے ایک سینما ہال میں ناز کو دیکھ لیا۔ وہ خانصاحب کے ساتھ پکچر دیکھنے گئی تھی۔ وہ اس سے ملا تو دوسری ہی شام ناز اس کے ساتھ پکچر ہاؤس میں بیٹھی ہوئی تھی۔

اس نے ناز کو بتایا کہ وہ ایک امریکن انشورنس کمپنی کا "آل پاکستان انسپکٹر" ہے۔ اس کے علاوہ وہ فلم ڈسٹری بیوٹر بھی ہے۔ اس کے علاوہ تھوڑے ہی عرصے میں اپنی فلم پروڈیوس کرنے والا ہے۔ ناز کی آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں وہ سن رہی تھی ــــ "کہانی لکھی جا چکی ہے، ہیروئن کی تلاش ہے۔ میں نیا چہرہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

باتوں باتوں میں اسلم نے چونک کر کہا ــــ "ارے۔ ربے۔ ربے میں نے فلم کا سارا اہتمام مکمل کر لیا ہے اور یہ دیکھا ہی نہیں کہ بنک میں اتنا روپیہ ہے بھی یا نہیں۔"

اس نے جیب سے ایک بوگس اکاؤنٹ بک نکالی اور اطمینان کا سانس لے کر کہا ــــ "کام ہو جائے گا، ساڑھے چھ لاکھ روپیہ موجود ہے۔"

ناز کی آنکھیں چمک اٹھیں ــــ چھ لاکھ روپیہ ــــ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ دیکھ ہی نہ سکی کہ اسلم نے جو ٹائی باندھ رکھی ہے، اس کی ناٹ کا رنگ اڑا ہوا ہے اور وہ لنڈے بازار سے آٹھ آنے میں خریدی گئی تھی۔ ناز کی نظروں میں خانصاحب کی تصویر دھندلا گئی۔

"خیر روپے کا تو غم ہی نہیں۔ ابھی فون کر دوں تو لاکھوں روپے کے چیک یہیں ہوٹل میں پہنچ جائیں لیکن ناز!" اسلم نے آگے ہو کر ناز کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ملتجی انداز سے کہا ــــ "یہ دولت مجھے ڈس رہی ہے لوگ مجھے شہزادہ سمجھتے ہیں۔ کاش! کوئی یہ بھی جان سکے کہ میری تنہائی مجھے کھائے جا رہی ہے۔"

ناز ان اشاروں کو خوب سمجھتی تھی۔ وہ تو اب اس سے بھی نازک اشارے سمجھ لیتی تھی۔ اس نے اسلم کا ہاتھ یوں دبا دیا جیسے اس کی تنہائی کا ساتھی بننے کیلئے ہاں کہہ دی ہو۔

"یوں تو ایک وزیر کی سالی اور ایک وزیر کی بھانجی بری طرح پیچھے پڑی ہوئی ہیں" ــــ اسلم کہہ رہا تھا ــــ "دونوں میں سے کسی نہ کسی کے باپ کی کار میری کوٹھی کے سامنے کھڑی رہتی ہے لیکن ناز! جب بھی میں نے ان لڑکیوں کو دیکھا مجھے تم ہی یاد آئیں تمہیں معلوم نہیں جب تم حیدر آباد میں ساتویں آٹھویں جماعت میں پڑھا کرتی تھیں، اس وقت سے تمہاری محبت کو سینے میں پال رہا ہوں۔ قسمت نے ہمیں کہاں آن ملایا۔ ہماری روحیں روزِ ازل سے ایک ہیں.... آؤ ناز! میری بیچارگی کو سہارا دو۔ مجھے صرف تمہاری ضرورت ہے۔"

ناز اسلم کا ہاتھ تھام کر خوابوں کی دنیا میں جا پہنچی۔

"ساڑھے چھ لاکھ روپیہ!"

"فلم ڈسٹری بیوٹر!"

"فلم پروڈیوسر!"

"کہانی لکھی جا چکی ہے!"

"ہیروئن کی تلاش ہے!"

دوسرے دن ناز جہانگیر کے مقبرے کے سائے میں اسلم کے پہلو میں بیٹھی نور جہاں کا پارٹ ادا کر رہی تھی مگر وہ گھر سے کالج کے لیے روانہ ہوئی تھی۔

اسی شام اسلم ناز کے بھائی سے ملا۔ وہ جانتا تھا کہ ناز کا بھائی بر خود غلط قسم کا آدمی ہے اور اس نے رشوت

اور بہن کے بل بوتے پر اپنا ٹھاٹھ جما رکھا ہے۔ اسلم نے اسے بھی ایک موٹا شکار سمجھا اور اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ ایک دوسرے کو حیدر آباد سے جانتے تھے۔ ناز کے بھائی کو غلط فہمی تھی کہ اسلم بہت بڑی جائیداد کا مالک ہے لیکن اس کے ماں باپ کو صحیح صورتِ حال کا علم تھا۔ انہوں نے اسلم سے پوچھا تو وہ ایک ہی جھوٹ بول کر صاحبِ جائیداد بن گیا ــــ "وہ مقدمہ میں نے جیت لیا ہے اور ساری جائیداد میرے نام منتقل ہو چکی ہے۔"

چند ہی دنوں میں اسلم سارے کنبے پر چھا گیا اور ناز شدت سے محسوس کرنے لگی کہ اسے اسلم سے محبت ہو گئی ہے۔ اس کی مچلتی جوانی نے کسی کے پہلو میں پہلی بار ایک نئی لذت محسوس کی تھی جس میں اس کی وارفتگی اور اسلم کی دولت دونوں کار فرما تھیں۔ اسلم تو جیسے ناز کے اشاروں پر جی رہا تھا۔

ناز کے ماں باپ ایک مدت بعد سکون کا سانس لینے لگے۔ لڑکا اچھا ہے.... جائیداد بھی ہے.... انہوں نے فیصلہ کیا ــــ "یہ رشتہ بہت اچھا ہے۔ لڑکا اپنے وطن کا ہے۔"

اب یہ الجھن پیدا ہوئی کہ خانصاحب نے ناز کے بھائی سے بات پکی کر لی تھی اور وہ اپنی تیسری بیوی کو طلاق دے چکے تھے۔ ناز کی خاطر شادی کا صرف دن مقرر کرنا باقی تھا۔ ناز کو اس رشتے کا علم نہ تھا۔ بھائی نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ اتنا ہی جانتی تھی کہ خانصاحب سیکرٹری ہیں حکومت ان کے ہاتھ میں ہے۔ خاصے دولت مند آدمی ہیں۔ آئے دن تحفے بھی دیتے رہتے ہیں۔ ان کے اعزاز میں ایک پارٹی بھی دے چکے ہیں مگر ان کی عمر اس کے باپ سے تین چار سال کم ہے۔

ناز کا بھائی بہت خوش تھا۔ خانصاحب نے اسے بہت اونچا چڑھا دیا تھا۔

آخر گھر میں بم پھٹا اور ناز چکرا گئی۔ بھائی نے اسے خانصاحب کے متعلق کچھ اس طرح بہلایا پھسلایا کہ وہ ایک بار تو پھسل ہی چلی تھی لیکن اسلم کا خیال آڑے آیا۔ ناز کو صرف دولت، عیاشی اور فیشن سے محبت تھی جو خانصاحب کے ہاں موجود تھی۔ دوسری طرف، اس کے خیال کے مطابق یہی چیزیں اسلم کے ہاں بھی موجود تھیں۔ اب اسلم اور خانصاحب میں صرف دو فرق تھے ــــ عمر اور محبت۔

ناز اسلم کی محبت میں الجھ چکی تھی۔ اس نے بھائی کو صاف الفاظ میں بتا دیا کہ اسے خانصاحب کی زوجیت منظور نہیں۔ بھائی کو پہلی بار محسوس ہوا کہ ناز "قابلِ اعتراض حد تک" آزاد ہو گئی ہے۔ اس نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ قائل نہ ہوئی۔ اس نے کہہ دیا کہ وہ اسلم ہی کے ساتھ شادی کرے گی۔

"ناز! تمہیں شرم نہیں آتی؟" ــــ بھائی نے غصے سے پوچھا۔

ناز نے دیدے پھاڑ کر بھائی کی آنکھوں میں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ــــ "دیکھ لو" ــــ اور بھائی کی آنکھیں جھک گئیں۔

اسلم کو علم ہوا کہ اس کا مدمقابل سیکرٹری ہے تو اس نے میدان سے بھاگ جانا چاہا۔ اس کے پاس تھا ہی کیا کہ ایک سیکرٹری کے مقابلے میں جمتا۔ اسے تو بھانڈا پھوٹنے کا ڈر پیدا ہو گیا تھا۔ گذشتہ ڈیڑھ ماہ سے وہ ناز کو لیے لیے پھر رہا تھا۔ ان کی محبت بھری سرگوشیاں تفریح گاہوں کے کونوں کونوں میں گونج رہی تھی۔ شالامار باغ میں جہانگیر اور نور جہاں کے مزار میں۔ باغِ جناح اور شملہ پہاڑی کی جھاڑ میں۔ راوی کی ہلکی ہلکی لہروں پر بہتی ہوئی کشتی میں پکچر ہاؤس کے اندھیروں اور ہوٹلوں کے پرائیویٹ کمروں میں۔ ناز اسلم کی ذات میں کھو گئی تھی۔ اس کی نسائیت اور عصمت بھی من بھائے مستقبل کے خوابوں کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ وہ سب بندھن توڑ چکے تھے۔

اسلم ویسے بھی ناز سے اکتانے لگا تھا۔ بھنورا اب کسی اور کلی کی تلاش میں تھا لیکن ناز بری طرح اس کے

ساتھ چپک گئی تھی۔ اسلم مقروض بھی ہو چکا تھا۔ اس کا بھرم اُٹھ رہا تھا۔ اس کے لیے ناز بہت مہنگا سودا تھا۔ اسے سوسائٹی میں پوزیشن قائم رکھنے کے لیے روپے کی ضرورت تھی۔ قرض خواہ جان کو آنے لگے تھے۔

اور ایک شام ناز کراچی جانے والی ایکسپریس پر اسلم کے ساتھ سیکنڈ کلاس میں بیٹھی گاڑی کے بے ہنگم ٹھکڑ ٹھکڑ، ٹھکر ٹھک میں ہیروئن بننے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اسلم نے دفتر سے ایک مہینے کی چھٹی لے لی تھی اور ناز گھر سے دو ہزار روپے چرا کر نکل آئی تھی۔

کراچی پہنچ کر وہ ایک درمیانہ درجے کے ہوٹل میں داخل ہُوئے۔

حیدرآبادی منڈی ایسے ہی اسلموں اور نازوں کے دم قدم اور ایسی ہی محبّتوں کی بدولت چل رہی تھی کراچی کے پُرہنگامہ شب و روز میں یہاں کی پُرپیچ گلیوں اور نم آلود فضا میں، یہاں کے ہجوم کی افراتفری اور بھاگم بھاگ میں اور یہاں کی زمین دوز دنیا میں چرائی ہوئی لبیں، کاریں اور بھینسیں گم ہو جاتی تھیں۔ ناز تو دُبلی پتلی نازک سی لڑکی تھی۔

جس ہوٹل میں وہ داخل ہوتے اس کے بُوڑھے مینیجر کے چہرے کی جُھریوں میں جانے ایسے کتنے ہی اسلموں اور نازوں کی داستانیں پوشیدہ تھیں۔ اس کے ہاں مدّت سے ایسے جوڑے آرہے تھے اور جارہے تھے۔ اُس کی چُندی آنکھیں ایک ہی نظر میں بھانپ لیتی تھیں کہ یہ لوگ کون ہیں، کہاں سے آتے ہیں اور کہاں جاتیں گے۔ اس نے کتی "اسلم" اپنی "نازوں" کو یہیں چھوڑ کر کراچی میں گم ہوتے دیکھے تھے۔ یوں تو وہ ہر گاہک کے سامنے سر کو ذرا سا جھکا کر سلام کیا کرتا تھا لیکن اسلم اور ناز قسم کے جوڑوں کو دیکھ کر وہ اس قدر جُھک جاتا تھا کہ اُس کی ٹھوڑی کاؤنٹر پر جا لگتی تھی۔ پھر ایک خاص مسکراہٹ اور آنکھوں کی ذرا سی جنبش سے ہوٹل کے بیرے سمجھ جاتے تھے کہ اس جوڑے کا خاص خیال رکھنا ہے۔

اسلم اور ناز کو کمرہ دکھانے کے لیے وہ خود ساتھ گیا اور کنکھیوں سے ناز کو دیکھتا رہا۔ اسلم کی باتیں اُس نے کم سنیں اور اُن کی بُو زیادہ سُونگھی۔

بیس روز بعد ہی ناز ان باتوں کی بُو میں بھٹکنے لگی۔ گھر سے چُرایا ہُوا روپیہ اور پہنے ہوتے زیورات جو زیادہ نہیں تھے، ختم ہو چکے تھے۔ اُس وقت بھی وہ محسوس نہ کر سکی کہ اسلم کو اُس کی نہیں اُس کے روپے کی ضرورت ہے اور اس کا روپیہ اتنا خرچ نہیں ہُوا جتنا اسلم نے اُڑا لیا ہے۔

ناز اب اس سے جھنجھلا کر صبح و شام پوچھنے لگی تھی کہ اُس کا سٹوڈیو کہاں ہے؟ فلم کہاں ہے؟ فلمی کہانی کہاں ہے؟ لیکن اُسے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ایک فلمی ڈرامے کی ہیروئن بن چکی ہے اور ڈرامہ عروج کو پہنچ رہا ہے۔

اسلم چاہتا تو ناز کو اکیلا چھوڑ کر چپکے سے بھاگ سکتا تھا لیکن وہ اس کے بھی دام وصول کرنا چاہتا تھا اور ہوٹل کا بل بھی۔

آخر وہ رات آئی کہ ناز ہوٹل کے کمرے میں آئینے کے سامنے بیٹھی میک اپ پر نظرِ ثانی کر رہی تھی اور اپنے دل نشیں اور دعوتِ گناہ دیتے جسم کے گرد خوابوں کے تانے بانے بُن رہی تھی۔ اسلم نے اُس کی ڈوبتی ناؤ کو سنبھال لیا تھا۔ اُس شام اُس نے اسے کہا تھا — "ناز! آج شام بن ٹھن کے تیار رہنا میں ڈائریکٹر کو ساتھ لا رہا ہُوں۔ تم جانتی ہو میں تو سرمایہ لگانے والا پروڈیوسر ہوں۔ ہیروئن کا انتخاب تو ڈائریکٹر ہی کو کرنا ہے۔ میری پسند کو وہ ناپسند تو نہیں کرے گا۔ لاکھوں روپے اس فلم پر لگا رہا ہُوں۔ پھر بھی وہ تمہیں دیکھ ہی لے تو اچھا ہے۔"

وہ آئینے کے سامنے بیٹھی مرمریں پیشانی پر پڑی تراشیدہ لٹوں کو سنوارے اسلم کے سبز باغوں میں

بھٹک رہی تھی کہ اسلم کمرے میں داخل ہُوا۔

"ناز! ان سے ملو۔ یہ ہیں ہمارے ڈائریکٹر صاحب، مسٹر ٹی ایچ۔ زیدی۔"

وہ چہک کر اُٹھی، جسم کو زہد شکن بل دیا اور بھائی کے دوستوں کی بہنوں، بیویوں اور سالیوں سے سیکھی ہوئی مسکراہٹ ہونٹوں پر آراستہ کی پھر ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا۔

ڈائریکٹر نے "ہیلو مس ناز" کہہ کر ہاتھ بڑھایا۔ ناز نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ ڈائریکٹر نے ناز کے گداز ہاتھ کو ذرا سا دبایا اور اُس کے چہرے پر گہری نگاہ ڈال کر ماہ و سال کا حساب لگایا۔ ماتھے پر بکھرے بالوں کی چمک اور جاذبیت کا جائزہ لیا اور مال کی قیمت کا اندازہ لگالیا۔

"اور زیدی صاحب!" —— اسلم کہہ رہا تھا —— "جس طرح بھی ہو سکے، خواہ آپ کو دن رات محنت کرنی پڑے، انہیں ہیروئن کے رول کے لیے تیار کر لیجیے گا۔ میں انہیں بہت دور سے لایا ہُوں۔"

"مس ناز سے بڑھ کر کون ہوگی جو اس قدر مشکل رول نبھا سکے گی" —— مسٹر زیدی نے بیٹھتے ہُوئے کہا —— "میں انہیں بہت جلدی تیار کر لوں گا۔ آپ آج ہی رات یا کل صبح لاہور جا کے میوزک ڈائریکٹر کو ساتھ لے آئیے۔ وہ بلانے پر نہیں آئے گا۔ سیٹ تو تیار ہو چکے ہیں...... مس ناز! اب آپ اپنی کوٹھی میں رہیں گی، سٹوڈیو کے قریب۔"

"تمہارے لیے انہوں نے بڑی خوبصورت کوٹھی خالی کروائی ہے" —— اسلم نے کہا —— "تم ابھی ان کے ساتھ چلی جاؤ اور میں ہوٹل کا بل ادا کر کے لاہور چلا جاتا ہُوں۔ ریل میں ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے۔ میں گیا اور آیا سمجھو۔"

کراچی کی بھول بھلیّوں میں ایک اور حسین اور نوعمر لڑکی بھٹک گئی۔

اس سے دو روز پہلے اسلم ناز کو آگے چلا دینے کی کوشش میں مصروف ہو گیا تھا۔ وہ پرانا کھلاڑی تھا۔ نیپیئر روڈ کے خیرہ کن برقی قمقموں تلے اندھیری گلیوں سے خوب واقف تھا۔ اسے جیدا کا ساتھی ٹیپو مل گیا تھا۔

ٹیپو نے ناز کو دیکھ کر جیدا سے بات کی تھی۔ جیدا اور اسلم کی ملاقات کرادی تھی۔ جیدا اُستاد تھا۔ زیر زمین دنیا کے شاہی خاندان کا فرد تھا۔ وہ بھانپ گیا کہ اسلم اُس کی دنیا کا آدمی نہیں، بلکہ یہ اُس مہذّب سوسائٹی کا آدمی ہے جس میں جرم اور گناہ تو ہوتے ہیں مگر کوئی مجرم نہیں کہلاتا۔ اس میں ناجائز تعلقات میں ملوّث ہونے والے زن و مرد بدکار نہیں سوشل کہلاتے ہیں اور وہ جیدا کو، ٹیپو کو، بادل کو اور جیلوں کے قیدیوں کو مجرم کہتے ہیں۔

جیدا نے اسلم کو باتوں کے چکر دینے شروع کر دیئے۔ وہ ناز کو بلا قیمت اڑا لینے کی سوچ چکا تھا۔ اُس نے ایسی باتیں کیں جن سے اسلم ڈر گیا کہ جیدا اسے پولیس کے حوالے کر دے گا۔

اسلم جیدا کا ہاتھ تھام کر رو پڑا۔ وہ اور جیدا رات گئے تک کلفٹن کے ساحل پر بیٹھے رہے تھے اور اسلم اُسے ناز کی ساری داستان سنا رہا تھا۔

اسلم ناز کے لیے نہیں رو رہا تھا اور نہ ہی اسے اپنے آپ پر رونا آ رہا تھا۔ رو پڑنا تو اس کے کاروبار کا ایک گُر تھا جس میں وہ ماہر تھا۔ ہونٹوں پر رسیلی مسکراہٹ پیدا کر لینے، آنکھوں میں آنسو بھر لینے اور چہرے پر حسبِ ضرورت تاثر پیدا کر لینے میں وہ مہارت رکھتا تھا۔

جیدا تو ہاتھ کی صفائی سے جیب کاٹا کرتا تھا، لیکن اسلم مسکراہٹ یا آنسوؤں سے اپنے شکار کی جیب

کا صفایا کرتا تھا۔ جیدا کو وہ دو چار باتوں میں بھانپ گیا تھا کہ یہ بمبئی کا گھاگھ ہے چنانچہ اُس نے رونے کی ایک خاص قسم کا انتخاب کر کے آنکھوں کو پُرنم کر لیا، آواز رندھیالی اور جیدا جیسے پتھر کو موم کر لیا۔

"دیکھو میاں! میں چاہوں تو تمہاری لاش اس سمندر میں بہادوں اور لڑکی کو ہوٹل میں سے اُٹھا لے جاؤں" —— جیدا نے کہا تھا —— "لیکن تم نے مجھے تمام باتیں سچ سچ بتادی ہیں اس لیے میں تمہیں پانچ سو دے دوں گا۔ تم نے اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا ہے۔ میں خود بہت بڑا پاپی ہوں لیکن ہر اُس پاپی کا دشمن ہوں جو نیکی اور شرافت کا ملمع چڑھائے رکھتا ہے...... چلو اب پانچ سو پر سودا طے ہُوا۔"

"منظور ہے" —— اسلم نے آنسوؤں کو مسکراہٹ میں تبدیل کر کے کہا —— "پانچ سو لیکن ہوٹل کا بل بھی تم دے دو۔"

"کتنا ہوگا؟"

"سات سو کے لگ بھگ۔"

جیدا نے ماتھے پر شکن ڈالے، کچھ سوچا اور کہا —— "منظور ہے۔"

اور اگلی رات جیدا اسلم کو پانچ سو روپے دے کر اُس کے ساتھ ہوٹل کے منیجر سے ملا تھا اور بل اپنے نام کرا کے ڈائریکٹر "مسٹر ایچ، ٹی، زیدی" کے بہروپ میں ناز سے ملا۔ اسلم کو میوزک ڈائریکٹر کو ساتھ لانے کے لیے لاہور بھیج دیا اور ناز کو اپنے ساتھ لے گیا۔ ناز اُس کوٹھی کی طرف جا رہی تھی جو سٹوڈیو کے قریب بتائی گئی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔

اسلم لاہور پہنچا تو یہ دیکھنے کے لیے ناز کے گھر گیا کہ ناز کی گمشدگی پر اُس کے گھر والے کیا کر رہے ہیں۔ ناز کا بھائی اپنے کمرے میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ دوسرا بھائی پلنگ پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ اسلم نے گرمجوشی سے السلام علیکم کہی جس کا جواب مریل سی وعلیکم السّلام سے ملا۔

"ناز کہاں ہے؟" —— اسلم نے پوچھا۔

"ناز کہاں ہے؟" —— دونوں بھائی بیک وقت بولے —— "ہم تو سمجھے تھے، وہ آپ کے ساتھ گئی ہے۔"

"میرے ساتھ؟" —— اسلم چونکتے ہوئے بولا —— "میں تو ایک ماہ سے کراچی میں تھا۔"

"جبھی سے تو وہ لاپتہ ہے۔"

"لاپتہ ہے؟" —— اسلم نے کرسی سے اچھل کر کہا —— "ایک مہینے سے؟"

بڑے بھائی کے آنسو نکل آئے۔ اس لیے نہیں کہ اُس کی بے راہ روی نے ناز کو غلط آزادی اور فیشن میں گم کر دیا تھا بلکہ اس لیے کہ خانصاحب نے اُس پر الزام دھر دیا تھا کہ اُس نے اپنی بہن کا رشتہ نہ دینے کی خاطر اسے رُوپوش کر دیا ہے۔ خانصاحب اسے ملازمت سے برطرف کرا دینے کی دھمکی بھی دے چکے تھے۔

"پھر کیا کیا آپ نے؟" —— اسلم نے بظاہر گھبراہٹ سے پوچھا —— "پولیس کو اطلاع دی؟ تلاش کیا؟ اس کی سہیلیوں سے پوچھا؟"

"کرنا کیا تھا، ہمیں یقین تھا کہ وہ آپ ہی کے ساتھ گئی ہے" —— بھائی بولا۔

"اس میں کوئی شک نہیں" —— اسلم نے کہا —— "ہمارے خاندانی تعلقات کی بنا پر آپ کا یہ قیاس غلط نہ تھا لیکن آپ کی اجازت کے بغیر اسے کہیں لے جانا مناسب نہیں۔ خاندانی شرافت کا بھی تو پاس ہوتا ہے۔"

کیا آپ مجھے ایسا بدکردار آدمی سمجھتے ہیں؟

"تو اب کیا کیا جائے؟" ——— بڑا بھائی پریشان ہو کر بولا ——— "اخباروں میں اشتہار دینا تو مناسب نہیں۔ وہ بچی تو نہیں کہ کھو گئی ہو۔ جوان لڑکی ہے۔"

"اشتہار دے دیں" ——— اسلم نے کہا ——— "ناز کا حلیہ لکھیں۔ اُس نے جو کپڑے پہن رکھے تھے وہ لکھیں۔ قد بُت اور عمر بھی لکھیں۔"

"مگر لوگ کہیں گے کہ جوان لڑکی ہے" ——— بڑے بھائی نے کہا ——— "اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ چلی گئی ہو گی۔"

"نہیں" ——— اسلم نے کہا ——— "اشتہار میں لکھ دینا کہ لڑکی کا دماغی توازن ٹھیک نہیں۔"

"مجھے خدشہ ہے" ——— چھوٹے بھائی نے کہا ——— "کہیں فلمی لائن کے چکر میں نہ کھو گئی ہو۔"

"وہ فلمی دنیا میں ہوتی" ——— اسلم نے تپائی پر گھونسہ مار کر کہا ——— "تو میں اُسے زمین کی تہوں میں سے بھی نکال لاؤں گا" ——— وہ اچک کر اُٹھا اور بظاہر بپھرے ہوئے لہجے میں بولا ——— "آپ یوں پریشان نہ ہوں۔ ساری پولیس میری مُٹھی میں ہے۔ میں ابھی جا کر کچھ کرتا ہوں۔"

اسلم باہر نکل گیا۔ پھر ناز کے گھر والوں کو کبھی نظر نہ آیا، جیسے زمین کی تہوں میں روپوش ہو گیا ہو۔

جیدا ناز کو ہوٹل سے ٹیکسی میں بٹھا کر لے گیا تھا۔ وہ ٹیکسی کے ہچکولوں میں سینما سکرین پر اپنے آپ کو ہیروئن کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔ اپنے پہلو میں بیٹھے جیدا کو کبھی کنکھیوں سے دیکھ لیتی اور پھر خیالوں کی رنگینیوں میں گم ہو جاتی۔

"پارٹ مشکل تو نہیں؟" ——— ناز نے مُسکرا کر جیدا سے پوچھا۔

"ہے تو مشکل مس ناز!" ——— جیدا نے اس کے ہاتھ کو ہاتھ میں لے کر کہا تھا ——— "لیکن یہ تم پر منحصر ہے کہ اسے سمجھ لو۔ ہم دونوں کی پریشانی اسی طرح کم ہو سکتی ہے۔"

ناز نے اپنا ہاتھ جیدا کے ہاتھ سے چھڑایا نہیں تھا۔

جب وہ دونوں ٹیکسی میں سے اترے اور ایک چار منزلہ فلیٹوں والی عمارت کے نیچے والی منزل کے اندھیرے صحن میں داخل ہوتے تو وہ نہ ٹھٹھکی تھی اور نہ اُس وقت چونکی جب وہ ایک ایسے کمرے میں داخل ہو گئے جو ایسی بُو سے بھرا ہُوا تھا جو ناز نے پہلے کبھی نہیں سونگھی تھی۔ گناہگار ہوتے ہُوتے بھی وہ گناہوں کی بُو سے ناآشنا تھی۔ جیدا نے اسے چارپائی پر بٹھا دیا تھا اور خود کچھ کہے بغیر چلا گیا تھا۔ وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ اسلم نے اسے کہا تھا کہ اس کے لیے ایک کوٹھی خالی کرا لی ہے۔ وہ اس کوٹھڑی اور کوٹھی میں موازنہ ہی نہ کر سکی تھی۔

اُسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ جس بستر پر وہ بیٹھی ہُوئی تھی اس کی ایک ایک سلوٹ میں حسن و عشق کے جانے کتنے حادثات، کتنے ہی انجام، کتنے ہی آغاز اور کتنے ہی گناہ پوشیدہ تھے۔ نہ جانے محبت کے کتنے ہی ڈراموں کا ڈراپ سین اسی بستر پر اسی کوٹھڑی میں ہُوا تھا۔ وہاں عشق کا دیوتا رو رہا تھا، شیطان ہنس رہا تھا لیکن ناز کے کان بند تھے، آنکھیں بند تھیں، دماغ بھی بند تھا۔ اس کی سوچ پر صرف ہیروئن سوار تھی ——— ایک پردہ جس کا رنگ سیاہ تھا، اُس کے دل و دماغ پر چھایا ہُوا تھا۔

وہ اُس وقت ذرا چونکی تھی جب دس پندرہ منٹ کی تنہائی کے بعد ایک بڑھیا جس کا منہ پان سے بھرا ہُوا تھا، کمرے میں داخل ہوئی تھی اور اُس نے چٹخنی چڑھا دی تھی۔

پھر بدبودار بند کمرے میں سے ناز کا احتجاج اور پھڑپھڑانے کی بے بس صدائیں نچلی منزل کے تنگ صحن کے اندھیرے میں گونجنے اور تحلیل ہونے لگی تھیں۔ وہاں اب اندھیروں کے سوا کچھ نہیں تھا

کراچی کا شور و غل بلند تھا اور ناز کی آوازیں دھیمی ——— پابجولاں، مقید ——— اس عمارت کے نیچے سے اوپر کی منزل تک شراب کی بُو سے لتھڑے ہُوئے قہقہے، طبلے، سارنگیوں اور گنگھروؤں کی بے ہنگم دھکڑ دھم چھنا چھن ناز کی گھٹی گھٹی آوازوں کو بے رحمی سے نگلتی جا رہی تھیں۔

ناز کی رگ رگ بیدار ہو چکی تھی لیکن اُس کی قسمت سو گئی تھی۔

چند روز پہلے کی واردات تھی کہ ناز جیدا کی دنیا میں داخل ہُوئی تھی۔ آج کی رات جیدا نے ڈائری کھولی اور یوں ہی کہیں کہیں سے پڑھ کر اکتاہٹ سے دراز میں رکھ دی اور سوچنے لگا۔ جس رات وہ ناز کو بڑھیا کے حوالے کر آیا تھا اس نے ڈائری میں لکھا تھا.....

۱۲ر اکتوبر ۱۹۵۶ء۔

آج ایک اور لڑکی میری دنیا میں آ گئی ہے۔ پانچ سو روپے کوئی مہنگا سودا نہیں۔ ہوٹل کا سات سو کا بل ہوٹل کا منیجر اپنی جیب سے ادا کر دے گا۔ وہ عقل مند ہے اور مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ سات سو روپوں کی خاطر اپنی جان ضائع نہیں کرے گا۔

اسلم لاہور چلا گیا ہے۔ بدنصیب انسان دل میں بہت خوش ہو گا کہ اچھا ہاتھ مارا اور ناز سے گلوخلاصی ہُوئی لیکن وہ مجھے ساری باتیں بتا گیا ہے۔ اپنا اتا پتا بھی دے گیا ہے۔ اب وہ زندگی بھر میری بلیک میلنگ کا شکار رہے گا۔ ناز کا اغوا سائے کی طرح اُس کے ساتھ لگا رہے گا۔ میرے دو بلیک میلر اس کے خون کا آخری قطرہ بھی چُوس لیں گے۔ نہ لاہور دور ہے نہ حیدر آباد ——— دو روز بعد اس نے لکھا تھا۔

۱۴ر اکتوبر ۱۹۵۶ء۔

آج شام ناز کو دیکھنے گیا۔ مجھے دیکھتے ہی برس پڑی۔ جی بھر کے مجھے کوسا۔ اسلم کو گالیاں دیں اور پولیس کی دھمکیاں بھی دیں۔ میں نے اسے کہا۔ ناز! مجھے اور اسلم کو گالیاں دینا بیکار ہے۔ اپنے بھائی جان کو کوسو اور اپنے ماں باپ کی بے بسی پر رو۔ میرا اس میں کوئی قصور نہیں۔

وہ بہت بھڑکی میں اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ ایسے میں وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کا حسن قدرتی ہے۔ قدرتی روپ میں زیادہ اچھی لگتی ہے۔ میک اپ اس کے جواں سال چہرے کی رونق مار دیتا ہے۔ اچھے پیسے کمائے گی۔ ابھی وہ نظروں کا سامنا نہیں کر سکتی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تو اس کی زبان ہکلا گئی اور آنکھیں جھک گئیں۔ بڑھیا ہے تو خرانٹ کہتی ہے چلا لوں گی۔

آج رات جیدا نے کچھ بھی نہ لکھا۔ اُسے ایک بار پھر ناز کا خیال آیا۔ اس کے ساتھیوں نے کہا تھا وہ نہیں مانتی۔ ان چند دنوں میں بڑھیا نے ناز کو ڈھنگ پر لانے کے ہر جتن کر دیکھے تھے لیکن وہ کسی ڈھب پر نہ آئی۔

بادل اور ٹیپو نے اسے مسلسل تین روز بھوکا رکھا۔ ایک رات الٹا لٹکا دیا۔ پھر ہر وہ حرکت کی اور ہر وہ اذیت دی کہ وہ پل پل میں سو سو بار مرنے لگی مگر وہ اپنی ہٹ پر قائم رہی۔

اس پر کئی بار غشی کے دورے پڑے۔ تین روز کے فاقہ کے بعد جب اسے کھانا دیا گیا تو اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ پھر وہ بے ہوش ہوگئی اور بڑھیا اس کے منہ میں دودھ ٹپکاتی رہی۔

آج شام جب جیدا کو ساری روئیداد سنائی گئی تو وہ ڈائری بند کر کے بہت دیر سوچتا رہا اور اُسی رات وہ ناز کو ٹیکسی میں بٹھا کر اندھیرے اندھیرے میں نیپیئر روڈ سے اپنے کمرے میں لے آیا۔

جیدا کا یہ کمرہ ایک ایسے مکان میں تھا جس میں کئی اور کمرے تھے اور ایک صحن بھی تھا۔ یہ مکان اونچی اونچی عمارتوں میں گھرا ہوا تھا۔ یوں تو یہ زمین پر تھا لیکن کراچی والوں کے لیے یہ زمین دوز تھا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہاں کون رہتا ہے یا کیا ہوتا ہے اور جسے معلوم تھا وہ ڈر کے مارے کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ شروع شروع میں دو آدمیوں نے مخبری کی تھی لیکن یہ مکان وہیں رہا۔ جیدا وہیں رہا۔ مکان کی چار دیواری میں مختلف جرائم کا سکول وہیں رہا۔ جیدا کے گروہ کا ہیڈ کوارٹر وہیں رہا اور دونوں مخبر ایک ایک مہینہ اس مکان کے ایک اندھیرے کمرے میں بھوکے پیاسے بند رہے پھر اس مکان کے اس ہیبت ناک کمرے کی چھت پر پھیلے ہوئے جالوں کو بھی معلوم نہ ہو سکا کہ دونوں کہاں غائب کر دیئے گئے۔

اس مکان کے علاوہ جیدا کے پاس تین مکان اور بھی تھے جن میں جُوا بازی کے اڈے تھے۔ وہاں چرس، افیون اور شراب بھی ملتی تھی اور بعض اوقات کسی سمگلر کا مال بھی بٹائی یا معاوضے پر رکھ لیا جاتا تھا۔ وہ خود سمگلر نہیں تھا۔ ان تینوں مکانوں کو وہ نمبر ایک، نمبر دو اور نمبر تین کہا کرتا تھا۔ اس کے اپنے مکان کا کوئی نمبر نہیں تھا۔ رات جب ناز اس مکان کے صحن میں داخل ہوئی تو اسے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کراچی کے کون سے علاقے میں ہے۔

کراچی کے علاقے تو بتاتے جا سکتے ہیں مثلاً کھارادر، چاکیواڑہ، سولجر بازار، جوڑیا بازار وغیرہ۔ یہ پرانے کراچی کے علاقے ہیں۔ مکانوں پر مکان کھڑے ہیں۔ گلیاں تنگ و تاریک ہیں اوپر دیکھو تو آسمان کم اور مکان زیادہ نظر آتے ہیں۔ گلیاں آٹھ دس قدموں بعد مڑ جاتی اور ایک دوسری میں گم ہوتی جاتی ہیں۔

ان علاقوں میں رہنے والے ایک دوسرے کو جانتے نہیں پہچانتے نہیں۔ کوئی مر جائے تو دائیں بائیں اوپر اور نیچے رہنے والوں کو پتہ نہیں چلتا۔ ایک گھر میں ماتم اور دوسرے میں شادی ہو رہی ہوتی ہے کوئی بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتا نہ ضرورت سمجھتا ہے کہ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔

ناز ایسے ہی کسی علاقے میں پہنچا دی گئی تھی جہاں چور اور ڈکیت مال سمیت غائب ہو جاتے ہیں۔ ناز جیسی لڑکیوں کو یہ علاقے یوں ہضم کر لیتے ہیں جیسے مگرمچھ نے دو چار مچھلیاں نگل لی ہوں۔ گھنے جنگلوں، پہاڑی علاقوں اور دشوار گزار وادیوں میں ڈاکو اور رہزن پکڑے جا سکتے ہیں۔ پرانے کراچی کے کسی علاقے میں چور غائب ہو جائے تو اُسے ڈھونڈ نکالنا ناممکن ہوتا ہے۔ ان علاقوں سے پولیس واقف ہے یا الیکشن لڑنے والے

لیڈروں کے ورکر۔

ناز جیدا کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا، سامنے والی کھڑکی کے ساتھ ایک میز رکھی ہے جس کے دائیں طرف چار دراز ہیں۔ فرش پر ایک طرف بستر بچھا ہے اور باقی ہر طرف ریت کی اور گرد کی تہیں جمی ہیں۔ سگرٹوں اور بیڑیوں کے بجھے ہوئے ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں اور چھت جالوں سے اٹی ہوئی ہے۔

دیواروں پر کبھی سفیدی کی گئی ہوگی مگر لالٹین کی روشنی میں یہ کسی غار کی دیواریں معلوم ہوتی تھیں۔ چھت سے لٹکتے جالے منظر کو ہیبت ناک بنا رہے تھے۔ سامنے والی کھڑکی مکمل طور پر مکڑیوں کے قبضے میں تھی۔ انہوں نے ایک طرف سے دوسری طرف تک جالے تن دیئے تھے۔

ناز نے کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر خوفزدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا۔ ایک کھڑکی اور ایک دروازہ صحن کی طرف کھلتا تھا۔ ایک دروازہ دائیں طرف کسی کمرے میں اور دوسرا بائیں طرف والے کمرے میں کھلتا تھا۔

دیکھنے میں یہ کمرہ نیپیئر روڈ والے اُس کمرے سے زیادہ خوفناک تھا جس میں ناز کئی راتیں گزار آئی تھی۔ اسے خیال آیا کہ یہ شاید دنیا کا آخری کمرہ ہے جسے وہ دیکھ رہی ہے اور اس کا آخری سانس ان جالوں میں الجھ کر ختم ہو جائے گا۔

اس کا جسم چند دنوں میں ہی کھوکھلا ہو چکا تھا۔ منہ بہت دنوں سے دھلا نہیں تھا۔ بال بکھر کر پسینے سے جڑ گئے تھے۔ کپڑے میلے اور داغ داغ ہو رہے تھے۔ ہاتھوں کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ ناخن پالش خون کے مٹتے دھبوں کی طرح مدھم ہو چکی تھی۔ ہونٹ اُس پودے کی کلیوں کی طرح مرجھا گئے تھے جسے بہت دنوں سے پانی نہ ملا ہو۔ آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔

"اس کمرے میں میرے سوا کوئی نہیں آئے گا۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی" —— ناز چونک اٹھی۔ جیدا اُس کی پیٹھ پیچھے کھڑا کہہ رہا تھا۔ ناز نے اپنے کندھے پر ایک ہاتھ کا ہلکا پھلکا بوجھ محسوس کیا اور سنا —— "اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔"

اس اذیت ناک عرصے میں یہ پہلا ہاتھ تھا جو اس کے کندھے پر نہایت آہستگی سے رکھا گیا تھا اور جس کے بوجھ میں تشدد کا عنصر نہیں تھا ورنہ اس کے جسم کے ساتھ جو بھی ہاتھ لگتا تھا اس کی انگلیاں اُس کے نازک جسم میں دھنس جاتی تھیں پھر یہ انگلیاں اس کے جسم پر بچھوؤں کی طرح رینگتی تھیں۔

جیدا کے ہاتھ کے لمس کے ساتھ "اس کرسی پر بیٹھ جاؤ" کی آواز میں بھی قدرے اپنائیت تھی۔ ناز سدھائے ہوئے جانور کی طرح کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس نے دونوں کہنیاں میز پر ٹیک دیں، سر ہاتھوں میں رکھ لیا اور وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ جیدا خاموشی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ناز اسی سلوک اور برتاؤ کا انتظار کر رہی تھی جو ہر رات اُس سے ہو رہا تھا۔

اُسے اونگھ آئی پھر نیند کا ایسا جھونکا کہ اس کا سر ڈھلک کر کندھے پر جا لگا اور وہ چونک کر سنبھل گئی۔ اس کی پیٹھ جیدا کی طرف تھی۔ وہ جیدا کی طرف گھومی۔ اس کی آنکھوں میں التجائیں اونگھ رہی تھیں۔ رات نصف سے زیادہ گزر گئی تھی۔

ناز آہستہ سے اٹھی اور کرسی کا سہارا لے کر رندھی ہوئی آواز میں بولی "یوں تڑپا تڑپا کے مجھے کیوں مار رہے ہو ظالمو! ایک رات تو سو لینے دو" — وہ ٹانگیں گھسیٹ کر آگے بڑھی، جیدا ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔ ناز آگے نہ چل سکی اور سسکنے لگی۔

"بستر بچھا ہوا ہے سو جاؤ" — جیدا نے کہا۔

"نہیں" — ناز نے کہا — "تم مجھے سوتے میں پریشان کرو گے"

"ناز" — جیدا ٹھہری ہوئی آواز میں بولا — "میں نے تمہیں اپنے لیے نہیں خریدا۔ تم میرے متعلق شاید کچھ بھی نہیں جانتیں۔

"سب جانتی ہوں" — ناز نے بے بس عتاب سے کہا — "تم غنڈے ہو، بد معاش ہو، تم ایسے انسان ہو..."

"میں انسان نہیں ہوں" — جیدا نے اسے ٹوک دیا — "میں جیدا جیب کترا ہوں" — وہ تلخ سا گھونٹ نگل کر بولا — "خاموشی سے سو جاؤ۔ مجھے اپنے لیے تمہارے جسم کی ضرورت نہیں۔ میں نے کبھی جھک نہیں ماری" — ذرا رک کے بولا — "تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ، پھر سو جانا اور یہ سن لو کہ آج سے تمہاری تمام تکلیفیں ختم ہیں۔ تمہیں کوئی ہاتھ بھی نہ لگا سکے گا۔ اچھا کھانا اور اچھے کپڑے ملیں گے۔ ایک لڑکا تمہاری خدمت کو موجود رہے گا اور دو آدمی دوسرے کمرے میں پہرے پر رہیں گے۔ اب آرام سے سو جاؤ۔ جب جی چاہے جاگنا۔ تمہارے لیے نئے کپڑے کل آئیں گے۔ نہانے دھونے کا بندوبست بھی ہو جائے گا"

"آخر کب تک مجھے قید رکھو گے؟"

"جب تک راہ پر نہ آ جاؤ"

"میں اس راہ پر کبھی نہ آؤں گی" — ناز نے ہاری ہوئی آواز میں کہا — "کیوں ناحق اپنا وقت ضائع کرتے ہو!... مجھے مار دو پھر میری لاش سے کھیلتے رہنا"

"جیدا نے عورت پر کبھی وار نہیں کیا ناز! تم اس کمرے میں قید رہو گی۔ اس کے سوا تمہیں اور کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ تم یہاں سے ہزار کوشش کے باوجود بھاگ نہ سکو گی۔ تمہیں معلوم نہیں تم کہاں ہو۔ یہ جگہ زمین دوز ہے جہاں سے کبھی کوئی نکل کے نہیں جا سکا..... اٹھو..... سو جاؤ"

"نہیں" — ناز نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا — "تم مجھے سونے نہیں دو گے۔ تمہارے آدمی ہر رات ایسا ہی کرتے ہیں"

"ناز" — جیدا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرم مزاجی سے بولا — "تم بہت خوبصورت ہو۔ میری کوئی بہن اس قدر دلکش نہیں۔ تم جوان ہو بلکہ نوجوان۔ تمہارا جسم کچھ ایسا ہے کہ بڑے بڑے مسلمان کافر ہو جائیں گے۔ تمہارے نقش و نگار میں بے پناہ کشش ہے۔ اپنے حسن اور جوانی کو تباہ نہ کرو مگر یہ سن لو کہ مجھے تمہارے حسن اور تمہاری جوانی کی ضرورت نہیں۔ میں پتھر ہوں ناز! میں برف کا بلاک ہوں"

جیدا آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ناز کے کچلے مسلے ہوئے جسم میں ایک انوکھا سا اثر سرایت کرتا جا رہا تھا۔ اُس نے اعصابی تھکان اور تشنج میں ایک گونہ افاقہ محسوس کیا۔ جیدا کا لب و لہجہ ہی کچھ ایسا تھا۔

"میں تمہیں زیادہ ارزاں نہیں ہونے دوں گا" — جیدا کہہ رہا تھا — "پرائیویٹ رکھوں گا۔ دو سال کے لیے"

"تم مجھ پر رحم نہ کر سکو گے؟ جس جسم کی تم نے اتنی تعریف کی ہے اسے ہر رات نئے آدمی کے آگے پھینک دیا کرو گے؟"

"میں زور نہیں دیتا ناز! آرام کرو، پھر سوچ لینا۔ میں تمہیں آزاد نہیں کروں گا"

ناز کو بڑھیا اور دوسرے ساتھیوں نے جیدا کے متعلق تمام باتیں بتا دی تھیں۔ وہ اسے بھوت سمجھنے لگی تھی جو جہاں جاتا ہے، ایک نہ ایک انسان کو کھا کر آتا ہے۔ وہ جیدا سے خوفزدہ تھی۔ آج رات جب اس نے جیدا کا سامنا کیا، اس کی باتیں سنیں اور نرم مزاجی دیکھی تو اس کے دل پر خوف کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، حالانکہ جیدا نے اسے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اسے آزاد نہیں کرے گا۔ پھر بھی ناز نے اس میں کسی حد تک ہمدردی کی جھلک دیکھی۔ اسے یقین سا ہونے لگا کہ اس شخص نے اگر وار کیا تو اوچھا نہیں ہو گا اور ناز کو یہ خوش فہمی بھی ہونے لگی کہ جیدا اس کے حسن اور جوانی سے بہت متاثر ہے۔

"تم یہاں سو جاؤ۔ میں دوسرے کمرے میں سوتا ہوں" — جیدا نے کہا — "آج رات فرش پر سو جاؤ، کل پلنگ اور اچھا بستر آ جائے گا"

ناز یوں بستر پر بیٹھ گئی جیسے گر پڑی ہو۔ اس کا جسم نڈھال تھا۔ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔

"لیٹ جاؤ" — جیدا نے کہا۔

وہ لیٹ گئی۔ جیدا دوسرے کمرے کی طرف چل پڑا۔ ناز اسے دیکھتی رہی۔ جب اس نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ اٹھ بیٹھی۔

"سنو!" — ناز نے کہا۔

جیدا رک گیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"دوسرے کمرے میں"

"اسی کمرے میں سو جاؤ" — ناز نے سہمے ہوئے نحیف لہجے میں کہا — "اکیلے ڈر لگتا ہے"

جیدا رک گیا۔ ناز کی طرف دیکھا۔ وہ اُس کی طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے تنکے کا سہارا لے رہی ہو۔ جیدا واپس آ گیا اور کمرے کے وسط میں ناز سے کچھ پرے گرد سے اٹے ہوئے فرش پر لیٹ گیا۔

"یہ چادر لے لو" — ناز نے ایک چادر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا — "سرہانہ بھی لے لو"

جیدا نے چادر لے لی، سرہانہ نہ لیا۔ چادر فرش پر بچھا کر لالٹین بجھا کے سو گیا۔ ناز کے دکھ زدہ خیالات ذرا سی دیر اندھیرے میں بھٹکے اور وہ بھی سو گئی، مگر دل میں ایک خدشہ لیے ہوئے کہ جانے کس وقت کوئی اسے دبوچ لے۔

اُسے کسی نے نہ جگایا۔ رات گزر گئی۔ سورج بھی نکل آیا۔ جیدا جاگا۔ ایک لڑکے کو ناز کے نہانے دھونے اور کھانے پینے کے متعلق اور چند اور ہدایات دے کر باہر نکل گیا۔

ناز اُسی کروٹ پڑی تھی جس پر وہ گذشتہ رات لیٹی تھی۔ دن گزرتا جا رہا تھا مگر اس کی نیند گہری ہوتی جا رہی تھی۔ دن کا پچھلا پہر تھا جب اس نے کروٹ لی۔ آنکھ ذرا سی کھولی پھر سو گئی۔

شام کا آغاز تھا جب وہ جاگی۔ اس نے کمرے میں ہر طرف دیکھا اور گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اعصاب جو اس قدر طویل نیند سے سکون پذیر ہو گئے تھے پھر کھنچنے لگے۔ خوف و ہراس چھایا

جاتا تھا۔ وہ کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ ایک نوعمر اور صاف ستھرا لڑکا کمرے میں داخل ہُوا۔

"نہالو" — لڑکے نے کہا — "آؤ تمہیں غسلخانہ دکھا دوں۔ میں چائے لے آتا ہوں"

"سنو.... یہاں آؤ"

"میں تمہیں یہاں سے نکلنے کا راستہ نہیں بتاؤں گا" — لڑکے نے سنجیدگی سے کہا — "اور جو مرضی ہے پوچھ لو"

ناز مسکرا دی۔ ایسی مسکراہٹ جس میں شکست اور افسردگی رو رہی تھی۔

"یہاں بھی مجھے ماریں گے؟" — اس نے لڑکے سے پوچھا۔

"نہیں یہاں کسی کو مارا نہیں جاتا" — لڑکے نے جواب دیا — "یہاں قتل کیا جاتا ہے"

"مجھے بھی قتل کریں گے؟" — ناز نے یوں اطمینان سے پوچھا جیسے اس کے جرم کی یہی سزا تھی جس کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار تھی۔

"یہ اُستاد کو معلوم ہو گا کہ وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے گا" — لڑکے نے کہا — "رات کو اُس نے تمہارے ساتھ باتیں کی ہوں گی! وہ جسے قتل کرتا ہے اُسے پہلے بتا دیتا ہے.... تمہیں کیا بتایا تھا اُس نے؟"

"کہتا تھا تمہیں یہاں کوئی پریشان نہیں کرے گا.... اور اب تم یہیں رہو گی اور...."

"بس بس" — لڑکے نے اس کا فقرہ کاٹتے ہُوئے کہا — "تم اب مزے میں رہو گی۔ یہاں تمہیں کوئی نہیں ستائے گا۔ استاد جو کہہ دیتا ہے وہی کرتا ہے"

لڑکا اُس کے پاس بیٹھ گیا اور مسکرا کر پوچھنے لگا — "تمہیں استاد نے اپنے لیے رکھ لیا ہے؟"

ناز کو غصہ آنے ہی والا تھا کہ اسے یاد آ گیا کہ وہ مہذب دنیا سے بہت دور زمین دوز بستی میں قید ہے وہ سنبھل گئی اور بولی — "یہ تو مجھے معلوم نہیں.... اُس نے تمہیں کچھ بتایا تھا؟"

"نہیں تو، میں نے ویسے ہی پوچھا ہے" — لڑکے نے جواب دیا — "لیکن وہ اپنے لیے کسی کو رکھتا نہیں۔ بالی نے اس کی بہت منّتیں کی تھیں کہ وہ اُسے جاپانی روڈ پر نہ بٹھائے، اپنے پاس رکھ لے۔ استاد نہیں مانا تھا"

"بالی خوبصورت ہے؟" — ناز نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں! ہے تو خوبصورت لیکن تم سے زیادہ نہیں" — لڑکے نے یوں جواب دیا جیسے اپنے کھلونے کی تعریف کر رہا ہو۔ بولا — "اُس کی آنکھیں بڑی مست ہیں.... اچھا میں چائے لاتا ہوں تم نہا لو۔ استاد کو نہ بتانا کہ میں نے چائے دیر سے دی تھی۔ اللہ قسم میری چمڑی ادھیڑ دے گا.... اور سنو! تم استاد سے کہو کہ تمہیں اپنے لیے رکھ لے قسم اللہ کی اتنی عیش کرو گی کہ کیا بتاؤں۔ کہنا مجھے ٹیکسی نہ بناؤ، پرائیویٹ رکھ لو۔ استاد کو نہیں بتانا کہ میں نے ایسے کہا تھا، ہیں؟.... نہیں تو میں کہہ دوں گا کہ یہ چھوکری کھڑکی کھول کر بھاگنے لگی تھی اور میں نے اسے بڑی مشکل سے پکڑا ہے۔ پھر استاد تمہیں الٹا لٹکا کر مارے گا"

"چائے کہاں سے لاؤ گے؟" — ناز نے غسلخانے کی طرف جاتے ہُوئے پُوچھا۔

"ہوٹل سے" — لڑکے نے جواب دیا — "اُستاد نے کہا تھا کہ چائے کے ساتھ ہاف بوائل انڈے اور ایک فروٹ کیک لانا اور رات کے کھانے کے لیے بھنی مرغی، چھ کباب اور دو شاہی ٹکڑے کہہ گیا تھا"

ناز کے منہ میں پانی بھر آیا اور وہ غسل خانے میں گھس گئی جہاں تولیہ، صابن، کنگھی اور تیل کی نئی بوتل رکھی

تھی۔ ایک طرف کھونٹی پر نیلے رنگ کا ہملٹن کا سوٹ اور دوپٹہ لٹکا ہُوا تھا۔ دروازے میں نئے باتھ روم سلیپر پڑے تھے۔ دیوار کے ساتھ نیا آئینہ لٹکا ہُوا تھا

وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہُوئی مگر اپنے آپ کو پہلی نظر میں پہچان نہ سکی۔ جب پہچان چکی تو نہ پہچانے کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔ اس کے جسم کا انگ انگ کراہ رہا تھا جسے وہ برداشت کر رہی تھی لیکن اپنے چہرے کا یہ حال حلیہ دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھی اور نہ ہی اپنا سامنا کرنے کی اُس میں تاب تھی۔ اس کے آنسو نکل آئے اور دل ڈوبنے لگا۔

ناز نے آئینے سے مُنہ پھیر کر کپڑے اتارے اور نل کھول کر نیچے بیٹھ گئی۔ پانی کی تیز اور دبیز دھار اُس کی گیارہ دنوں اور بارہ راتوں کی اذیّت اور تھکان دھونے لگی۔ کھچی تنی نسیں اپنی جگہ پر آنے لگیں۔ اعصاب سکون پذیر ہونے لگے اور بھوک کی شدّت کا بھی احساس ہونے لگا۔

جس رات جیدا اسلم کے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں داخل ہُوا تھا اس سے تھوڑی دیر پہلے ناز نے پیٹ اور جی بھر کے کھانا کھایا تھا اور آج اتنے دنوں بعد اسے پھر اُسی قسم کی بُھوک محسوس ہُوئی۔

جب وہ تولیے سے جسم پونچھ کر ہملٹن کی نئی قمیض پہننے لگی تو کپڑے کی چمک اور ملائم پن میں اسے تلخ سی لذّت محسوس ہُوئی۔ اس نے جلدی سے قمیض پہن لی۔ پھر شلوار پہنی اور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہُوئی۔ اپنی نکھری ہُوئی صُورت دیکھ کر اسے سکون سا محسوس ہُوا۔ ہر زاویے سے اپنے آپ کو دیکھ کر وہ باہر نکل آئی۔

کمرے میں پہنچی تو وہاں چارپائی بچھی دیکھی۔ اس پر بچھا ہُوا اچھی قسم کا بستر تھا۔ ساتھ ایک چھوٹی سی میز تھی جس پر لڑکا چائے رکھ چکا تھا۔ وہ بے صبری سے چائے پر بیٹھ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے چاروں ہاف بوائل انڈے اور سارا فروٹ کیک کھا گئی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کے جبڑے تھک گئے ہوں۔ چائے کے گرم گرم گھونٹ جبڑوں کو سہلانے لگے۔ اس کے جسم میں زندگی کی رمق بیدار ہونے لگی اور اعصاب تر و تازہ ہونے لگے۔

وہ کچھ سوچنے ہی لگی تھی کہ لڑکے نے اُسے چونکا دیا — "تم بالی سے زیادہ خوبصورت ہو"

لڑکا اتنی دیر سے اُس کے دُھلے ہوئے بالوں اور چہرے کی سپیدی کو دیکھ رہا تھا۔ اس سپیدی پر کہیں کہیں گلابی سے دھبّے جو غیر موزوں نہیں تھے، نمودار ہو گئے تھے۔

"استاد تمہیں اپنے لیے رکھ لے گا" — لڑکے نے کہا۔

ناز نے اُس کی طرف دیکھا اور انوکھے سے انداز سے مُسکرا دی۔ اس مسکراہٹ پر لڑکا بھی مُسکرا دیا۔

"دیکھو!" — لڑکے نے کہا — "استاد کو نہیں بتانا، میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا۔ تمہارے فائدے کی بات ہے"

"تم استاد کے نوکر ہو؟" — ناز نے مجروح سی شگفتگی سے پوچھا۔

"ہم ایسی باتیں کسی کو نہیں بتایا کرتے" — لڑکے نے جواب دیا اور پوچھا — "کھانا کس وقت لاؤں؟"

"وہ کس وقت آئے گا؟.... تمہارا استاد؟"

"اُس کا انتظار کرو گی؟"

"ہوں!"

"اس کا کچھ پتہ نہیں" — لڑکے نے کہا — "تم جس وقت کہو گی کھانا لے آؤں گا۔ کھا کے مزے سے سو جانا۔ یہاں تمہیں کوئی نہیں چھیڑے گا۔"

"یہاں اور کوئی بھی آتا ہے؟.... رات کو؟"

"ہاں! استاد کے تین اور ساتھی، مُنّا، ٹیپو اور بادل۔ وہ ساتھ والے کمرے میں سوتے ہیں۔ شاید وہ تمہارے پاس آئیں گے اور تمہیں دھندا کمانے کے لیے اکسائیں گے لیکن تمہیں چھیڑیں گے نہیں۔ اس گھر میں استاد نہیں بدمعاشی نہیں کرنے دیتا۔ وہ بدمعاشی کے لیے گُلّی کے پاس چلے جاتے ہیں۔"

"گُلّی کون ہے؟"

"وہ بھی ہماری ٹیکسی ہے" — لڑکے نے جواب دیا — "پرانی سیٹ ہے لیکن اچھی چلتی ہے۔"

"سنو!" — ناز نے ذرا جھینپتے ہوئے پوچھا — "یہ ٹیکسی، سیٹ اور پرائیویٹ کیا ہوتا ہے؟"

"یہ ساری رنڈیاں ہوتی ہیں" — لڑکے نے چارپائی کے کونے پر بیٹھتے ہوئے کہا — "ٹیکسی اُسے کہتے ہیں جسے گاہک اپنے ساتھ ہاکس بے یا کلفٹن یا سینڈسپٹ یا ہوٹل یا اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ سیٹ وہ ہوتی ہے جس کے ساتھ اپنا ایک آدمی ہوتا ہے۔ وہ گھوم پھر کر گاہک کو تلاش کرتی ہے اور پرائیویٹ بڑی قیمتی چیز ہوتی ہے۔ وہ تمہاری طرح جوان اور خوبصورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے اچھی اچھی قسم کے مستقل گاہک ہوتے ہیں۔ وہ اپنے گھر میں ہی رہتی ہے۔ کوٹھے پر نہیں بیٹھتی۔ اسے بعض لوگ بہت سارا روپیہ دے کر رشوت کے طور پر کسی بڑے افسر کے پاس بھیجتے ہیں۔

ناز چپ چاپ سن رہی تھی۔ اُس کے جذبات میں انوکھا سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔ لڑکا کہہ رہا تھا — "تم پرائیویٹ بن جاؤ تو اچھا ہے۔ بالی پرائیویٹ ہے۔ استاد اُسکی بہت خاطر کرتا ہے.... ایک گانے والی ہوتی ہے، جیسے ہماری شمّی ہے۔ وہ صرف ناچتی گاتی ہے۔ اسی سے بے شمار آمدنی ہو جاتی ہے۔"

لڑکا کسی عجائب گھر کے گائیڈ کی طرح بول رہا تھا اور ناز تصوّروں میں ان عجائبات کو جیسے چھو چھو کر دیکھ رہی ہو لیکن اس کے اعصاب ان تصوّروں کے متحمل نہیں ہو رہے تھے۔

"تم کب سے یہاں ہو؟" — ناز نے لڑکے کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"میں دس بارہ برس کا تھا جب اُستاد کے پاس آیا تھا۔"

"کیسے؟"

"گھر سے بھاگ آیا تھا۔"

"تمہارے ماں باپ ہیں؟"

"پتہ نہیں" — لڑکے نے اس طرح تحمّل سے جواب دیا جیسے جان پہچان کے ہمجولیوں کے متعلق رسمی باتیں کر رہا ہو۔ کہنے لگا — "ماں کو میرے باپ نے گھر سے نکال دیا تھا۔"

"کیوں؟"

"میرے باپ کو غصہ بہت آتا تھا۔ پہلے تو اُسے کبھی غصہ نہیں آیا تھا۔ وہ معلوم نہیں کون سے دفتر میں چپڑاسی تھا۔ ایک دن گھر آیا تو میری ماں کو کہنے لگا۔ میں نے نوکری چھوڑ دی ہے۔ ماں نے پوچھا، کیوں چھوڑ دی ہے نوکری؟ کہنے لگا۔ صاحب ماں بہن کی گالیاں دیتا ہے۔ مجھے تنخواہ سرکاری خزانے سے ملتی ہے لیکن صاحب مجھے اپنے گھر کام کے لیے بھیج دیتا ہے۔ ماں نے کہا کوئی اور نوکری کر لو۔

کہنے لگا۔ اب کسی کی نوکری نہیں کروں گا۔ اب سائیکل رکشا چلاؤں گا۔ اُس نے قرض لے کر اڑھائی سو یا شاید ساڑھے تین سو روپے کی سائیکل رکشا خریدی مگر لائسنس نہ ملا۔ لائسنس دینے والے ایک سو روپیہ مانگتے تھے۔ باپ کو اور روپیہ نہ مل سکا۔ گھر میں آٹا بھی نہیں تھا۔ چند روز بعد رکشا بیچ ڈالی۔ اس کا صرف ایک سو روپیہ ملا۔ پھر باپ کو ہر وقت غصہ آنے لگا....

"میں اُس وقت چھوٹا سا تھا۔ اُس نے گھر میں مار پٹائی شروع کر دی۔ کبھی مجھے مارے کبھی ماں کو مارے۔ ایک دن اُسے کیماڑی گودی میں نوکری مل گئی۔ بیس روز کام پر گیا۔ ایک دن معلوم نہیں اس کے اوپر کیا گرا کہ اُس کا بازو ٹوٹ گیا اور وہ بیکار ہو گیا۔ نوکری سے بھی جواب مل گیا اور بیس روز کے پیسے بھی نہ ملے۔ پھر باپ ہر روز ذرا ذرا سی بات پر مجھے اور ماں کو مارنے پیٹنے لگا....

"ایک دن اس نے ماں کو گھر سے نکال دیا اور مجھے اپنے پاس رکھ لیا۔ ماں معلوم نہیں کہاں چلی گئی اور ایک روز باپ، ماں کے جانے کے دس بارہ روز بعد، صبح سویرے باہر گیا پھر واپس نہیں آیا۔ دو روز تک وہ نہ آیا تو میں فٹ پاتھ پر روتا پھرا۔ تیسرے روز استاد جیدا نے مجھے دیکھا۔ اُس نے میری ساری باتیں سنیں اور مجھے یہاں لے آیا۔ یہاں اب بڑے مزے میں دن کٹ رہے ہیں۔ اب تو میں ماسٹر ہو گیا ہوں۔"

"کیسا ماسٹر؟"

"ایسا ماسٹر کہ تم ایک پل کیلئے اُدھر دیکھو تو تمہارے دائیں کان کا بُندہ میرے ہاتھ میں ہو گا۔ کیا مجال تمہیں پتہ بھی چلنے دوں۔ ہاتھ کی صفائی ہے۔"

"تم بہت پکی باتیں کر لیتے ہو۔ کیا ہے عمر تمہاری؟.... پندرہ برس ہو گی؟"

"میں آٹھ نو برس کی عمر میں بھی ایسی ہی پکی باتیں کیا کرتا تھا" — لڑکے کے لہجے کی سنجیدگی میں غمزدگی کی جھلک پیدا ہونے لگی۔ بولا — "غریبوں کے بچے بچے نہیں ہوتے، وہ پیدائشی بُوڑھے ہوتے ہیں۔ وہ جوان نہیں ہوتے۔ جوانی شروع ہوتی ہے تو وہ مر جاتے ہیں۔ پھر ان کی لاشیں چلتی پھرتی رہتی ہیں کسی طرف ہانک کے لے جاؤ.... جو ہماری دنیا میں آ جاتے ہیں انہیں کوئی نہیں ہانک سکتا۔ وہ بادشاہ ہوتے ہیں جیبیں کاٹتے ہیں، تالے توڑتے ہیں اور مزے کرتے ہیں۔"

ناز کی آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں۔ لڑکا اُس کی توقعات سے کہیں زیادہ پختہ ذہن کا تھا۔ وہ لڑکپن کی اس کچی عمر میں عمر رسیدہ اور جہاندیدہ بُوڑھا لگ رہا تھا۔

"استاد جیدا کسی کے ساتھ زیادہ باتیں نہیں کرتا" — لڑکا کہہ رہا تھا — "صرف میرے ساتھ باتیں کرتا ہے۔ وہ میری باتیں سنتا ہے اور اپنی سناتا ہے۔ ایک دن میری باتیں سن کر وہ رو پڑا تھا۔ پھر مجھے بھی رونا آ گیا۔ جب میں رونے لگا تو اس نے زور سے میرے منہ پر تھپڑ مارا اور کہنے لگا، سالے روتا کیوں ہے؟ .... پھر اُس نے مجھے سگریٹ میں چرس بھر دی اور کہا، لگا دم، مٹے غم۔"

"ارے!" — ناز نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا — "تم چرس بھی پیتے ہو؟"

"نہیں! چرس مجھے اچھی نہیں لگتی۔"

"شاباش!"

"میں شراب پیتا ہوں" — لڑکا بولا — "چرس کے ایک کش میں جو مزہ ہے وہ شراب کی پوری بوتل میں

نہیں لیکن شراب مجھے اچھی لگتی ہے۔"

"تمہیں ماں یاد نہیں آتی؟" — ناز نے دکھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یاد کرنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی" — لڑکے نے کہا — "شروع شروع میں اُستاد جیدا نے اُسے تلاش کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن وہ نہ ملی۔ اس نے کراچی کا کونہ کونہ چھان مارا تھا۔"

"وہ اُسے بھی طوائف بنانا چاہتا ہوگا" — ناز نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں" — لڑکے نے کہا — "اُستاد مرے ہوؤں کو نہیں مارتا۔ تم اسے جانتی نہیں۔ بڑا اچھا آدمی ہے اللہ قسم! میں نے کہا تھا تم میری ماں کو تلاش کر کے اُس کے ساتھ شادی کر لو اور میں تمہارا بیٹا بن جاؤں گا لیکن ماں ملی نہیں۔ اب تو میں نے اُسے بھلا دیا ہے..... استاد ہی میرا سب کچھ ہے..... ماں بھی باپ بھی..."

"تمہاری ماں خوبصورت تھی؟" — ناز نے بے اختیار سے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں تو آپی وہ تم سے زیادہ خوبصورت تھی۔ پتہ نہیں بے چاری زندہ ہے کہ نہیں" — لڑکا کہتے کہتے رک گیا اور اُس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ناز نے بے اختیار اُسے کندھے سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور بازوؤں میں بھینچ کر اُس کی پیشانی چوم لی۔ اس کی باتیں ناز کے دل کی گہرائیوں میں اُتر گئی تھیں۔ اس نے لڑکے کو اور زیادہ زور سے بھینچا اور اُس کے آنسو لڑھک کر لڑکے کے گالوں پر جا پڑے اور لڑکے کے دو آنسوؤں نے انہیں اپنے اندر جذب کر لیا۔

لڑکے کو ایک عرصے بعد، ایک طویل عرصے بعد، عورت کی گود کا گداز نصیب ہوا۔ اس نے اپنے گول گول گال ناز کے سینے کے ساتھ لگا دیئے اور خود فراموشی کے عالم میں وہ اپنا چہرہ اُس کے سینے میں چھپانے لگا۔ اُسے قرار محسوس ہونے لگا جیسے چڑیا کے گرے ہوتے بچے کو پھر سے گھونسلے میں رکھ دیا گیا ہو۔

ناز کے شباب سے بھرپور سینے میں اس نے وہ لذّت محسوس کی جو اُس کے ہونٹوں اور زبان میں، اتنے سال گزر جانے کے بعد ابھی تک باقی تھی۔ وہی لذت، وہی ذائقہ آج بجلی کی سرعت سے زندہ ہو کر اس کی رگ رگ میں سما گیا۔ اُس پر خود سپردگی اور وارفتگی طاری ہوگئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور وہ ماضی کے ماہ و سال پھلانگ گیا۔

دونوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ دونوں کے سینوں میں سسکیاں اور ہچکیاں تڑپ رہی تھیں۔

چھت کے جالے شام کے پھیلتے ہوتے اندھیرے میں گم ہو رہے تھے۔ ایک بچہ ایک عورت کی گود میں ماں کی مامتا میں گم ہو رہا تھا۔ ایک عورت ایک بچے کو گود میں لیے ماں کے روپ میں گم ہو رہی تھی۔ کراچی کا ایک اور دن ایک اور رات میں گم ہوگیا۔

لڑکا ایک عرصے سے نہیں رویا تھا — اس پر زمین دوز دنیا کا طلسم طاری تھا، مگر آج ایک عورت کے سینے کی تپش سے طلسم ٹوٹ گیا۔ لڑکا جو رویا تو اُسے محسوس ہوا جیسے وہ جانے کتنی لمبی مسافت طے کر کے شل ہوگیا ہو اور وہ اُس ماں کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہو جس کے متعلق اس نے کہا تھا کہ اسے بھول چکا ہے۔ آنسو اس کے تھکے ہوتے اعضاء کو سہلا رہے تھے۔

ناز گیارہ دنوں سے رو رہی تھی۔ ہر آنسو انگارہ بن کر نکلتا تھا اور گالوں کو جلاتا بہ جاتا تھا لیکن آج کے رونے میں اُسے روحانی قرار نصیب ہوا۔ وہ لڑکے کو شاید رات بھر سینے سے لگاتے روتی ہی رہتی لیکن لڑکا خواب بیداری سے جاگ اُٹھا اور ناز کی گود سے الگ ہوگیا۔

کمرے میں گھپ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ لڑکے نے جیب سے ماچس نکالی۔ جلائی اور لالٹین کو روشن کر کے ناز کی طرف دیکھے یا کوئی بات کیے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا۔ ناز اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔

کچھ دیر بعد لڑکا کھانا لے آیا۔ ناز کھانے پر بیٹھ گئی۔ لڑکا نہ بیٹھا۔ ناز نے اسے کھانے کے لیے کہا لیکن وہ نہ مانا۔

"ہم سب ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں" — لڑکے نے کہا — "اُستاد ہر مہینے بل ادا کر دیتا ہے۔"

لیکن ناز نے اصرار کر کے اُسے اپنے ساتھ بٹھا ہی لیا۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ناز چارپائی پر لیٹی خیالوں کے تانے بانے تن رہی تھی۔ اس کی نگاہیں چھت کے جالوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ لڑکا اسی مکان کے نہ جانے کون سے کمرے میں جا کر سو گیا تھا۔

ناز کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ اُٹھ بیٹھی سمجھی جیدا ہوگا لیکن وہ ٹیپو تھا۔

ٹیپو پچیس چھبیس برس کی عمر کا آدمی تھا۔ سر مشین سے منڈھا ہوا، چہرہ تندرست اور گول، جسم بھرا بھرا قد بُت اور چال ڈھال سے فٹ بال کا کھلاڑی معلوم ہوتا تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی جن میں بڑے بڑے فتنے اور ہنگامے چمک رہے تھے۔ وہ چرمڑہ پھولدار بشرٹ اور پاجامہ نما پتلون پہنے ہوتے تھا۔ سوتا بھی انہی کپڑوں میں تھا۔

ناز اسے اچھی طرح جانتی تھی۔ اُس نے اسے پہلی بار اس کمرے میں دیکھا تھا جس میں جیدا اُسے چھوڑ آیا تھا۔ اس گول مٹول وحشی نے ناز کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ ناز نے اسے درندے اور وحشی ہی کے روپ میں دیکھا تھا۔

آج رات جب وہ کمرے میں آیا تو ناز کو پہلا صدمہ یہ ہوا کہ وہ جیدا نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ ٹیپو تھا۔ اُسے دیکھتے ہی ناز کے انگ انگ میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ دل ڈوبنے لگا۔ ٹیپو نے ناز کے ڈھلے ڈھلاتے چمکتے ہوتے بالوں اور چہرے مہرے کو دیکھا تو زیرِ لب مسکرایا۔ اس کے ریشمی کپڑوں پر نگاہ ڈالی تو اُس کی نگاہیں پھلٹن سے پھسلتی ناز کے پاؤں پر جا پڑیں جن کے ناخنوں سے نیل پالش بالکل ہی ڈھل چکی تھی۔ ناخنوں کا قدرتی گلابی رنگ نکھر آیا تھا۔

"تمہارے استاد نے کہا ہے کہ اب تمہیں کوئی پریشان نہیں کرے گا" — ناز نے خوف زدہ رعب سے کہا — "تم نے مجھے ہاتھ لگایا تو میں تمہارے استاد کو بتا دوں گی۔ اُس نے کہا تھا مجھے بتانا۔"

"ناز!" — ٹیپو نے مسکراتے ہوئے کہا — "استاد کا رعب دینے کی ضرورت نہیں تمہیں کوئی ہاتھ نہیں لگاتے گا۔ وہ وقت گیا گزرا جب میں نے تمہیں پریشان کیا تھا۔"

ناز کا خوف دور ہونے لگا۔

"اُستاد نے تمہیں بتا دیا ہوگا کہ تمہیں آزاد نہیں کیا جاتے گا" — ٹیپو نے سوالیہ انداز میں کہا، پھر بولا — مجھے تمہارے اس خوبصورت جسم اور اس قدر حسین اور معصوم چہرے سے ہمدردی ہے تمہارے یہ ریشمی بال! ان کی قیمت ہم سے پوچھو ناز! ہم موتیوں کے بیوپاری ہیں تم تو ہیرا ہو..... مان جاؤ ناز! ہم تمہیں پھول کی طرح رکھیں گے تمہارے قدموں میں قالین بچھائیں گے تم رانی بنی رہو گی۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ ہر رات صرف ایک آدمی کو خوش کر دیا کرو۔ ہماری بڑھیا تمہیں ایسے ایسے گر بتا دے گی کہ تمہیں ذرہ بھر زحمت نہ ہوگی۔ گاہک تمہارے قدموں میں سر رکھیں گے۔ وہ تمہیں کار پیش کریں گے سونے کے ہار دیں گے تمہارے قدموں میں دولت

لٹائیں گے۔ سو سو ناز برداریاں کریں گے، اور تم محبت کا دھوکہ بن کر صرف ناٹک کھیلو گی..... اس جوانی سے فائدہ اٹھالو ناز! کچھ دن کھُل کھیلو۔ دولت؟ جتنی چاہو سمیٹ لو۔"

ٹیپو ڈرامائی انداز میں بولتا جارہا تھا اور ناز اسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ آج ٹیپو کا لب ولہجہ کرخت نہیں تھا۔ اس کی باتوں میں اذیّت اور تشدد کی بُو تک نہیں تھی۔ ناز اس لہجے میں اپنائیت کی نمایاں جھلک محسوس کر رہی تھی مگر وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، اس سے وہ بیزار ہوتی جاتی تھی۔

"تمہاری گلابی پیشانی پر بکھرے ہوئے یہ چھوٹے چھوٹے بال خدا کی قسم بڑے بڑے لیڈروں اور افسروں کو کھینچ کر تمہارے سامنے لے آئیں گے" — ٹیپو کہہ رہا تھا — "میں نے ان کی بیگمیں دیکھی ہیں۔ وہ تمہارے پاؤں کی خاک بھی نہیں۔ وہ ایک دوسرے کی بیگموں کے ساتھ دل بہلاتے رہتے ہیں.... ناز! تم ان سب پر حکومت کرو گی۔ ہم تمہارے حُسن سے بلیک میلنگ کریں گے۔ تمہاری جوانی کی خاطر لاکھوں روپے کمائیں گے۔ کون کہتا ہے ہم تمہیں رنڈی بناکر کوٹھے پر بٹھائیں گے؟ ہم تمہارے اس حسن اور جوانی کو پامال نہیں ہونے دیں گے۔ تمہاری ایک نظر سے ہتھکڑیاں ٹوٹ جائیں گی۔ قانون بے بس ہوجائے گا۔ پھانسی کے پھندے ٹوٹ جائیں گے۔ استاد جیدا تمہیں سر آنکھوں پر بٹھائے گا۔"

ناز جانے کہاں کھو گئی۔ کاروں کے تصوّر میں یا دولت کی چمک میں۔ اپنے حسن و جوانی کی تعریف میں یا اپنی بے بسی میں۔ جیدا کے سر آنکھوں پر بٹھانے کے خیال میں یا جانے کہاں! اُسے معلوم ہی نہ ہوسکا کہ ٹیپو جاچکا ہے۔ صرف گونج تھی اُس کی باتوں کی جو چھت کے جالوں میں اُلجھی ہوئی بھنبھنا رہی تھی۔

ناز کو یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ وہ لیٹ گئی ہے اور اُس کی آنکھ لگ گئی ہے۔

دوسرے دن اُس کے لیے ایک اور سُوٹ اور شیفون کا دوپٹہ آگیا۔ چھت کے جالے صاف ہوگئے۔ دیواروں سے گرد جھاڑ دی گئی۔ فرش پر جانے کتنے عرصے بعد پہلی بار جھاڑو دیا گیا اور میز پر لالٹین کے ساتھ ایک ٹائم پیس رکھ دی گئی جو ناز کے مقیّد دل کی طرح کمرے کی جھاڑی پھونکی ہوئی وحشت میں ٹک ٹک لیے گن رہی تھی۔ ناز کے تھکے ماندے اعصاب ٹھکانے پر آنے لگے۔ دن کا پچھلا پہر تھا۔ وہ کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ اُسے باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھولنے کا خیال آیا۔ وہ آہستہ آہستہ کھڑکی تک گئی۔ کھڑکی کی دوسری طرف پاؤں کی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ ذرا دور سے گزرتی ہوئی کاروں کے زنّاٹے، وکٹوریہ کے گھوڑوں کی ٹاپ ٹاپ بسوں کا واویلا اور موٹر رکشاؤں کی بے ہنگم پھٹا پھٹ سنائی دے رہی تھی۔ آزاد دنیا اور اس زنداں میں لکڑی کے صرف دو کواڑ حائل تھے۔ آزاد دنیا کی گہماگہمی اسے جیسے بلا رہی تھی۔ قید، تنہائی اور اذیّت اُسے باہر کو دھکیل رہی تھی۔

اُس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھایا۔ اس کی انگلیوں نے لوہے کی چٹخنی پر چھاتے ہوئے جالے کو محسوس کیا، پھر انگلیوں نے چٹخنی تھام لی، پھر جیسے اس میں سے ہلکی سی آواز آئی ہو:

"اسے نہ کھولنا ناز!"

وہ یوں چونک اٹھی جیسے چوری چھپے مٹی کھاتے بچے کو باپ نے ڈانٹ دیا ہو۔ اُس نے گھوم کر دیکھا۔ دروازے میں مُنّا کھڑا تھا۔

مُنّا جیدا کا دستِ راست تھا۔ عمر پینتیس چالیس کے درمیان — مہینے میں ایک بار داڑھی منڈاتا تھا۔

آنکھیں چرس اور افیون کے نشے سے چڑھی ہوئیں لال سرخ اور ان میں خمار آلود ڈورے تھے۔ دانتوں کا رنگ گہرا بادامی تھا۔ چہرہ پژمردہ، جسم دبلا اور کندھے ذرا سا آگے کو جھکے ہوئے۔ بال بکھرے ہوئے، جانے کب سے نہیں کٹوائے تھے۔ خدوخال کی زردی میں ہیبت ناک سی خشکی تھی۔

ناز کا ہاتھ رک گیا، پھر چٹخنی سے ہٹ آیا — اُس نے گھوم کر مُنّے کو دیکھا تو کھسیانی سی بولی — "بند کمرے میں طبیعت گھبرا رہی تھی۔"

"اُستاد نے تمہیں بھی یہ کھڑکی کھولنے سے منع کر رکھا ہے۔"

"اُس طرف کیا ہے؟"

"وہ دنیا ہے اُس طرف جہاں اب تم نہیں جاسکو گی... ہماری بات مان جاؤ ناز! ہم تمہیں ایسی کھڑکی میں بٹھائیں گے جس کے ساتھ ریشمی پردے لٹکے ہوں گے اور تم رانی بن کر بیٹھو گی" — مُنّا کہہ رہا تھا — "جیدا جیسا استاد تمہیں کہیں نہیں ملے گا۔ اپنی دنیا کا دیوتا ہے.... راہ پر آجاؤ.... عیش کرو گی۔"

"رنڈی بن جاؤں؟" — ناز نے طنزاً پوچھا۔

"رنڈی نہیں، پرائیویٹ۔ کوئی جلدی نہیں، سوچ لو۔ اطمینان سے سوچ لو"

"میں سوچ چکی ہوں"

"کیا؟"

"میں اپنا جسم نہیں بیچوں گی۔"

"تم نے بہت تکلیفیں اُٹھائی ہیں ناز! پھر سوچ لینا۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں.... کہو تو چھوکرا تمہارے پڑھنے کے لیے کوئی کتاب رسالہ لے آتے؟"

"مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔"

"بھاگنے کی مت سوچنا۔ تم کراچی کے گلی کوچوں سے واقف نہیں اور ہم یہاں کی اینٹ اینٹ کو جانتے ہیں۔ میں تمہیں دھمکی نہیں دے رہا ناز! ہم تو بُو پا لیتے ہیں.... کسی تھانے میں جا بیٹھو۔ پل بھر میں اٹھا لائیں گے۔" اتنے میں لڑکا چائے لے آیا۔ مُنّے نے ٹرے میں رکھے کیک کو دیکھا، اٹھایا اور سونگھا اور کڑک کر بولا — "سور کے بچے! یہ کیک وہاں نہیں دیکھا تھا؟ سونگھ ذرا اسے؟ دس روز کا پرانا معلوم ہوتا ہے۔ واپس لے جا اسے اور اُس حرامزادے سے کہہ کہ آئندہ ایسی چیزیں بھیجیں تو ایک پیسہ نہیں ملے گا.... بھاگ! تازہ کیک لے آ"..... لڑکا جانے لگا تو مُنّے نے اسے کہا — "ادرش! ہوٹل کے سامنے بک سٹال ہے نا! وہاں سے دس بارہ رسالے لے آ۔"

"پیسے؟"

"میں دے آؤں گا۔"

مُنّا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ناز کو اس خیال سے راحت ہوئی کہ اب مُنّے جیسا درندہ بھی اُس کی ناز برداریاں کرنے لگا ہے۔ یہ وہی مُنّا تھا جس نے ٹیپو اور بادل کے ساتھ ناز کے جسم کو کیا کیا اذیّت نہ دی تھی۔ لیکن مُنّے کے آج کے سلوک سے ناز اپنے آپ پر فخر بھی کرنے لگی مگر وہ یہ نہ جان سکی کہ یہ لوگ اب اُس کے ذہن اور سوچ پر قبضہ کر رہے ہیں۔

چائے آئی اور ناز نے پی لی۔ اس کے سامنے فلمی رسالوں کا انبار پڑا تھا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ جیدا نہ آیا۔ رات گزر گئی۔ دن بھی گزر گیا۔ ناز اسی کمرے میں ٹہلتی رہی، فلمی رسالے پڑھتی رہی، سوتی رہی، جاگتی رہی، خواب دیکھتی رہی — کچھ سوتے کچھ جاگتے۔

مُنّا، ٹیپو اور بادل وقتاً فوقتاً اپنے مخصوص ڈراماتی اور کاروباری انداز میں اسے حسن اور جوانی سے دولت کمانے پر اکساتے رہے۔

لڑکا اس کی خاطر داری میں مصروف رہا۔ ناز جیدا کا پوچھتی رہی، انتظار کرتی رہی، کمرے میں گھومتی رہی۔ دس دن اور دس راتیں بیت گئیں۔

ان دس دنوں اور دس راتوں میں ناز نے وہ تمام رسالے پڑھ ڈالے جو مُنّے نے اس کے لیے منگوائے تھے۔ اِن میں زیادہ تر فلمی رسالے تھے اور تین چار ایسے بھی تھے جن کا فلمی دنیا کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا لیکن اُن کی ہر کہانی چلتی پھرتی فلم تھی — جرم و جاسوسی اور لڑائی مار کٹائی کی فلم، عشق و محبت کی فلم — الفاظ میں ہر منظر اس طرح بیان کیا گیا تھا کہ ذہن کے پردے پر ہر ایکشن نظر آنے لگتا تھا۔

ان کہانیوں میں ناز نے اپنے آپ کو دیکھا۔ اپنے زر پرست اور نمائش پسند بھائیوں کو بھی دیکھا جو اُس پر گزری تھی، وہ اُس نے کئی ایک کہانیوں میں پڑھی۔ اس نے رسالوں میں فلمی دنیا کو دیکھا جس میں اسے کوئی قباحت نظر نہ آئی۔ یہ دنیا اُس کے لیے حسین تھی۔ جیدا کے اس قید خانے میں آتے ہی اُسے فلمی دنیا سے نفرت ہو گئی تھی مگر فلمی رسالوں نے اس نفرت کو محبّت میں بدل دیا۔

غیر فلمی رسالوں میں جرم اور گناہ کو، عشق اور محبت کو جن عریاں اور مسحور کر دینے والے الفاظ میں بیان کیا گیا تھا، انہوں نے ناز کے ضمیر سے گناہ کا بوجھ اُٹھا دیا۔ اسے اپنے وجود سے جو گھن آنے لگی تھی، وہ ختم ہو گئی۔ اس کے دل میں جیدا، مُنّے، ٹیپو اور بادل کا جو خوف تھا، وہ نکل گیا۔ اسے جرم بھی اچھا لگنے لگا اور جرم کرنے والے بھی اچھے لگنے لگے۔ جیدا اچھے سلوک کی وجہ سے اسے پہلے ہی اچھا لگنے لگا تھا، اب وہ جیدا کے انتظار میں بیتاب ہونے لگی۔

اس کے لیے یہ رسالے مُنّے نے اس لیے منگوائے تھے کہ پڑھی لکھی لڑکی ہے، اس کا دل بہلا رہے گا اور فرار کی نہیں سوچے گی۔ مُنّا خود ان پڑھ تھا۔ اُس نے "برین واشنگ" جیسی اصطلاح کبھی نہیں سُنی تھی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ کسی کو اپنی راہ پر چلانے کے لیے تشدّد کے سوا کوئی اور طریقہ بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ رسالے، ان کی تصویریں اور ان کی کہانیاں مُنّے کے ارادے کے بغیر ہی ناز کی برین واشنگ کر رہی تھیں۔ مُنّے کو اور ناز کو معلوم نہیں تھا کہ یہ رسالے شریف گھرانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک دوسرے کے پیچھے جرم و گناہ کی زمین دوز لستی میں اور ہیرو ہیروئن کی دنیا میں کشاں کشاں لیے آ رہے ہیں، اور جو عملاً اِدھر نہیں آتے وہ تصوروں میں ان فحش اور اخلاق سوز کہانیوں کے کردار بن گئے ہیں۔

ناز کا پچھتاوا اور احساسِ ندامت ختم ہو گیا۔

گیارہویں رات آدھی گذر گئی تھی۔ ناز کی آنکھ کھلی۔ جیدا نے کواڑ تو آہستہ سے کھولا تھا لیکن اندھیرے میں کسی چیز سے ٹھوکر لگ گئی تھی جس سے ناز جاگ اُٹھی۔

"کون؟"

"تم جاگ رہی ہو؟"

ناز جیدا کی آواز سن کر اُٹھ بیٹھی۔

"تم آ گئے؟"

"میں دوسرے کمرے میں سوؤں گا" — جیدا نے اندھیرے میں دو قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا اور پوچھا — "کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"بتی جلالو"— ناز نے بے تکلفی سے کہا۔

کمرہ دیا سلائی سے روشن ہو گیا پھر لالٹین جل اُٹھی۔

ناز نے جیدا کو دیکھا تو اُسے شک ہُوا جیسے کوئی اور ہے۔ داڑھی بڑھی ہُوئی اور آنکھیں جیسے اتنی راتیں بند ہی نہیں ہُوئی تھیں قمیض پیٹھ سے پھٹی ہوئی تھی۔ بال بڑھے ہوتے اور گرد آلود تھے۔ چہرے کی نس نس میں شب بیداری کے آثار تھے۔ اس کی باتوں میں بھی تکان تھی۔

ناز اٹھ کھڑی ہُوئی۔ بولی— "یہاں سو جاؤ، میں فرش پر سو جاؤں گی۔"

"نہیں"— جیدا نے جمائی لے کر کہا— "دوسرے کمرے میں میرا بستر بچھا ہُوا ہے تم سو جاؤ"— اور پوچھا— "یہ دن کیسے گزرے؟"

"اچھے گزرے۔"

"اچھا سو جاؤ"— جیدا دوسرے کمرے کی طرف جانے لگا

ناز نے اُسے روک لیا۔

"یہیں سو جاؤ... چارپائی پر"— ناز نے کہا— "میں فرش پر سو جاؤں گی۔"

جیدا دوسرے کمرے سے اپنا بستر اٹھا لایا اور فرش پر بچھاتے ہُوئے بولا— "میں یہیں سو جاتا ہوں۔"

ناز اس کے بستر پر جا کھڑی ہُوئی اور بولی— "یہاں میں سوؤں گی تم چارپائی پر سو جاؤ۔"

جیدا نے اس کی طرف دیکھا اور اُسے بازوؤں پر اٹھا کر چارپائی پر لٹا دیا۔

یوں تو ناز مرد کے جسم کی لذّت سے اچھی طرح واقف تھی لیکن جیدا نے اسے بازوؤں پر اُٹھایا تو اسے ایسی راحت محسوس ہُوئی جو اسے مہذّب سوسائٹی کے مرد نہیں دے سکے تھے حالانکہ وہ خوش پوش اور خوش وضع لوگ تھے اور جیدا دس بارہ دنوں سے نہایا نہیں تھا۔ اُس کے جسم سے پسینے کی بدبو آ رہی تھی۔ وہ چرس اور شراب بھی پیتے ہُوتے تھا۔ وہ مجسّم تعفّن تھا۔

ناز جیدا کو اور زیادہ قریب سے سونگھتی تو اُسے ایک اور بُو بھی محسوس ہوتی— ایک انسان کے خون کی بو، مقتول کے خون کی بو— اس خون کے قطرے جیدا کے خنجر پر جمے ہوتے تھے اور خنجر اُس کی پتلون کی پیٹی میں قمیض کے نیچے اُڑسا ہُوا تھا۔

بتی بجھ گئی۔ ناز نے اندھیرے میں جیدا کے قدموں کی آہٹ سنی اور فرش پر بچھے ہوتے بستر میں لیٹنے کی آواز بھی سُنی۔ وہ اُس کے ساتھ باتیں کرنا چاہتی تھی مگر سوچ رہی تھی کیا بات کرے۔

"تم اتنے دن کہاں رہے؟"— ناز نے آخر پوچھ ہی لیا۔

کوئی جواب نہ ملا۔

"سو گئے؟"

خاموشی۔

"جیدا!"

وہ گہری نیند سو چکا تھا۔ اُس کا جسم اور دماغ سدھائے ہوئے جانور کی طرح اُس کے اشاروں پر چلتے تھے۔ لیٹتے ہی سو جاتا تھا، جاگتا تھا تو کئی کئی راتیں جاگتا ہی رہتا تھا۔ وہ تفکّرات اور پریشانیوں سے آزاد تھا۔ اُسے مہنگائی اور ملاوٹ کا کوئی غم نہیں تھا۔ اس کی کوئی بیوی نہیں تھی اس کے سامنے کسی بچے

کو سکول یا کالج میں داخل کرانے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا، اس لیے اُسے نہ سفارش کی ضرورت تھی نہ رشوت دینے کی۔ اُسے ایسا بھی کوئی غم نہیں تھا کہ اس کا بچہ بیمار ہو جائے گا تو ڈاکٹر کو پیسے کہاں سے دے گا۔ وہ لٹیرا تھا۔ اُسے لُٹ جانے کا غم نہیں تھا۔ وہ جیب کترا تھا۔ اُسے جیب کٹ جانے کا ڈر نہیں تھا وہ قانون شکن تھا۔ اُسے پولیس کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ اُس کا ذہن آزاد تھا اس لیے نیند اُس کی غلام تھی وہ معاشرے کا شریف اور معزّز فرد ہوتا تو مسائل اور پریشانیاں اسے سونے نہ دیتیں۔

ناز کے خیالات اندھیرے میں بھٹکنے لگے۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ اس خطرناک غنڈے سے کیوں کھلتی جا رہی ہے؟ اُس نے چاہا کہ اس کے اور اپنے درمیان دیوار حائل کر دے لیکن اس کے اندر کوئی ایسی کمزوری پرورش پا رہی تھی جس کے ہاتھوں وہ بے بس ہُوئی جا رہی تھی۔ کوئی جذبہ اسے جیدا میں گھُل مل جانے پر اکسا رہا تھا جیسے جیدا اسے اس غار سے نکال کے گھر پہنچا دے گا۔

ناز سوچتے سوچتے سو گئی۔

[ر]ات گزر گئی۔

پھر بے شمار راتیں گزر گئیں جن کا وہ حساب نہ رکھ سکی۔ اسی کمرے میں بند رہی۔ اُس کا طویل ترین سفر کمرے سے غسلخانے تک اور وہاں سے کمرے تک ہوتا تھا یا کمرے میں ٹہل لیتی تھی یا برآمدے میں گھوم پھر لیتی تھی۔

باہر کی طرف کھُلنے والی کھڑکی ہمیشہ بند رہی۔ ناز کو کبھی جرأت نہ ہُوئی کہ وہ اُسے کھولے۔ رسالے آتے رہے، اچھے اور مُرغّن کھانے آتے رہے، نئے نئے سُوٹ اور سینڈل آتے رہے۔ مُنّا، ٹیپو اور بادل اسے باتوں باتوں میں اپنے ڈھب پر لانے کے جتن کرتے رہے۔

اس عرصے میں اُس پر کسی نے کوئی سختی نہ کی بلکہ جیدا کے یہ تینوں ساتھی اور چھوکرا اس کے سامنے یوں جھکے جھکے رہتے جیسے ناز ملکہ ہو اور وہ اس کے دربار کے غلام ہوں۔ گاہے وہ تحکمانہ لہجے میں بھی بول اُٹھتی تھی۔ ایسے میں مُنّا، ٹیپو اور بادل اور زیادہ فدوی بن جاتے تھے۔

ناز کے کردار کی بنیادیں تو پہلے ہی کچی تھیں۔ اب تین چار غنڈوں نے اس پر حاکمیّت کا نشہ طاری کر دیا تو عمارت ڈولنے لگی۔ جو کسر رہ گئی تھی، وہ فلمی رسالے، جرم و جاسوسی کے ناول اور افسانے پُوری کر رہے تھے۔ ناز بے بال و پر اڑنے لگی اور وہ پنجرے کو ہی سارا جہاں سمجھنے لگی۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی سوچ نہ سکی کہ ایسے سلوک سے اُسے آہستہ آہستہ ہپناٹائز کیا جا رہا ہے۔

اس دوران جیدا کبھی اس کمرے میں سوتا کبھی آٹھ آٹھ روز غائب رہتا۔ وہ جب ناز کے پاس ہوتا تو زیادہ دیر خاموش ہی رہتا۔ ناز بات کرتی وہ سن لیتا اور مختصر سا جواب دے دیتا تھا۔

ناز نے دو تین بار اُس سے اسلم کے متعلق پوچھا کہ اُس سے پھر کبھی ملاقات ہُوئی ہے یا نہیں تو جیدا نے ٹال دیا۔ اُس نے ناز کو یہ بھی نہ بتایا کہ اس عرصے میں اسلم پر اُس کی بلیک میلنگ کا پہلا کامیاب حملہ ہو چکا ہے اور ناز کا اغوا چھپائے رکھنے کے عوض اس سے پانچ سو روپے وصول کیے جا چکے ہیں۔ جیدا نے ناز سے اُس کے خاندان کے متعلق کوئی بات نہ پوچھی۔ اس نے ناز کو یہ بھی نہ بتایا کہ وہ اس کے متعلق اور اس کے بھائیوں کی بے راہ روی کے متعلق سب کچھ جانتا ہے۔

ایک بار ناز نے جیدا سے کہا — "اب تو اس قید سے جی اکتا گیا ہے۔ ایک بار باہر کی سیر کرا لاؤ یا ایک بچہ ہی دکھا دو۔ میں بھاگوں گی نہیں۔"

"ابھی نہیں" — جیدا نے کہا — "تمہارے لیے ایک کار تمہاری 'ہاں' کا انتظار کر رہی ہے۔"

جیدا کا رویہ ناز کے لیے معمّہ بنا رہا۔ وہ رات کو جب آتا تو میز کی دراز سے ڈائری نکالتا۔ اسے اُلٹ پلٹ کرتا، کچھ لکھتا پھر کچھ اور کرتا۔ ناز کو معلوم تھا کہ جیدا جیب کترا ہے، ڈاکو ہے، خونی ہے مگر اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ اسی مکان کے ایک حصّے میں جیدا نوعمر لڑکوں کو چوری، اٹھائی گیری اور جیب تراشی کے داؤ پیچ سکھایا کرتا ہے۔

وہ جانتی تھی کہ جیدا اخلاقی قدروں اور قانون سے آزاد انسان ہے لیکن یہ احساس اُس کے دل میں پختہ ہوتا چلا گیا کہ اُس کی ذات کے لیے جیدا کے دل میں ہمدردی ضرور ہے۔ جیدا پُراسرار آدمی تھا لیکن اس میں وہ ایک کشش محسوس کرتی تھی۔ یہ کشش بھی اُس کے لیے پُراسرار تھی۔

اس عرصے میں ناز کے گرد و پیش میں کوئی نمایاں تبدیلی رُونما نہ ہُوئی مگر وہ اپنے آپ میں ایسی تبدیلی محسوس کرنے لگی جسے وہ پسند بھی کرتی تھی، ناپسند بھی، جس میں لذت بھی تھی تلخی بھی۔ قرار بھی تھا کرب بھی۔ وہ ہمّت کرتی تو وہ کسی بھی وقت کھڑکی کھول کر اس کمرے سے بھاگ سکتی تھی۔ اس کے دل میں دو ایک بار ایسا خیال آیا لیکن اُس نے ایسی ہمّت کبھی نہ کی۔ جب بھی اس کے دماغ میں یہ خیال آیا اس کی اپنی ہی متفنّیہ ہستی سے آواز آئی — "اسے نہ کھولنا ناز!" — اور وہ چونک کر پیچھے ہٹ گئی اور یوں کمرے میں ہر سُو دیکھنے لگی جیسے یہ ہنسنے کی آواز ہو۔

بند کمرے کی تنہائی نے اُسے کیا کیا یاد نہ دلایا۔ کیسی کیسی بھولی بسری کہانیاں نہ سنائیں۔ جیدا کے ہاتھ آنے سے پہلے کی کہانیاں، اس سے پہلے کی باتیں، اس سے بھی پہلے کی داستانیں۔ وہ بے فکر سا بچپن۔ وہ معصوم سا لڑکپن۔ وہ جوانی کی قیامت خیزیاں، بھائیوں کی گمراہی، چاہنے والوں کے تحفے، کچی عمر میں ہی پختہ عشق بازیاں، خود فریبیاں، فیشن، تصنّع اور اسے سب کچھ یاد آیا۔

ایک وہ لمحہ کہ اُس کے بھائیوں نے اُسے برقعے سے نکالا تھا اور ایک یہ لمحہ کہ وہ ایک غنڈے کے کمرے میں بیٹھی طوائف بننے کا انتظار کر رہی تھی۔ ان دو لمحات میں تھوڑا سا عرصہ حائل تھا لیکن یوں جیسے افق پر دو دھبّے ایک اس کنارے ایک اُس کنارے، ایک مشرق میں ایک مغرب میں — مشرق و مغرب کی کشمکش نے اسے کہاں لا پھینکا۔

اُسے اسلم بھی یاد آیا لیکن سر جھٹک کر اُس کی یاد کو اُگل دیا۔ اُس نے جب بھی گھر کی سوچی تو جھینپ گئی۔ رسوائی نے اُسے قید ہی رہنے پر مجبُور کیا اور اس احساس نے اسے سو سو آنسو رلایا کہ اب وہ آزاد بھی ہو گئی تو دنیا کا سامنا نہ کر سکے گی، وہ گھر سے بھاگی ہُوئی ہے، سب جانتے ہیں، سوسائٹی میں اب اس کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی۔ اب اس کے لیے ایک ہی جگہ ہے — اور ناز اس جگہ بیٹھی ہُوئی تھی۔

بعض اوقات اُس کی ذہنی کیفیت پناہ گزین کی سی ہو جاتی تھی۔ ایسے میں جیدا کا خیال اُسے پناہ میں لے لیا کرتا لیکن یہ پناہ بھی تو غیر یقینی تھی۔

جیدا ایمپریس مارکیٹ میں چلا جا رہا تھا۔ قدموں میں بلا کی تیزی تھی۔ فٹ پاتھ پر لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا جا رہا تھا۔ چہرے پر انوکھی سی پرچھائیاں، پیشانی پر حقارت و نفرت کی شکنیں، خدوخال میں بربریّت اور تشدّد، آنکھوں میں انسان دشمنی کا چمکتا ہُوا تاثر جو سینے میں جلتی ہُوئی آگ کا پتہ دیتا تھا۔ پاؤں میں چکر۔ ہاتھوں میں بے چینی، ہونٹوں پر پُراسرار سا تبسّم — یہ اُس کا اصلی روپ تھا لیکن آج وہ بپھرا ہُوا تھا۔

تین چار مہینے گزرے اُسے اطلاع ملی تھی کہ کراچی کی ایک نئی کالونی کے ایک عظیم الشان بنگلے میں بیس ہزار کی مالیت کا ہار ہے اور ایک نوجوان لڑکی بھی ہے۔ شمّی نے ایک بیش قیمت ہار کی فرمائش کی تھی اس کے علاوہ پنجاب کے ایک استاد بردہ فروش نے اُسے اس لڑکی کے لیے کہا تھا اور پندرہ ہزار پر سودا طے ہو گیا تھا۔

ہار چوری کیا جا سکتا تھا لیکن لڑکی کو بلیک میلروں اور نوسربازوں کے ذریعے نکالنا آسان نہ تھا کیونکہ بنگلے والے اونچی سوسائٹی کے لوگ تھے جن کا اٹھنا بیٹھنا امیروں وزیروں میں تھا۔ لڑکی کے ساتھ میل جول پیدا کرنا ناممکن تھا۔ جیدا نے ہار کے ساتھ لڑکی کو بھی اٹھا لینے کا ارادہ کر لیا تھا۔

یہ بنگلہ عام چوری، نقب یا ڈاکے کے لیے موزوں نہیں تھا۔ وہاں کسی گھر بھیدی کی ضرورت تھی۔ جیدا نے ایک آدمی کو جس کا نام اِبّن تھا، اس بنگلے میں ملازم کرا دیا تھا اور اسے تمام ہدایات دے دی تھیں۔ اُس کا پروگرام تھا کہ اِبّن لڑکی اور ہار کا پتہ اور موزوں وقت بتلائے گا اور چوری یا ڈکیتی کے متعلّق زمین ہموار کرے گا۔ اِبّن وہاں تین مہینے ملازم رہا تھا اور کوئی بیس روز ہُوئے اُس نے اطلاع دی تھی کہ ہار کہاں پڑا رہتا ہے اور لڑکی کون سے کمرے میں سوتی ہے۔ اِبّن نے واردات سے متعلّق تمام تفصیلیں بتائی تھیں۔ اندر جانے اور بھاگنے کے راستے بھی بتا دیئے تھے۔ جیدا خود تو نہ جا سکا تھا، اُس نے اپنے تین آدمی ایک ٹیکسی میں اس کام کے لیے بھیج دیئے تھے۔

جیدا کے آدمی آدھی رات کو ہار والے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ اُنہوں نے سیف کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ پردوں کے پیچھے سے چار پولیس کانسٹیبل، ایک سب انسپکٹر پولیس اور بنگلے کا مالک نکل آیا تھا اور تینوں آدمی گرفتار ہو گئے تھے۔ اِبّن کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ جیدا ذرّہ بھر حیران یا پریشان نہیں ہُوا تھا جرم و جیل ہی تو اُس کی زندگی تھی۔ اسے کسی قسم کا غم نہ تھا لیکن تین روز بعد جیدا کو معلوم ہُوا کہ اِبّن وعدہ معاف گواہ بن گیا ہے تو وہ آگ بگولا ہو گیا تھا۔

جیدا قانون سے کھیلنا خوب جانتا تھا۔ صفائی کے جھُوٹے گواہوں کا ایک گروہ اس کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا جو استغاثہ کی کمر توڑ دیا کرتا تھا۔ سرکاری وکیل اور استغاثہ کے اہم گواہوں کے لیے اُس کے پاس دولت تھی۔ بالی اور گُلّی بھی تھیں، شمّی اور گلنار بھی تھیں۔ استغاثہ کے گواہوں کو منحرف کرنا اس کے لیے مشکل نہ تھا لیکن وعدہ معاف گواہ کی صورت میں جو پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے وہ اس سے بھی آگاہ تھا۔ اِبّن کا استغاثہ کے ساتھ مل جانا اس کی برداشت سے باہر تھا۔ پولیس نے اِبّن کو ضمانت پر رہا کر دیا تھا اور باقی آدمیوں کی ضمانت نامنظور ہو چکی تھی۔

جیدا متعلّقہ پولیس انسپکٹر سے ملا اور اُسے کیس کو گول کرنے کو کہا۔ انسپکٹر نے اُسے بتلایا تھا — "تم جانتے ہو وہ بنگلہ کس کا ہے؟ بعض وزیر اس کے زرخرید ہیں۔ وہ بین الاقوامی سمگلر ہے۔ وہ خود موقعہ پر موجود تھا۔ یہ محض اسی وجہ سے ہے کہ واردات کی تفتیش سی۔ آئی۔ اے کر رہی ہے۔"

"مُخبری کس نے کی تھی" — جیدا نے پوچھا تھا۔

"یہ نہیں بتا سکوں گا" — انسپکٹر نے ملتجی لہجے میں جواب دیا تھا — "میں بہت مجبور ہوں جیدا! میں نے تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کیا لیکن اِس معاملے میں کچھ نہ پوچھو۔ صرف اتنا بتا دوں گا کہ مخبری کی گئی تھی۔"

جیدا کے آدمی ڈیڑھ دو برس کے لیے جیل چلے بھی جاتے تو کوئی بات نہیں تھی لیکن اس نے دھوکے میں آ کر کبھی مات نہیں کھائی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے دشمن پیٹھ پیچھے اُس پر ہنس رہے ہیں۔ وہ جل بھُن رہا تھا۔ اُس کے سامنے اب ایک ہی راستہ تھا کہ مخبر کا سراغ لگائے اور اُسے اپنے قانون کے تحت سزا دے اور وعدہ معاف گواہ کو بھی صاف کر دے۔ مخبری کا شک اِبّن کے سوا اور کس پہ ہو سکتا تھا۔ اُس کا سلطانی گواہ بن جانا اس کے خلاف کھلا ثبوت تھا۔

چنانچہ آج کئی دنوں سے پولیس اپنے وعدہ معاف گواہ کو تلاش کر رہی تھی۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں چلا گیا ہے۔ پولیس اُس کے گھر کا کونہ کونہ تلاش کر آئی تھی۔ وہاں سی۔آئی۔ڈی بٹھا دی گئی تھی لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ پولیس نے اِبّن کی بیوی اور نوجوان بیٹی کو پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔

آج دن کے پچھلے پہر جیدا تھانے سے واپس آ رہا تھا۔ متعلقہ انسپکٹر نے اُسے بلایا تھا۔ وہ وہاں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن انسپکٹر نے منّتیں کی تھیں۔

"جیدا! ہیڈ کوارٹر والے میری نوکری کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں" — انسپکٹر نے اُسے التجا کے لہجے میں کہا تھا — "خُدا کے واسطے اِبّن کو چھوڑ دو اور اسے کورٹ میں حاضر ہونے دو۔ ہم اپنی اس غلطی پر پچھتا رہے ہیں کہ وعدہ معاف گواہ کو ضمانت پر رہا ہونے کا موقعہ دے دیا۔ اُسے جوڈیشل حوالات میں رکھنا چاہیے تھا۔"

انسپکٹر کو یقین تھا کہ جیدا کے سوا اِبّن کو کوئی غائب نہیں کر سکتا۔

"اِبّن میرے پاس نہیں ہے" — جیدا نے جواب دیا تھا۔

"جیدا!" — انسپکٹر نے درخواست کی تھی — "میں نے تمہارے بہت کام کیے ہیں۔ ایک کام میرا بھی کر دو۔ اِبّن واپس لا دو، وہ سرکاری گواہ ہے ورنہ میرا جو انجام ہوگا اس سے تم ناواقف نہیں۔"

"تم نے میرا کوئی ایک بھی کام مفت کیا ہے تو بتا دو، پوری اُجرت دوں گا۔ اِبّن میرے پاس نہیں ہے" — جیدا نے کہا تھا — "اگر یہ کیس گول کر دو تو پورے پانچ سو روپے دوں گا۔ اگر زیادہ مانگتے ہو تو گلی کو ایک رات کے لیے لے جاؤ۔ اگر یہ بھی منظور نہیں تو مجھے گرفتار کر لو لیکن یہ یاد کر لینا کہ میں نے تمہارے کیسے کیسے کام کیے ہیں۔ تمہاری نوکری میرے ہاتھ میں ہے۔"

انسپکٹر نے جیدا کو گہری نظروں سے دیکھا اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

اور جب جیب کترے نے گھورا تو پولیس انسپکٹر کی نظریں جھک گئیں۔

جیدا ابھی تھانے سے آ رہا تھا۔ پولیس سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ انہوں نے اِبّن کو سُلطانی گواہ تو بنا لیا تھا لیکن اس کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں کیا تھا اور جیدا سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ اس نے اِبّن کو گھر بھیدی بنا کر بنگلے میں نوکر کرایا تھا، وہاں اس کا کوئی اپنا آدمی ہونا چاہیے تھا۔ اُسے اس غلطی اور شکست کے احساس کے علاوہ یہ خیال بھی ستا رہا تھا کہ بیس ہزار کا ہار اور پندرہ ہزار کی لڑکی ہاتھ سے نکل گئی۔ اُسے یہ بات بھی جلائے جا رہی تھی کہ پنجاب کا بردہ فروش کیا کہے گا کہ کراچی کے اُستاد اس قدر اناڑی ہیں؟ جیدا کا سر پنجاب والوں کے سامنے نیچا ہو رہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی اسے ناز پر بھی غصہ آنے لگا کہ اتنے عرصے سے سفید ہاتھی بنی بیٹھی ہے اور راہ پر نہیں آ رہی۔

جیدا بہت تیز چلا جا رہا تھا۔ کان میں پھنسا ہوا آدھا سگریٹ اُڑسا ہوا تھا۔ فٹ پاتھ پر ایک کانسٹیبل ڈیوٹی پر کھڑا سگریٹ سُلگا رہا تھا۔ جیدا نے اپنے کان میں سے سگریٹ نکالا اور کانسٹیبل کے پاس رک کر اُس کے سگریٹ سے اپنا سگریٹ سلگا کر واپس کر دیا اور آگے چل پڑا۔ کانسٹیبل نے دیکھا، اس کے ہاتھ میں مڑا تڑا آدھا سگریٹ تھا۔ اس کا پورا سگریٹ جیدا لے گیا تھا۔ کانسٹیبل نے دور جاتے ہوئے جیدا کو دیکھا اور کھسیانی سی ہنسی ہنس پڑا۔

جب وہ برنس روڈ کے چوک میں سے گزر رہا تھا تو اُس نے ایک دوکان کے سامنے ایک آدمی کو بٹوے میں نوٹ ڈالتے دیکھا۔ جیدا ذرا آگے جا کر رک گیا۔ اس آدمی نے بٹوہ کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈالا اور بس کے انتظار میں جا کھڑا ہُوا۔ جیدا آہستہ آہستہ اس کے قریب جا رکا۔

بسوں کی قطاریں چلی آ رہی تھیں اور مسافروں کو نگلتی جا رہی تھیں۔ وہ آدمی کھڑا تھا اور جیدا اسے کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ آخر اُس کے نمبر کی بس آ گئی۔ وہ تیار ہُوا تو جیدا بھی تیار ہو گیا۔ بس رکی تو اُترنے اور چڑھنے والوں میں سب سے پہلے اترنے اور سب سے پہلے چڑھنے کی جنگ شروع ہو گئی۔ بس کے تنگ دروازے میں ایک ہجوم پھنسا ہُوا زور آزمائی کر رہا تھا۔ یہی ہجوم بازی اور دھکم پیل ہی تو جیب کتروں کو دعوتِ عمل دیا کرتی ہے۔

بٹوے والے کو یہ تو معلوم تھا کہ کراچی میں کسی بھی وقت جیب صاف ہو سکتی ہے۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اُس کی جیب میں نوٹوں سے بھرا ہُوا بٹوہ پڑا ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اُس کے آگے کراچی کا ماہر گرہ کٹ اُس کے سینے سے پیٹھ لگائے بس کے پائیدان پر کھڑا ہے۔

جیدا اس آدمی سے آگے آگے بس پر چڑھ گیا اور جب یہ آدمی دھکے دے کر اور دھکے کھا کر بس میں پھنستا ہُوا داخل ہُوا تو جیدا نے گھوم کر ایک بازو کی کہنی اٹھائی اور دوسرے ہاتھ کی دو انگلیوں نے ذرا سی حرکت کی اور جیدا بس سے باہر، اُس کا شکار بس کے اندر اور بٹوہ جیدا کی جیب میں تھا۔

مُنّا، ٹیپو اور بادل اپنے کمرے میں تھے۔ مُنّا فرش پر بچھے ہُوئے بستر پر لیٹا ہُوا تھا۔ ٹیپو سامنے دیوار کا سہارا لیے بیٹھا تھا اور بادل دروازے کے سامنے بیٹھا سگریٹ کے تمباکو میں چرس ملا رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہُوئی۔ منّا اور ٹیپو بجلی کی تیزی سے اپنی اپنی جگہ سے اٹھے اور چاقو نکال کر کھڑے ہو گئے۔ ایک دروازے کے ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف۔

بادل بدستور تمباکو میں چرس ملاتا رہا جیسے اسے گرد و پیش کا خیال ہی نہ تھا۔ منّے نے ہاتھ بڑھا کر زنجیر کھول دی اور دونوں آنے والے پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ جیدا اندر داخل ہُوا تو دونوں پیچھے ہٹ کر سمٹ گئے۔

جیدا بادل کے پاس جا کر بیٹھا۔ وہ تھکا تھکا اور غصے سے بھرا ہُوا تھا۔ اُس نے بٹوہ نکال کر ٹیپو کی طرف پھینکا۔ ٹیپو نے جلدی سے بٹوہ کھول کر نوٹ گنے، پھر ریزگاری گنی.... چار سو پچاس روپے دس آنے۔

"کاٹا ہے؟" — بادل نے پوچھا۔

جیدا نے دو انگلیوں کی حرکت سے ساری بات واضح کر دی۔
"اور اس کا بھی کچھ سوچا استاد؟" ــــ ٹیپو نے نازو کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔
"دیکھا جائے گا" ــــ جیدا نے بے پروائی سے کہہ دیا۔
"میری مانو تو چلا دو استاد!" ــــ ٹیپو نے مشورہ دیا ــــ "پندرہ بیس ہزار سے کم میں کیا جائے گی۔"
"ہاں استاد!" ــــ بادل نے چرس بھرا سگریٹ سلگا کر جیدا کو دیا اور کہا ــــ "چھ سات مہینوں سے مفت کا کھا رہی ہے اور راہ پر نہیں آ رہی۔"
جیدا نے سگریٹ کا لمبا کش لیا جس کا دھواں نکلا اور دھواں کمرے کی بھیانک وحشت میں گھل گیا۔
"ٹھسّی ہے، گلی ہے، گلنار ہے۔۔۔!" منّا کہہ رہا تھا ــــ "بالی کو دیکھ لو، پانچ سات روز میں چل پڑی تھیں۔"
"دیکھو استاد" ــــ ٹیپو نے کہا ــــ "کوئی علاج کرو نہیں تو چلتا کرو۔"
جیدا نے سگریٹ کا ایک اور کش لیا، دھواں اگل کر اٹھا اور نازو کے کمرے کا دروازہ کھولا۔
نازو میز پر کہنیاں ٹیکے سر ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی۔ اس قید اور کمرے سے سمجھوتہ کر لینے کے باوجود اس کا مستقبل کھل کر اس کے سامنے نہیں آ رہا تھا۔ اس پر ایک بار پھر ڈوبنے کی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ اسی کمرے کو اس نے پناہ گاہ بنا لیا تھا۔ یہاں اس کی حکمرانی بھی قائم ہو گئی تھی لیکن چند دنوں سے یہی کمرہ اس کا دشمن بنتا جا رہا تھا۔ اس کمرے میں اب بھی اسے کوئی جسمانی اذیت نہیں دی گئی تھی۔۔۔۔ اسے مرغن کھانے کھلائے گئے اور وہ ریشمی کپڑے پہنائے گئے جن کے وہ اسلم کے پہلو میں بیٹھ کر خواب دیکھا کرتی تھی لیکن منّا، ٹیپو اور بادل اسے صبح و شام ہیسوا بن جانے پر اکسانے لگے تھے۔ ان کا لب و لہجہ ایک بار پھر تلخ ہو گیا تھا۔
اب تو اس کمرے کی دیواریں بھی اسے کہنے لگیں تھیں ــــ "نازو! بیچ دو اس جسم کو۔ اب یہ مہذب دنیا کے قابل نہیں رہا۔ یہ حسن اب کسی ایک گھر کی زینت نہ بن سکے گا۔"
نازو نے بسا اوقات ان آوازوں کا چیلنج قبول بھی کر لیا تھا اور اکثر ان آوازوں سے بھاگ اٹھتی تھی لیکن راہ فرار کوئی نہ تھی۔ اب تو اس کی مزاجی کیفیت بگڑنے لگی تھی۔ چند دنوں سے نیند اور بھوک بھی کم ہو گئی تھی اور مزاج میں تلخی سی آ گئی تھی۔
"نازو" ــــ جیدا نے اسے چونکا دیا۔
وہ تیزی سے اٹھی اور جیدا کی طرف بڑھ کر دو تین قدم دور رک گئی۔ روندھی ہوئی آواز میں بولی ــــ "خدا کے لیے مجھے بتا دو میرا کیا بنے گا۔ کیا میں اسی طرح قید ہی رہوں گی؟"
"فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے نازو!" ــــ جیدا نے بے پروائی سے کہا۔
"تم مجھے مار ہی کیوں نہیں دیتے؟ اوہ یہ قید۔۔۔" اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا پھر ہاتھ ہٹا کر بولی ــــ "مجھے قتل کر دو جیدا! مجھے مار دو!"
جیدا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور نازو بجھ سی گئی۔
"بیٹھ جاؤ" ــــ جیدا نے چارپائی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
نازو کی تلخی کم ہونے لگی۔ مزاجی کیفیت کا ارتعاش تھمنے لگا اور وہ چارپائی پر جا بیٹھی۔ اس نے جیدا کی

طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورتے تھا۔ نازو کے جسم نے جھرجھری لی اور اس کی آنکھیں جھک گئیں۔
"میں نے تمہیں اغوا نہیں کیا، خریدا ہے" ــــ جیدا نے تحمل سے کہا ــــ "میں نے کاروبار میں پانچ سو روپے لگائے ہیں۔ میں ہر رات پانچ سو روپے کمانا چاہتا ہوں۔"
"تم میرے جسم سے ایک پیسہ بھی نہ کما سکو گے" ــــ نازو نے روندھے ہوئے غصے سے کہا ــــ "مجھے آزاد کر دو میں تمہیں پانچ سو روپے لا دوں گی۔"
جیدا زیر لب مسکرایا۔
"تم آزاد ہونا چاہتی ہو نازو؟" ــــ جیدا نے آہستہ سے پوچھا ــــ "کہاں جاؤ گی آزاد ہو کے؟"
"اپنے گھر اور کہاں!"
"اس گھر کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ تم اس گھر کے لیے اچھوت بن چکی ہو" ــــ جیدا نے کچھ ایسے انداز سے کہا کہ نازو اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگی۔ جیدا کے لہجے میں غصہ نہیں تھا، طنز نہیں تھی، ہمدردی بھی نہیں تھی۔ تلخ سا تاثر تھا جو نازو کے وجود میں سرایت کرنے لگا۔ جیدا کہہ رہا تھا ــــ "تمہاری دنیا میں سبھی جانتے ہیں کہ تمہیں اغوا نہیں کیا گیا تھا۔ تم گھر سے چوری کر کے چوری چھپے ایک آدمی کے ساتھ بھاگ آئی تھیں۔ کیا تم اس دنیا کا سامنا کر سکو گی؟" ــــ جیدا نے پھر پوچھا ــــ "کر سکو گی سامنا ان لوگوں کا جو تمہارے نام پر تھوک چکے ہیں؟ ہے کوئی جو تمہیں اب بیوی بنا لے گا؟"
نازو اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
جیدا کھڑکی کی طرف بڑھا اور کھڑکی کے دونوں کواڑ کھول دیئے۔
"اگر آزاد ہونا چاہتی ہو تو جاؤ نازو!۔۔۔ بھاگ جاؤ۔"
نازو کے چہرے کا تاثر بدلنے لگا جیسے اعصابی تناؤ کم ہونے لگا ہو لیکن اس کا دماغ ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ وہ کچھ سوچنے سمجھنے سے قاصر تھی۔
"اٹھو نازو!" ــــ جیدا پھر بولا ــــ "میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔"
کمرے میں سکوت چھا گیا جس میں ٹائم پیس کی ٹک ٹک ہلکا ہلکا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ جیدا کی تحکمانہ آواز نے سکوت کو ہلا دیا ــــ "جاؤ نکل جاؤ اس گھر سے۔۔۔ تم آزاد ہو۔"
نازو اٹھی اور جیدا کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ اسے دبوچ لے گا۔ وہ کھڑکی کے سامنے جا رکی۔ ایک نظر جیدا کو دیکھا پھر باہر دیکھنے لگی۔ سامنے دو دو تین تین منزلہ فلیٹ تھے۔ بالکنیوں میں اور کھڑکیوں میں آباد گھرانوں کی چہل پہل تھی۔ سڑک پر بسوں، ٹراموں، رکشاؤں اور کاروں کا ہجوم بھاگا جا رہا تھا۔ سڑک کے دونوں فٹ پاتھوں پر انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا انبوہ رواں دواں تھا۔ ہر سو آزاد زندگی کی ہماہمی اور ہنگامہ تھا، مگر یہ ہنگامہ نازو کو سمندر کی طوفانی لہروں کی صورت میں دکھائی دیا۔
وہ یوں جھینپ گئی جیسے ہجوم اس پر انگلیاں اٹھا اٹھا کر چلا رہا ہو ــــ "وہ دیکھو آوارہ لڑکی۔۔۔۔ ایکٹرس۔۔۔۔ بدکار۔۔۔ گھر سے چوری کر کے بھاگ آئی ہے۔"
نازو کی اندرونی دنیا میں زلزلے بپا ہونے لگے۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپی اور اس پر ڈوبنے اور ڈوب ڈوب کر ابھرنے کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اسے چکر سے آنے لگے اور پیشانی پسینے سے

بھیگ گئی۔

"جاؤ ناز!" — جیدا بولا اور نوٹوں کی ایک گٹھی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا — "یہ لو تمہیں سفر خرچ کی ضرورت ہوگی۔"

ناز نے ان نوٹوں کو دیکھا لیکن ان کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا — وہ تو دوراہے پر کھڑی تھی یا جیسے گرداب کی لپیٹ میں آگئی ہو۔ اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اس نے کھڑکی کے دونوں کواڑ بند کر دیئے اور ایک ہاتھ پیشانی پر رکھا۔ لڑکھڑائی اور جیدا کے سامنے دوزانو گر پڑی۔

"نہیں ... نہیں!" — اُس کی آواز تھرتھرا رہی تھی اور جسم کانپ رہا تھا۔ اُس نے جیدا کے ہاتھ تھام لیے۔ بولی — "یہاں سے چلی بھی جاؤں تو کہاں جاؤں گی!"

جیدا خاموشی سے سن رہا تھا۔

ناز ذرا سنبھل کے بولی — "جن خوابوں میں ڈوب کر میں اسلم کے ساتھ بھاگی تھی وہ خواب ڈوب گئے ہیں .... اسلم مر گیا ہے .... وہ دنیا ہی مر گئی ہے۔ مجھے یہیں پڑا رہنے دو جیدا!" — اُس نے جیدا کے ہاتھوں کو اور زیادہ مضبوطی سے پکڑ لیا اور چہرہ اس کے دامن کے ساتھ لگا کر بولی — "تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں اب اس دنیا کا سامنا نہ کر سکوں گی۔ وہ انسان اب ...."

"چلی جاؤ ناز!" — جیدا نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

ناز اُس کے ساتھ ڈرے ہوئے بچے کی طرح چپک گئی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ ہونٹ لرز رہے تھے اس نے بند کھڑکی کی طرف یوں گھبرا کے دیکھا جیسے انسانوں کا ہجوم کھڑکی کی راہ اندر آجائے گا اور اسے سڑکوں پر گھسیٹنے کے لیے اٹھا لے جائے گا۔ ناز کے سامنے اس کا ضمیر ننگا ناچ رہا تھا، وہ سہارا ڈھونڈ رہی تھی۔

اب جیدا ہی اُس کا سہارا تھا۔

"جیدا" — وہ ملتجی انداز میں بولی — "سینے میں ایک بات دبا رکھی تھی۔ کہو تو کہہ دوں سینہ جل رہا ہے۔"

جیدا کرسی پر بیٹھ گیا اور ناز اس کے سامنے فرش پر بیٹھی اس کے زانو پہ ہاتھ رکھ کر بولی — "میں نے کہا تھا مجھے آزاد کر دو۔ تم نہ مانے۔ اب تم کہتے ہو جاؤ تم آزاد ہو تو میں جانا نہیں چاہتی۔ مجھے آزاد دنیا سے خوف آنے لگا ہے۔ وہاں اب میرے لیے لعن طعن کے سوا کچھ بھی نہیں کبھی لگتا ہے جیسے تم نے میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں۔ بھاگنا چاہتی ہوں تو انجانی سی قوت مجھے یہی رہنے پر مجبور کرتی ہے۔" اس نے جیدا کی طرف تشنہ سی نگاہوں سے دیکھا اور کہا — "بہت روز سے محسوس کر رہی ہوں جیسے تم نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ میں نے خودکشی کے بھی ارادے باندھے لیکن ہر بار تمہارے ہی خیال نے مجھے موت کے منہ سے نکال لیا۔ شاید تم ہی میرے اور موت کے درمیان حائل رہے ہو۔"

وہ خاموش ہوگئی۔ جیدا اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور اس کے ایک ایک لفظ کو پوری توجہ سے سن رہا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثر میں ذرّہ بھر تبدیلی نہ آئی نہ ہی اس کی اندرونی کیفیت بدل سکی۔ ناز کے چہرے پر دکھ، غم اور کرب کے تاثرات تھے اور آنکھوں کی بے چینی اس کی بے بسی کی مظہر تھی۔

"میں نے بہت سوچا جیدا! بہت سوچا" — ناز نے بے چارگی سے کہا۔ "میں نے تمہاری زنجیروں کو توڑ دینا چاہا لیکن یہ میرے گرد لپٹتی ہی گئیں۔ ہزار چاہا مگر تمہیں دل سے دور نہ کر سکی" — اس نے دو چار ثانیے

جیدا کے بے تاثر چہرے کو دیکھا۔ وہ خاموشی سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ناز نے اس کے سکوت کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی — "کاش! تمہارے سینے میں انسان کا دل ہوتا اور تم میری کیفیت سمجھ لیتے۔ مجھے تم سے نفرت ہونی چاہیئے تھی لیکن دل نہ مانا۔ تم مجھے اچھے لگنے لگے۔"

"ناز!" جیدا نے اطمینان سے کہا — "میں بہت پرانا کھلاڑی ہوں۔"

"میری سن لو جیدا!" — ناز نے اسے ٹوک دیا اور کہا — "میں تمہیں فریب نہیں دے رہی، بے بس عورت ہوں، تمہارے ہاتھ میں کھلونا، جی میں آئے توڑ دو" — وہ گہری سانس لے کر بولی — "ایک وہ دنیا ہے جو کھڑکی کے اُس طرف آباد ہے۔ اُس کے تصنّع، فریب اور ظاہرداری نے مجھے گھر سے بے گھر کر کے اس حالت کو پہنچایا اور ایک یہ دنیا ہے جو میری زندہ لاش کی قبر ہے لیکن اس کے گناہ آلود اندھیروں نے مجھے حقیقت سے روشناس کیا ہے۔ آج چھ سات ماہ بعد جب تم نے مجھے آزاد ہو جانے کو کہا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ کمرہ میری پناہ گاہ ہے اور تم میرے پاسبان ہو۔ خدا جانے یہ خیال کہاں سے آیا ہے .... میں نے تم میں اور اسلم میں جو فرق دیکھا ہے مجھے اس فرق سے پیار ہو گیا ہے۔"

جیدا کے ہونٹوں پر جو تبسم تھا وہ طنزیہ مسکراہٹ بن گیا۔

"اسلم نے مجھے کہا تھا — 'ناز! میں تم پر مرتا ہوں۔' اُس نے جھوٹ بولا تھا، اور تم کہتے ہو — 'ناز! میں تمہیں طوائف بناؤں گا' — تم جھوٹ نہیں کہتے — اُس نے کہا تھا — 'ناز! کراچی چلو میں تمہیں محلوں کی رانی بناؤں گا' — وہ فریب تھا، اس کے دل میں کچھ اور تھا اور تم کہتے ہو — 'ناز! میں تمہارے جسم سے دولت کماؤں گا'، تو یہ فریب نہیں۔ تمہارے دل میں یہی کچھ ہے۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور تم نے وعدہ پورا کیا۔"

ناز نے سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے کہا — "وہاں صرف اسلم نہیں تھا میرے خریدار اور بھی تھے۔ میرے بھائی نے سوسائٹی میں میرا تعارف کرایا تھا اور دولت مندوں سے کرایا تھا۔ یہ حقیقت مجھ پر اب روشن ہوئی ہے کہ نہ انہیں مجھ سے محبت تھی نہ مجھے اُن سے۔ انہیں میرے جسم کی ضرورت تھی، تھوڑی سی دیر کے لیے اور مجھے ان کی دولت کی ضرورت تھی، ہمیشہ کے لیے۔ دونوں طرف دھوکہ تھا۔"

ناز کے آنسو جاری تھے اور وہ یوں بولے جا رہی تھی جیسے سینے کا غبار اُگل رہی ہو اور غبار کا دھواں آنکھوں کو لگ رہا ہو۔

"جیدا" — اُس نے کہا — "میرے بھائیوں کی دولت پرستی اور کمینگی نے مجھے گمراہ کیا۔ مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میں جہاں سے بھاگ کے آئی ہوں اب وہاں نہ جا سکوں گی۔ مجھے اب اسی قید سے اُنس ہو گیا ہے۔"

"مطلب یہ ہے" — جیدا نے زیرِ لب مسکرا کر کہا — "تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ مجھے محبت کے نام سے نفرت ہے۔"

"جیدا! ذرا سی دیر کے لیے انسان کے روپ میں آؤ" — ناز نے اُس کے زانو کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا — "میں نے اپنے آپ کو جھوٹی محبت پر قربان کیا ہے اور تم سچی محبت سے بھاگ رہے ہو۔"

"مجھے قربان کرنا چاہتی ہو؟"

"نہیں جیدا! صرف اتنی سی التجا ہے" — ناز نے اس کی ٹھوڑی کو چھو کر منت کے لہجے میں کہا —

"مجھے اسی کمرے میں یوں ہی اپنے قدموں میں پڑا رہنے دو۔ تمام عمر اسی حال میں گزار دوں گی میری محبت کو ٹھوکر مار دو لیکن مجھے اپنی خاموش پوجا کر لینے دو۔ اور ایک التجا یہ بھی ہے کہ مجھے بسواتی کی زندگی سے بچائے رکھو میں تمہارے لیے، صرف تمہاری خاطر اسی کمرے میں قید رہوں گی۔"

جیدا یوں چونک کر اُٹھ کھڑا ہُوا جیسے ناز نے اسے نشتر چبھو دیا ہو۔ وہ کمرے میں ٹہلنے لگا اور سوچ میں الجھ گیا۔

ناز نے کہا۔ "میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتی ہوں کہ..."

"خدا کو بیچ میں مت لاؤ" — جیدا نے اس کی بات کاٹتے ہُوئے کہا — "ایسے معاملوں میں خدا کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ تمہارے دل میں نہ میری محبت ہے نہ کسی کی نفرت۔ تمہارے سامنے تمہارے اپنے گناہ اور تمہارے بھائیوں کے گناہ ناچ رہے ہیں۔ تم ان سے پناہ ڈھونڈ رہی ہو۔"

جیدا پر کسی قسم کا کوئی اثر معلوم نہ ہوتا تھا۔ کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔ ناز کی اکھڑی اکھڑی سانسیں اس سکوت میں تحلیل ہو رہی تھیں۔ جیدا اس سکوت سے کہیں زیادہ ساکن اور جامد تھا۔

"ہار گئی ہوں، شکست کھا گئی ہوں" — ناز نے جھنجھلا کر کہا — "اور تمہارے قدموں میں گر پڑی ہوں۔"

"اور میں تمہاری شکست کو تسلیم کرتا ہُوں" — جیدا نے یوں کہا جیسے بیدار ہو گیا ہو۔ ذرا بلند آواز سے بولا — "دیکھو ناز! جو میرے سامنے گر پڑتا ہے میں اُسے بخش دیتا ہوں لیکن میں اسے رحم نہیں کہتا، اپنی فتح کہتا ہوں۔ تمہارے سر نے جھک کر میرے سر کو اونچا کر دیا ہے۔"

جیدا رک گیا پھر الفاظ تول تول کر بولا — "اچھی طرح سن لو۔ میں تم سے محبت نہیں کر سکوں گا۔ یہیں پڑی رہو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اُس نے جیب سے دس دس کے چند نوٹ نکال کر ناز کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا — "یہ روپے اپنے پاس رکھ لو۔ ایک چھوکرا موجود ہے۔ اسے کھانے پکانے پر لگا دو اور ہوٹل سے کھانا منگوانا چھوڑ دو لیکن یہ سن رکھو کہ تم اس قید سے آزاد نہ ہو سکو گی۔"

جیدا نے اپنی ایک کمزوری ناز کے سامنے رکھ دی جسے وہ خود بھی محسوس نہ کر سکا۔ اُس کا لاشعور اس کے دماغ پر غالب تھا۔ ناز کی شکست خوردگی نے جیدا کی شخصیت اور بنیادوں کو عریاں کر دیا۔ وہ ذہنی طور پر نارمل نہیں تھا۔ کوئی بھی عادی مجرم نارمل انسان نہیں ہوتا۔

ناز نے اُس کے ہاتھ سے روپے لیتے ہُوئے مسرّت بھرے لہجے میں کہا — "تمہارے اور اپنے لیے میں اپنے ہاتھ سے کھانا پکایا کروں گی۔"

"نہیں!" — جیدا نے فیصلتاً کہا۔

"جیدا!" — ناز کے آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے آگے بڑھ کر جیدا کا ہاتھ تھام کر چوم لیا اور کچھ نہ کہہ سکی۔

جیدا کو نہ ان باریک اور لال گلابی ہونٹوں کے لمس میں کوئی لطف آیا نہ ناز کی پیشانی پر لہراتے ریشمی بالوں نے اُس کی ذات میں ارتعاش پیدا کیا نہ اس قدر زہد شکن جسم اور حسین چہرے کو اپنی ملکیت میں پا کر اس کی رگوں میں حرارت پیدا ہُوئی۔

"ایک بات کہہ دوں ناز!" — جیدا نے کہا — "اپنے متعلق ذرا اچھی طرح سوچ لو۔ آخر کب تک اس

قید میں پڑی رہو گی۔ میں کب تک زندہ رہوں گا۔ میں ہر وقت پھانسی کے تختے پر کھڑا رہتا ہُوں۔ جانے کب لٹک جاؤں۔ جانے کب قتل ہو جاؤں۔ میں جرائم پیشہ ہُوں۔ میری دوستی اور میری دشمنی جرائم پیشہ لوگوں اور پولیس کے ساتھ ہے۔ میں کسی بھی وقت قتل ہو سکتا ہوں۔ پولیس کو ضرورت محسوس ہوتی تو مجھے گولی مار دی جائے گی اور تم اخبار میں یہ خبر پڑھ لو گی کہ بدنام غنڈہ جیدا پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے.... تم اپنی راہ بنانے کی فکر کرتی رہو۔ تمہیں روزی ملے گی تو میری ہی دنیا میں ملے گی۔ تم میری ہی دنیا میں نام پیدا کرو گی۔ مہذب سوسائٹی میں جسے بدنام کہتے ہیں، اُسے ہم لوگ نیک نام کہا کرتے ہیں۔ وہاں لوٹ کر جاؤ گی تو بدنام کہلاؤ گی.... سوچو۔ سنجیدگی سے غور کرو۔"

جیدا نے اپنا ہاتھ ناز کے ہاتھوں سے آہستہ سے نکالا اور کمرے سے نکل گیا۔

اُس نے دوسرے کمرے میں جا کر مُنّے، ٹیپو اور بادل سے کہا — "اب پہرہ دینے کی ضرورت نہیں" — پھر پوچھا — "لونڈے آ گئے ہیں؟"

"ہاں! وہ باہر بیٹھے ہیں" — بادل نے جواب دیا۔

صحن کے ایک کونے میں بارہ تیرہ برس کی عمر کے تین لڑکے بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ جیدا نے صحن میں آ کر انہیں بلایا۔ تینوں بھاگ کر اُس کے پاس آ گئے۔

"غور سے سنو" — جیدا نے تینوں لڑکوں سے کہا — "میری پتلون کی کسی جیب میں نقدی ہے۔ ایک طرف کھڑے ہو جاؤ۔ مجھے دیکھو اور بتاؤ نقدی کس جیب میں ہے۔"

وہ آگے چل پڑا اور چلتے چلتے پتلون کی دائیں جیب میں سے رومال نکال کر منہ صاف کیا اور رومال اسی جیب میں رکھ دیا۔ ذرا آگے جا کر واپس آیا اور اس نے ایک بار پھر جیب سے رومال نکالا، منہ پر پھیرا اور اسی جیب میں ڈال لیا۔

"تم بتاؤ" — اُس نے ایک لڑکے سے پوچھا۔

"دائیں جیب میں" — لڑکے نے ذرا ہچکچا کر جواب دیا۔

جیدا نے دوسرے لڑکوں سے پوچھا تو دونوں نے بائیں جیب بتائی۔

اُس نے پہلے لڑکے کو پاس بلا کر رعب دار آواز میں پوچھا — "تم نے دائیں جیب کیوں کہی تھی؟ میں نے اس قدر صاف اشارہ دیا تھا، پھر تم نے غلط جیب کیوں بتائی؟.... بھول گئے؟"

لڑکے کے چہرے پر خوف و ہراس چھا گیا۔ دیوار کے ساتھ بید کی چھڑی پڑی تھی۔ جیدا نے چھڑی اٹھا کر لڑکے کو دو تین ضربیں لگائیں۔ لڑکا بلبلا اٹھا۔

"تم نے بائیں جیب کس طرح بتلائی تھی؟" — جیدا نے دوسرے لڑکوں سے پوچھا۔

ایک لڑکا از بر کیا ہُوا سبق سنانے کے انداز میں بولا — "جس جیب سے منہ صاف کرنے والا رومال بار بار نکلتا ہے اس میں نقدی نہیں ہوتی۔ ریزگاری ہو سکتی ہے نوٹ نہیں ہوتے۔ تمہارا رومال دائیں جیب میں تھا اور نقدی ضرور بائیں جیب میں ہو گی۔"

"سمجھے؟" — جیدا نے پہلے لڑکے کو ایک تھپڑ مارتے ہُوئے کہا — "تمہارا باپ رومال والی جیب میں نوٹ رکھے گا؟ لوگ عقل والے ہوتے ہیں۔ رومال نکالتے وقت نوٹ گرنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ ہم ایسے

ہی عقلمندوں کی جیبیں صاف کیا کرتے ہیں جو ذرا ذرا سی بات کا خیال رکھتے ہیں۔"

"کون میری جیبوں میں سے نوٹ نکالے گا؟" — جیدا نے لڑکوں سے پوچھا۔

ایک لڑکے نے دوسرے دونوں کو ذرا دور لے جا کر کانوں کان کچھ سمجھایا اور انہیں چھوڑ کر خود جیدا کے پیچھے جا کھڑا ہُوا۔

"استاد!" — لڑکے نے جیدا سے کہا — "تم فٹ پیری پر جا رہے ہو۔ تم میری اسامی ہو۔ آگے چلو۔"

جیدا آگے چلا تو لڑکا اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ سامنے سے وہ دونوں لڑکے تیزی سے جیدا کی طرف آئے اور اس طرح اُس کے سامنے پہنچ گئے جیسے اتفاقاً جیدا سے ٹکرا گئے ہوں۔ ایک لڑکا گر پڑا۔ دوسرا نہایت قدرتی طریقے سے اس لڑکے کے اوپر گر پڑا۔ جیدا دونوں سے ٹھوکر کھا کر اس قدر آگے جھک گیا کہ اس کے ہاتھ زمین پر جا لگے۔ اس تصادم میں اداکاری یا بناوٹ کا ذرہ بھر شبہ نہیں ہوتا تھا۔ خود جیدا جیسے استاد نے اسے اتفاقیہ ٹکر سمجھ لیا تھا۔ اُسے غصہ بھی آ گیا۔

جیدا سنبھل رہا تھا کہ گرے ہوئے ایک لڑکے نے اس کی رانوں پر پتلون کی جیبوں سے ذرا پیچھے ہاتھ رکھ لیے اور گڑگڑانے لگا — "استاد! ٹھوکر لگ گئی تھی ناراض نہ ہونا۔"

اُس کے اوپر گرنے والے لڑکے نے بھی جیدا کو اسی طرح مصروف کر لیا اور جیدا کے پیچھے چلنے والا لڑکا اس کے قریب سے ہو کر گزر گیا۔

جب لڑکے اس سے الگ ہو گئے تو اس نے غصے سے پوچھا — "نوٹ کیوں نہیں نکالا ابھی تک؟"

"نوٹ یہ ہے استاد!" — لڑکے نے پانچ کا نوٹ دکھاتے ہوئے کہا — "یہ میرے ہاتھ میں۔"

جیدا نے اپنی بائیں جیب میں ہاتھ ڈالا۔ نوٹ غائب تھا۔ اس کے منہ سے بیساختہ نکلا — "شاباش!"

"ٹیپو" — جیدا ٹیپو سے مخاطب ہُوا — "کل انہیں تالے سمجھاتے تھے؟"

"ہاں کھول کر بتاتے تھے" — ٹیپو نے جواب دیا۔

"کیوں بے" — جیدا نے مار کھانے والے لڑکے سے پوچھا — "اینگل مارکہ تالے کی کتنی چوڑیاں ہوتی ہیں؟"

"چار چوڑیاں، ایک سلاخ کی چابی سے کھل جاتا ہے" — لڑکے نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔

"سیدھی سلاخ سے کون کون سے تالے کھلتے ہیں؟" — جیدا نے ان سے پوچھا۔

"یہ نہیں" — ٹیپو بول پڑا — "یہ ابھی نہیں بتایا۔"

"ہمارے پاس تیار چھوکرے کتنے ہیں؟" — جیدا نے پوچھا۔

"دس ہیں" — بادل نے جواب دیا۔

"یہ تین ملا کر تیرہ" — منّے نے تصحیح کی — "یہ بھی تیار ہی ہیں۔ صرف تالے سمجھانے باقی ہیں۔ جیبوں کا کام کر سکتے ہیں۔"

"چار لونڈے جیل میں ہیں" — ٹیپو نے بتایا۔

"دو کی تو ضمانت کرا لی تھی نا؟" — جیدا نے پوچھا۔

"ان کے علاوہ دو اور ہیں" — بادل نے کہا — "میں ان کی ملاقات کو جاتا رہتا ہوں اور بیڑی سگریٹ

صابن وغیرہ دے آتا ہوں۔"

"خیال رکھنا" — جیدا نے ہدایت دی — "انھیں کوئی تکلیف نہ ہو" — پھر وہ لڑکوں سے مخاطب ہُوا — "یہ لو اوئے!" — اُس نے وہی پانچ کا نوٹ جو لڑکوں نے اسے واپس دے دیا تھا ان کی طرف پھینکتے ہُوئے کہا — "جاؤ سینما دیکھو اور کھاؤ پیو۔"

لڑکے ہنستے کھیلتے باہر نکل گئے۔

جیدا ایک اور کمرے کی طرف بڑھا اور کہا — "اسے کھولو ذرا۔"

منّے نے آگے بڑھ کر ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ جیدا کمرے میں داخل ہُوا۔ یہ کمرہ ایسے وسیع غار کا منظر پیش کر رہا تھا جس میں مکڑیوں کی حکومت تھی اور جن کے جالوں میں جیسے بدروحیں الجھی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر چھت سے گرنے والے پانی کے گہرے مٹیالے نشان کمرے کی ہیبت میں اضافہ کر رہے تھے۔ کوئی کھڑکی نہیں تھی، ایک ہی روشندان تھا جسے جالوں نے بند کر رکھا تھا۔ چھت سے جالے اس طرح لٹک رہے تھے جیسے پرانے چیتھڑے لٹک رہے ہوں۔ فرش کچا اور ناہموار تھا۔ بعض جگہ شور بھی ابھرا ہُوا تھا اور نشیبی جگہوں میں کائی جم رہی تھی۔ تعفّن اور بدبو سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔

دروازے کی راہ سے جو روشنی اندر آ رہی تھی وہ جیسے جالوں میں اُلجھ کے بجھ گئی ہو۔ سامنے دیوار کے ساتھ ایک آدمی بیٹھا تھا۔ دونوں ہاتھ پیٹھ پیچھے بندھے ہُوئے تھے۔ بال بکھرے ہُوئے اور گرد آلود تھے۔ چہرہ یوں جیسے ملبے میں سے نکالی ہوئی لاش کا ہو۔ آنکھیں نیم وا اور کھوپڑی میں دور اندر کو دھنس گئی تھیں۔ پپوٹے سوجے ہُوئے، گال پچکے ہوئے منہ کھلا ہُوا اور ہونٹ بنجر زمین کی طرح خشک اور پھٹے پھٹے۔ وہ اس طرح بیٹھا تھا جیسے بیٹھا نہیں دھرا ہُوا ہو۔

جیدا اندر گیا تو لاش کی پلکیں لرزیں۔ پلکوں میں اتنی سکت نہ تھی کہ اٹھ سکیں۔ ہونٹ یوں ہل رہے تھے جیسے پانی مانگ رہے ہوں۔

"اِبّن!" — جیدا نے قریب جا کر اُسے بلایا۔

وہ ابّن تھا، وعدہ معاف گواہ۔ اس نے سر کو ہلکی سی جنبش دی تو سر دیوار کے ساتھ جا لگا۔ جیدا نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا تو ابّن کی آنکھیں درد کی شدت سے کھل گئیں اور ہونٹوں سے گھٹی ہُوئی سی چیخ نکلی جسے جالوں نے وہیں دبوچ لیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہُوا یا جیدا نے اُسے بالوں سے پکڑ کر اٹھا لیا۔

"مخبر کون تھا؟" — جیدا نے تحکمانہ انداز میں مگر آہستگی سے پوچھا۔

اِبّن نے نفی میں سر ہلایا۔

"مخبر کون تھا؟" — جیدا نے بلند آواز سے پوچھا۔

"معلوم نہیں" — مری ہوئی سی آواز سنائی دی۔

"خبری کس نے کی تھی؟" — جیدا نے دانت پیستے ہوئے پوچھا اور اُس کے بالوں کو ایک اور جھٹکا دیا۔ اِبّن کا منہ کھل گیا اور دانت کٹکٹانے لگے۔ اُس میں بولنے کی سکت نہیں تھی، اتنی سی سرگوشی کر سکا — "استاد رحم!"

جیدا نے اُس کے بال چھوڑ کر اس کے منہ پر ایسا گھونسہ مارا کہ ابّن دیوار کے ساتھ جا لگا اور گر پڑا۔ منّا، ٹیپو اور بادل دروازے میں کھڑے خاموشی اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ابّن نے گر کر نہ اٹھنے کی کوشش کی نہ ہلنے کی — اُس کے منہ سے خون بہنے لگا۔

جیدا نے آگے بڑھ کر اُس کے سینے پر پاؤں رکھ دیا۔

"میرے تین آدمی کس نے گرفتار کراتے ہیں... مخبری کس نے کی؟"

ابّن نے نفی میں سر ہلایا۔

"سلطانی گواہ" — جیدا نے طنزیہ کہا — "تم سلطانی گواہ ہو!"

کمرے کی فضا میں ملتجی سرگوشی اُبھری — "پانی" — اور کمرے کی وحشت میں ڈوب گئی۔

"پانی لاؤ" — جیدا نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

ذرا سی دیر بعد جیدا کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا اور اُس کا پاؤں ابّن کے سینے پر۔ ابّن نے پانی کا گلاس دیکھا تو وہ تلملایا۔ جیدا نے گلاس کو ذرا ٹیڑھا کر کے پانی کے چند قطرے گرا دیتے جو ابّن کے چہرے پر بکھر گئے۔ اُس کی زبان باہر نکل آئی اور وہ بیتابی سے ہونٹوں، ناک اور ٹھوڑی پر بکھرے ہوئے قطروں کو چاٹنے لگا۔ اس کے ساتھ اُس نے اپنا بہتا ہُوا خون بھی چاٹ لیا۔ ذرا سی نمی نے اس کی زبان میں جیسے جان ڈال دی ہو۔

"پانی!" — ابّن نے قدرے جان دار آواز میں التجا کی۔

"تم سلطانی گواہ کیوں بنے؟"

"پانی... پانی۔"

جیدا نے تھوڑا سا اور پانی اُس کے منہ میں گرا دیا اور ابّن تیزی سے خون اور پانی کے قطرے چاٹنے لگا۔ اس کی زبان سانپ کی سی تیزی سے چل رہی تھی۔

"تمھیں وعدہ معاف گواہ بننے کی کتنی کمیشن ملی ہے؟"

"کچھ نہیں... پانی... پانی" — ابّن یوں بولا جیسے سسکیاں لے رہا ہو۔

"میں نے تمھیں اُس بنگلے میں اس لیے ملازم رکھوایا تھا کہ" — جیدا نے اس کے سینے پر پاؤں دباتے ہوئے کہا — "بتا سکو بیس ہزار کا ہار وہ لوگ کہاں رکھتے ہیں اور ان کی لڑکی کون سے کمرے میں سوتی ہے۔ گھر میں کتنی نقدی ہے اور کہاں پڑی ہے۔"

"پانی" — ابّن نے تڑپتے ہوئے التجا کی — "خُدا کے لیے، صرف ایک گھونٹ۔"

جیدا نے اب کے پہلے سے زیادہ پانی اس کے منہ پر گرایا جس سے گھونٹ بھر اُس کے مُنہ میں چلا گیا۔ کچھ ناک کے رستے جسم میں داخل ہُوا اور کچھ زبان نے اِدھر اُدھر سے چاٹ لیا۔

"تم نے مجھے جو خبر دی غلط دی" — جیدا بولا — "مال اوپر کی منزل میں تھا مگر تم نے بتایا کہ نیچے رکھا ہے جہاں خالی سیف پڑا تھا۔ تم نے گھر والوں کو بھی پہلے سے خبردار کر دیا اسی لیے پولیس وہاں چھپی بیٹھی تھی۔ میرے آدمی پکڑ لیے گئے اور تم وعدہ معاف گواہ بن گئے۔"

"میں نے مخبری نہیں کی" — ابّن نے نقاہت زدہ آواز میں کہا — "اُستاد! میں بے قصور ہوں۔"

"ابّن!" — جیدا نے پاؤں کو اس کے سینے پر اور دباتے ہوئے کہا — "میں نے اس کام کے لیے

تمھیں پانچ سو روپیہ دیا اور تم ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ وہاں سے لیتے رہے۔ مخبری کا انعام تم نے الگ لیا۔ دونوں طرف سے کھایا اور اب سلطانی گواہ بن گئے۔"

"نہیں! میں سُلطانی گواہ ضرور بنا ہوں" — ابّن نے سرگوشی کی — "مخبری میں نے نہیں کی۔ مجھے چھوڑ دو۔ وعدہ کرتا ہوں کہ عدالت میں جا کر اپنے بیان سے پھر جاؤں گا۔ کہوں گا کہ پولیس نے مار پیٹ کر سلطانی گواہ بنایا ہے۔"

جیدا نے پاؤں اُس کے سینے سے اٹھا لیا اور اس کے پہلو میں ایسی لات جمائی کہ وہ بلبلا اُٹھا۔ خُون کے کئی قطرے اُس کے منہ سے نکل آئے۔ جیدا نے ایک ڈنڈا اٹھایا اور ابّن کی باچھوں میں رکھ کر اُس کے دونوں سروں کو پاؤں سے دبا لیا۔ ڈنڈا ابّن کی باچھوں کو چیرنے لگا۔ درد کی شدت سے وہ ذبح ہوتے بکرے کی طرح تڑپا۔ جیدا ڈنڈے کے سروں کو دباتا ہی چلا جا رہا تھا۔ ابّن کی ٹانگیں پھڑک رہی تھیں۔ ہاتھ بدستور پیٹھ پیچھے بندھے تھے۔ اس کی گھٹی گھٹی چیخیں اور کربناک خراٹے جیدا کے دل میں رحم کا ہلکا سا شائبہ بھی پیدا نہ کر سکے۔

"ساری بات کھُل کر بتاؤ" — جیدا نے ڈنڈے سے پاؤں کا دباؤ ذرا کم کر دیا اور بولا — "تم نے پولیس کو کیا بیان لکھوائے ہیں۔ میں ان کے مطابق صفائی کا بندوبست کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بھی بتاؤ کہ مخبری کس نے کی؟"

جیدا نے اس کے منہ سے ڈنڈا ہٹایا تو خون کا دھارا ابّن کی باچھوں سے بہ نکلا۔ اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ کھانستے کھانستے اُس نے پانی مانگا۔

جیدا نے اُسے سہارا دے کر اٹھایا اور پانی کا گلاس اس کے منہ کے ساتھ لگا دیا۔ ابّن نے بے صبری سے پانی پی لیا اور کہا — "ہاتھ بھی کھول دو، بتاتا ہوں۔"

جیدا کے اشارے پر بادل نے اس کے ہاتھ کھول دیتے۔

ابّن نے اکھڑی سانسوں کو سنبھالنے کی سرتوڑ کوشش کی، جیدا کو ہاری ہُوئی نگاہوں سے دیکھا اور بولا — "میں جی چکا۔ صرف چند باتیں" — اُسے پھر کھانسی کا دورہ پڑا جو پہلے سے زیادہ جگر خراش تھا۔ نحیف آواز میں بولا — "تمھیں معلوم نہیں اُستاد! میرے پانچ بچے ہیں۔ بیوی مدت سے بیمار ہے۔ دوا نہ دارو... غریبی... روٹی نہیں ملتی، دوائی کہاں سے آتے... پانی... اُستاد! پانی۔"

جیدا نے گلاس اپنے ساتھیوں کی طرف پھینکا۔ ٹیپو پانی لینے چلا گیا۔

"میں نے تمھارا نمک کھایا، تمھیں دھوکہ دیا" — ابّن نے کہا — "مجھے دھوکہ باز بنایا میرے بھوکے پیاسے بچوں نے، میری بیمار بیوی نے جو تڑپتی رہتی ہے مرتی نہیں۔"

ٹیپو نے پانی کا گلاس ابّن کی طرف بڑھایا تو وہ گلاس پر ٹوٹ پڑا اور ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گیا۔ پیٹ چھ روز سے خالی تھا۔ اس میں اس قدر تیزی سے پانی جو گیا تو درد کی شدید لہر اٹھی۔ ابّن کی آنکھیں باہر نکلنے لگیں اور وہ ایک پہلو پر لڑھک گیا۔ اُس پر غشی سی طاری ہونے لگی لیکن وہ اپنے آپ کو ہلکے ہلکے جھٹکے دے کر سنبھل گیا۔ بات کرنے ہی لگا تھا کہ کھانسی کا دورہ پھر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی منہ سے خون آنے لگا۔ پھر وہ کراہتا رہا، کھانستا رہا، خون تھوکتا رہا۔ اس کی آواز ڈوب جاتی تھی، اُبھر آتی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے وہ بات ختم کر لینے تک زندہ رہنے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ وہ کراہتا تھا، اٹھتا تھا، پہلو پر لڑھک جاتا تھا، کبھی اُٹھ بیٹھ جاتا تھا اور یوں گرتے، سنبھلتے کھانستے اُس نے جیدا کو سنا دیا:

"میں چور تو نہ تھا۔ بھوکا رہا لیکن حرام نہ کھایا۔ میں نے دن کے وقت نوکری کی اور رات کی چوکیداری بھی کی لیکن میں بیوی بچوں کا روٹی کپڑا پھر بھی پُورا نہ کر سکا۔ بیوی بیمار پڑی تو اسے دوائی نہ دے سکا۔ لڑکی جوان ہُوئی تو اُس کی شادی نہ کر سکا.... باتیں لمبی ہیں اُستاد! وقت نہیں کہ سناؤں۔ اتنی سی سن لو....

"بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے میں نے کیا کیا جتن نہ کیے۔ سائیکل رکشا چلاتی مگر چل نہ سکی۔ فاقہ کشی نے اتنی طاقت ہی کہاں چھوڑی تھی۔ گودی میں مزدوری کی مگر کمر میں جان نہیں تھی کہ بوجھ اٹھاتا۔ وہاں خون زیادہ چوسا جاتا ہے اور خُون کی قیمت بہت کم ملتی ہے۔ بیوی کو بیماری کھا رہی تھی۔ بچے بھوک سے بلبلا رہے تھے اور میں روٹی کے ٹکڑے کی خاطر جگہ جگہ جسم کو چکنا چور کرتا تھا۔ لوگوں نے کہا تمہاری بیٹی جوان ہے کسی گھر میں اُوپر کے کام پر لگا دو لیکن میں نے ہاں نہ کی۔ سوچا زمانہ خراب ہے اور بیٹی جوان ہے۔ پھر سردی کا موسم آ گیا اور میرے بچے ٹھٹھرنے لگے....

"آخر تم مل گئے۔ میں تمہارے ساتھ ملا تھا تو مجبوری سے۔ خوشی سے نہیں۔ میں نے سوچا تھا یہاں کیا لکھ پتی کیا کروڑ پتی کیا حاکم کیا وزیر سبھی ہاتھ صاف کر رہے ہیں تو میں بھی دین ایمان کو الگ پھینک کر تمہارے گروہ میں شامل ہو گیا.... میں تو چوری کرنے اور پیسہ کمانے آیا تھا۔ میں تمہارے ساتھ کیوں دیانتداری کرتا؟ میں نے سوچا کیوں نہ چوری میں ایک اور چوری کر لوں؟ اسی خیال سے میں نے تم سے گھر بھیدی بننے کا الگ پیسہ لیا۔ مخبری کا الگ انعام لیا اور وعدہ معاف گواہ بننے کی کمشن الگ لی.... میرے بچے بھوک سے مر رہے تھے استاد! وہ اب بھی بھوک سے مر رہے ہیں۔ نہ میرے ایمان نے ان کا پیٹ بھرا نہ میری چوری چکاری ان کے منہ میں دو نوالے ڈال سکی....

"اور جیدا استاد! —— ابّن نے ہچکی لی پھر آہ لے کر بولا —— "اب نہیں خدا کے حوالے کر چلا ہوں۔"

جیدا نے اُس کی طرف پانی کا ایک اور گلاس بڑھایا تو ابّن نے سر ہلا کر کہا —— "اب پانی نہ دو چند سانسیں باقی ہیں.... استاد جیدا!" —— اس کی آواز ڈوبنے لگی "میرے بچے...." اس کا سر ڈول گیا —— "میری بیوی.... میری بچی...." اور آخری ہچکی۔

ابّن کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ ایک ہچکی نے اس کے سب روگ پھونک ڈالے۔ وہ لڑھک کر ایک پہلو پر گر پڑا۔

ابّن کی لاش کی آنکھیں یوں کھلی ہُوئی تھیں جیسے اب بھی جیدا کا منہ تک رہی ہُوں۔

جیدا ابّن کی لاش کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر رہا ہو۔

ٹیپو نے نبض دیکھی اور جیدا کی طرف دیکھا۔

"اس کونے میں دفن کر دو" —— جیدا نے کہا اور دروازے کی طرف چل پڑا —— "جانتے ہو یہ کہاں رہتا تھا؟"

—— جیدا نے دروازے میں رُک کر پوچھا۔

"ہاں! مجھے معلوم ہے" —— بادل نے جواب دیا۔

"آج والا بٹوہ اس کی بیوی کو دے آنا" —— جیدا نے کہا —— "بٹوہ کہیں گم کر دینا۔ رقم اُسے دے آنا۔ لیکن رات کے وقت۔ یہ بھی خیال رکھنا کہ اس کی بیوی تمھیں دیکھ نہ سکے۔ اگر دیکھ لے تو پہچان نہ پائے۔ کہنا میں ابّن کا دوست ہُوں اور یہ بھی دیکھ لینا کہ اس کے گھر کے قریب پولیس کے مخبر ہوں گے" —— اس نے پوچھا —— "اپنے پاس اور کچھ ہے؟"

"باہر کچھ نہیں" —— بادل نے جواب دیا —— "سب کچھ اندر ہے۔"

"خیر" —— جیدا نے ذرا سوچ کر کہا —— "اندر سے نکالنے کی ضرورت نہیں کہیں دو چار ہزار کا ہاتھ مار دو۔ وہ بھی اس کی بیوی کو دے آؤ۔ اس کے بچے بھوکے نہ رہیں۔ مستقل انتظام میں خود کر لوں گا۔ میں خود وہاں جاؤں گا۔ تم یہ چار پانچ سو روپے اس کی بیوی کو دے آؤ.... آج رات۔"

جیدا صحن میں نکل آیا۔ دروازے پر دستک ہوتی تو اُس نے دروازہ کھولا۔ ایک نوعمر شاگرد ہانپتا ہُوا اندر آیا۔ یہ اُن لڑکوں میں سے تھا جو اُستادوں کے لیے مخبری کیا کرتے اور آسامیوں کی اطلاعیں دیتے ہیں۔

"اُستاد!" — لڑکے نے کہا — "موٹا آسامی ہے ... جُونا مارکیٹ میں ایک دکان میں بیٹھا ہے۔ وصولیاں کرتا پھر رہا ہے۔ ہاتھ میں تھیلی ہے۔ اگر جلدی چلو تو شاید ..."

بوہرے اور میمن تاجر جو ہول سیل کاروبار کرتے ہیں، ایک دن وصولیوں کے لیے نکلا کرتے ہیں۔ عموماً تھیلیوں میں رقم لے جاتے ہیں لیکن اتنے کچّے نہیں ہوتے کہ تھیلی لہراتے ہوتے بھرے بازار میں گھومتے پھریں، پھر بھی کوئی لاپرواہ تاجر کسی استاد کا شکار ہو جاتا ہے۔

"میں نے اُسے دیکھا ہے" — لڑکے نے کہا — "دو دکانوں پر گیا تو اُس نے تھیلی ہاتھ میں رکھی تھی۔ کپڑوں کے اندر نہیں رکھتا۔"

جیدا کو اپنے شاگردوں پر بھروسہ تھا۔ وہ اتنے تربیت یافتہ تھے کہ اچھی طرح دیکھ کر بتا دیا کرتے تھے کہ یہ شکار آسان ہے یا اسے نظر انداز کیا جائے۔

جیدا ایک کمرے میں گیا اور فرش پر بچھے بستر کے سرہانے کے نیچے سے ایک عینک، خنجر، کالی ٹوپی اور نقلی مونچھیں نکال کر پتلون کی جیب میں ڈالیں اور اُس کمرے کے بند دروازے کے سامنے جا کھڑا ہُوا جہاں اپّن کی لاش پڑی تھی۔

"مُنّے! تم میرے ساتھ آؤ" — جیدا نے کہا — "لونڈا آسامی کی خبر لایا ہے ... ٹیپو اور بادل! تم کام میں لگے رہو۔ دیر نہ کرنا۔"

تھوڑی دیر بعد جیدا، مُنّا اور لڑکا جُونا مارکیٹ کے ہجوم میں چلے جا رہے تھے۔ لڑکا آگے آگے تھا اور چوکس ہو کر شکار کو بھانپ رہا تھا کہ وہ کہیں دوکان سے اُٹھ کر غائب نہ ہو چکا ہو۔

"وہ جا رہا ہے" — لڑکا پلٹ کر بولا اور آگے نکل گیا۔

ایک بھاری بھرکم میمن سیٹھ، ہاتھ میں تھیلی اُٹھاتے جا رہا تھا۔ دھکم پیل اور افراتفری کا یہ عالم تھا جیسے اس ہجوم کا ہر آدمی دوسروں کو کچل کر آگے نکل جانا چاہتا ہو۔ جیدا کی نظریں شکار پر جمی تھیں۔ وہ صرف موزوں موقع اور مقام کے انتظار میں تھا۔

مُنّا اور لڑکا اچھی طرح جانتے تھے کہ اُستاد کیا داؤ کھیلے گا اور اس موقعہ پر انہیں کیا کرنا ہے۔ کسی ریہرسل یا ہدایت کی ضرورت نہیں تھی۔ جیدا نے انہیں ٹریننگ دے رکھی تھی۔ تینوں سیٹھ کے قریب ہو کر اُس کا تعاقب کرنے لگے۔ لڑکا پھر سے لَوٹ کر ان سے آن ملا تھا۔

ذرا آگے جا کر پرانی کراچی کی گلیوں کا وہ علاقہ شروع ہو گیا جہاں تین تین چار چار منزلہ مکان ایک صدی سے ایک دوسرے کے سہارے کھڑے ہیں۔ گلیاں روزِ اوّل سے دھوپ کو ترس رہی ہیں اور جہاں مکھیوں، مچھروں اور کھٹملوں کا بسیرا ہے۔ ان گلیوں میں اس قدر موڑ اور پیچ و خم ہیں کہ انسان گم ہو جاتا ہے، جیسے ابھی جا رہا تھا کہ کسی دیوار نے اسے اپنے اندر جذب کر لیا ہو۔ گلیاں گلیوں میں گم ہو جاتی ہیں

سیٹھ جب سڑک سے ملنے والی ایک گلی سے دو چار قدم دور رہ گیا تو جیدا نے اشارہ کیا۔ مُنّا اور لڑکا سیٹھ سے آگے نکل گئے۔ ان کا آگے نکلنا تھا کہ جیدا نے چیل کی طرح جھپٹا مارا اور تھیلی اُس کے ہاتھ سے چھین کر گلی میں داخل ہو گیا۔ سیٹھ جیدا کے پیچھے دوڑنے لگا تو مُنّا اور لڑکا اس کے آگے ہو گئے۔ سیٹھ اُن سے ٹکرایا تو دونوں ایک طرف ہو گئے۔ سیٹھ کے سنبھلنے تک جیدا اگلی گلی سے بھی غائب ہو چکا تھا۔ وہ سیٹھ کو سائے کی طرح نظر آیا اور گلیوں کے دھندلکے میں تحلیل ہو گیا تھا۔ ذراسی دیر اس کے بھاگتے ہُوئے قدموں کی آواز سنائی دی جو سیٹھ کے واویلے میں ڈوب گئی۔

"چور، چور .... لے گیا ... تھیلی لے گیا" — سیٹھ واویلا کر رہا تھا، سینہ پیٹ رہا تھا لیکن کراچی کا ہجوم اس قدر جلدی میں ہوتا ہے اور اس قدر مُرلونگ میں کہ ساتھ چلتے ساتھی کو کوئی اٹھا کے لے جاتے تو پتہ نہیں چلتا۔

دو تین آدمیوں نے جیدا کو سیٹھ کے ہاتھ سے تھیلی چھین کر بھاگتے دیکھا تھا۔ انہوں نے سیٹھ کا ساتھ دیا اور گلی میں بھاگے۔ ہجوم تماشہ دیکھنے رک گیا۔ چند اور آدمی تعاقب میں بھاگ اُٹھے۔

مُنّا اور لڑکا ہی تھے جو سیٹھ کے قریبی رشتہ دار یا ہمدرد نظر آتے تھے۔ وہ سیٹھ کے ساتھ اس طرح بھاگ رہے تھے جیسے تھیلی ان کی تھی یا سیٹھ ان کا باپ تھا۔ وہ دونوں اس مختصر سے گروہ کے آگے آگے بظاہر گھبراہٹ میں بھاگ رہے تھے لیکن یہ کوئی نہ جان سکا کہ وہ تعاقب میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔ وہ دونوں کبھی اِس گلی کی طرف اشارہ کرتے کبھی اُس گلی کی طرف — "اُس طرف گیا ہے .... اُدھر جاؤ .... اِس طرف آجاؤ .... وہ گیا .... اس گلی میں گھس گیا ہے۔"

یہ چند ایک آدمی گلیوں کے موڑ مڑتے دوڑے جا رہے تھے۔ مُنّا اور لڑکا ان کے گائیڈ بن گئے تھے۔ ان دونوں کے قدموں میں تیزی اور انداز میں جوش اور ہمدردی تھی۔ گالیاں اتنی بک رہے تھے جیسے چور انہیں مل گیا تو اُس کی تکّا بوٹی کر دیں گے۔ ان آدمیوں میں کسی کو یہ بھی پتہ نہ چلا کہ وہ دوڑ دوڑ کر وہیں آ گئے ہیں جہاں جیدا نے سیٹھ کے ہاتھ سے تھیلی چھینی تھی۔ یہ آدمی ایک ایک کر کے وہاں سے کھسکنے لگے۔ سیٹھ کو چین کہاں۔ اس کے ساتھ اب مُنّا اور لڑکا رہ گئے تھے۔

"ارے میرے ساتھ چلو نا بھائی" — سیٹھ نے مُنّے اور لڑکے سے کہا — "میرا سارا مال چلا گیا ہے۔"

"ہم تمھارے ساتھ ہیں سیٹھ!" — مُنّے نے کہا۔

سیٹھ، مُنّا اور لڑکا ابھی آگے بڑھ رہے تھے کہ ایک گلی سے ایک آدمی سامنے آیا جس کے سر پر سیاہ ٹوپی، آنکھوں پر چشمہ، ہونٹوں اور ناک کے درمیان گھنی مونچھیں، ننگے بدن قمیض کندھے پر رکھی تھی جسے اُس نے ایک ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔

"آپ نے ایک آدمی کو ہاتھ میں تھیلی اٹھاتے اُدھر بھاگتے دیکھا ہے؟" — مُنّے نے اُس سے پوچھا۔

"ہاں!" — اُس نے جواب دیا — "کیا بات ہے تم لوگ گھبرائے گھبرائے کیوں ہو؟"

"جُلم ہو گیا بھائی! جبر جسبت جُلم ہو گیا" — سیٹھ نے چلاّ چلاّ کر کہا — "میرا چار ہجّار روپیّا چھین کر بھاگ گیا ہے۔"

"چار ہزار؟" — اُس نے حیرت زدہ ہو کر کہا — "تو تمھارے جاتے سیٹھ صاحب! بھاگنے اور رونے سے کیا حاصل! وہ تو اس گلی سے آگے سڑک پر پہنچ کر موٹر سائیکل رکشا میں چلا گیا ہے۔ میں نے خود دیکھا

ہے۔ ہاتھ میں ہرے رنگ کی تھیلی سی تھی۔"

"وہی، وہی"۔۔۔ سیٹھ نے اچھل کر کہا۔۔۔ "ہرے رنگ کی تھیلی، منہ پر سرخ رنگ کا ڈورا تھا۔"

سیٹھ یہ بھول ہی گیا کہ یہ گلیاں دس منٹ کے اندر اندر کسی سڑک سے نہیں جاملتیں اور اُسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اُس کی ہرے رنگ کی تھیلی اس سے صرف ایک ہاتھ دور اس آدمی کے کندھے پر پڑی ہُوئی قمیض کے نیچے ہے جس کے اوپر اُس نے ہاتھ رکھا ہُوا ہے اور وہ کراچی کا استاد ہے۔ سیٹھ کو اسی قدر معلوم تھا کہ اس کا "چار ہجّار" جا چکا ہے اور اب بھاگنا بیکار ہے۔ وہ وہیں بیٹھ گیا اور بلند آواز سے رونے لگا۔

سیٹھ کے گرد محلّے کے بچّوں، عورتوں اور مردوں کا ہجوم جمع ہونے لگا تو جیدا بھروپ میں، مُنّا اور لڑکا وہاں سے کھسک گئے۔۔۔ اور کراچی کے جرائم میں ایک واردات کا اضافہ ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد جیدا اپنے دونوں ساتھیوں سمیت ایک ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا۔ وہ ابھی تک بھروپ میں تھا۔ ڈرائیور انجن کا ڈھکنا کھولے انجن میں جھکا ہُوا تھا۔

ایک پولیس کانسٹیبل ٹیکسی سٹینڈ سے پانچ چھ قدم دور دیوار کے ساتھ کھڑا جمائیاں لے رہا تھا۔ وہ بار بار پورے کا پورا منہ یوں کھول رہا تھا جیسے لمحات کو نگلنے کی کوشش کر رہا ہو اور ڈیوٹی کے تین چار گھنٹے نگل کر وہیں سو جانا چاہتا ہو۔

جیدا نے کانسٹیبل کو دیکھا تو قمیض میں لپٹی ہُوئی تھیلی کا دھاگہ کھول کر اس میں سے دس دس کے دو نوٹ نکالے۔ نوٹوں کو ہاتھ میں دبا دبا کر اور مروڑ کر گولی سی بنائی۔ پھر اس گولی کو انگوٹھے اور درمیانی انگلی میں پکڑ کر ہاتھ ٹیکسی سے باہر نکالا اور جب سپاہی نے پھر جماہی لینے کے لیے منہ کھولا تو جیدا نے شہادت کی انگلی سے نوٹوں کی گولی کو غلیلے کی طرح نشانے پر پھینک دیا۔

گولی اڑتی ہُوئی کانسٹیبل کے مُنہ پر لگی۔ کانسٹیبل نے چونک کر منہ بند کر لیا۔ اس نے نیچے دیکھا اور جھک کر گولی اُٹھا لی۔ کھولی تو دیکھا کہ دس دس کے دو نوٹ تھے۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جیدا نے نقلی مونچھیں اتارتے ہوئے کانسٹیبل کو آواز دی۔ کانسٹیبل نے ٹیکسی کی طرف دیکھا اور مُسکرا دیا۔

ٹیکسی چلی گئی۔ سپاہی کی جمائیاں ختم ہوگئیں اور وہ چُستی سے اپنے علاقے میں ٹہلنے لگ گیا۔

"کیوں بھئی!"۔۔۔ جیدا نے ٹیکسی ڈرائیور کے کندھے پر ہاتھ مار کر پُوچھا۔

"ہماری ٹیکسیوں کو گاہک مل رہے ہیں یا نہیں؟"

ٹیکسی ڈرائیور نے گھوم کے دیکھا اور چونک اٹھا۔۔۔ "اُستاد؟..... اوہ..... تیری قسم، میں نے پہچانا نہیں!"۔۔۔ اُس نے چہکتے ہُوئے کہا۔۔۔ "کیوں نہیں اُستاد!..... ہم تو تمھارا دیا کھا رہے ہیں تم غم نہ کرو۔ میں تمھاری سب سیٹوں کا بہت خیال رکھتا ہوں۔"

گھر سے اِبّن کی غیر حاضری کا ساتواں روز تھا۔ آج تو وہ دنیا ہی سے غیر حاضر ہوگیا تھا۔ اُس کی بیمار بیوی، نوجوان بیٹی اور پانچ بچے پریشان حالی میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ صرف پیٹ کا مسئلہ ہوتا تو کوئی حیلہ بہانہ کر کے وقت گزار لیتے۔ بیماری بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ہر غریب انسان کی طرح اِبّن کی بیوی نے

بھی اپنے آپ کو فریب دے لیا تھا کہ یہ بھی کوئی بیماری ہے، پیٹ میں کچھ گڑبڑ ہے۔ خود ہی ٹھیک ہو جائے گی لیکن یہ گڑبڑ معمولی نہ تھی۔ اُس کے اندرونی اعضا مفلسی اور نیم فاقہ کشی کی حالت میں اُوپر تلے پانچ بچّوں کو جنم دینے سے بگڑ چکے تھے۔ پیٹ میں شدید درد کے دورے اٹھتے تھے جنہیں وہ اب دبا لینے کی عادی ہوگئی تھی۔ جسم کا خُون پانچ بچوں نے دودھ کے رستے پی لیا تھا۔ اوپر غربت گھٹاؤں کی طرح چھائی ہُوئی تھی۔

اِبّن کی مختصر سی آمدنی تھی جس سے بمشکل روٹی کا دھندا چلتا تھا۔ لڑکی جوان ہوکر مرجھانے لگی تھی۔ اس کی جوانی جاڑے کے چاند کی طرح خاموشی سے گزرتی جا رہی تھی دو بچے سکول میں داخل ہُوئے تھے لیکن تیسری جماعت سے آگے نہ بڑھ سکے تھے۔ اِبّن نے انہیں سکول سے اُٹھا لیا تھا۔ اُس کے کندھے اس قدر بوجھ نہ اٹھا سکتے تھے۔ وہ اب دونوں چائے کی ایک دکان پر پندرہ پندرہ روپے ماہوار اور روٹی کپڑے پر نوکر تھے۔ ننھے ننھے بچے نُور کے تڑکے گھر سے نکلتے اور آدھی رات واپس آتے تھے۔ بعض اوقات نیند اور تھکان انہیں گھر تک بھی نہیں پہنچنے دیتی تھی۔ وہ رستے میں ہی فٹ پاتھ پر سو جاتے تھے۔

تین چار مہینوں سے ان کے گھر میں دو پیسے دکھائی دینے لگے تھے۔ اِبّن اور اس کی بیوی کو اُمّید بندھ چلی تھی کہ ان کی بیٹی کا شاید بیاہ ہو جائے گا۔ انہوں نے دو جوڑے کپڑے بھی بنوا لیے تھے۔ بیوی نے اِبّن سے پوچھا تھا کہ اُسے اتنی زیادہ تنخواہ کہاں سے ملنے لگی ہے۔ اِبّن نے اُسے بتایا تھا کہ وہ دو جگہوں پر ملازمت کر رہا ہے۔ اس نے بیوی پر کبھی ظاہر نہ ہونے دیا تھا کہ مفلسی اور فاقہ کشی اسے تاریک راہوں پر لے گئی ہے اور وہ اب چور اچکوں کے گروہ میں شامل ہوگیا ہے۔

اب یہ تنگدست کُنبہ سات آٹھ دنوں سے پریشان تھا۔ نوبت فاقوں تک آگئی تھی، لیکن فاقے اتنے پریشان کُن نہیں تھے جس قدر یہ مصیبت کہ جب سے اِبّن گھر سے غیر حاضر ہُوا تھا، پولیس نے اس کے کنبے کو پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ پولیس کا گواہ تھا۔ اُس کے بغیر کیس کامیاب نہیں ہو سکتا تھا اور وہ غائب ہو چکا تھا۔ اس کے بیوی بچے بھی اس کی غیر حاضری سے پریشان تھے کہ آخر وہ گیا کہاں؟ پہلے تو کبھی گھر سے غیر حاضر نہیں ہُوا تھا۔

سات دنوں میں پولیس نے دو بار آدھی رات کے وقت ان کے کوارٹر میں چھاپہ مارا تھا اور گھر میں رکھے زنگ خوردہ ٹرنکوں کو بھی الٹ پلٹ کیا تھا۔ سوتے ہوتے بچوں کو بازوؤں سے کھینچ کھینچ کر جگا دیا تھا۔ ان کی بیمار ماں کو گھنٹہ بھر کھڑا رکھ کر پوچھ گچھ کی تھی۔ جوان لڑکی سے چھیڑ خانی بھی کی تھی۔ بڑے دو لڑکوں کو تھانے لے جا کر مارا پیٹا بھی اور دو دو راتیں حوالات میں بھی بند رکھا تھا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ وہ اِبّن کا اتا پتا بتا دیں۔

ان سات دنوں میں شاید ہی کوئی ایسا دن گزرا ہو جب پولیس کا سپاہی دن میں دو تین بار ان کا دروازہ کھٹکھٹائے بغیر اندر نہ گھس آیا ہو اور دونوں کمرے اچھی طرح نہ دیکھ گیا ہو۔ اِبّن کی بیٹی مارے شرم کے زمین میں گڑی جاتی تھی۔ کبھی اس کے گال چھُوتے جاتے کبھی پیٹھ پر ہاتھ پھیر جاتا تھا۔ صرف بچے تھے جنہیں بھوک لگتی تھی۔ ماں بیٹی کو تو کھانے کا ہوش تھا نہ سونے کا۔

آٹھویں رات دس بجے کے قریب ان کے دروازے پر دستک ہُوئی۔ ماں بیٹی خوف سے دم بخود ہوگئیں۔ ان میں اتنی ہمّت نہ تھی کہ اُٹھ کر دروازہ کھولتیں۔ یہ دستک اِبّن کی تو نہیں تھی۔

دروازہ پھر کھٹکا تو لڑکی اٹھی۔ یہ دستک پولیس کی بھی نہیں تھی کسی نے سلجھے ہوئے طریقے سے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ لالٹین ہاتھ میں لے کر لڑکی نے دروازہ کھولا۔ دیکھا کوئی اجنبی تھا۔ سیاہ داڑھی، سر پر ململ کی ٹوپی، آنکھوں پر چاندی کے فریم کی عینک قمیض اور پاجامہ پہنے ہوئے اور اوپر چادر اوڑھے ہوئے تھا۔

"اِبّن یہیں رہتا ہے؟" ــــ اجنبی نے پوچھا۔

"ہاں!" ــــ لڑکی نے ڈرے ہوئے لہجے میں جواب دیا ــ "لیکن آٹھ دس روز سے معلوم نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ وہ میرا باپ ہے۔"

"تمھاری ماں کا اب کیا حال ہے؟" ــــ اجنبی نے پوچھا۔

"بُرا حال ہے، کوئی علاج تو ہو نہیں رہا" ــــ لڑکی کو قدرے اطمینان ہوا کہ یہ لب و لہجہ اور صورت پولیس کی نہیں تھی۔ اُس نے پوچھا ــ "آپ کون ہیں؟"

"اِبّن کا دوست ہوں" ــــ اس نے کہا ــ "مجھے معلوم ہے وہ لاہور چلا گیا ہے۔ چند دنوں تک لَوٹ آئے گا... میں اندر آسکتا ہوں؟"

لڑکی خاموش کھڑی اُس کی طرف دیکھتی رہی جیسے کہہ رہی ہو کہ اندر نہ آؤ تو بہتر ہے۔

"اِبّن کا پیغام ہے!"

یہ سن کر لڑکی ایک طرف ہٹ گئی جس کا مطلب یہ تھا کہ جی تو نہیں چاہتا کہ کسی مرد کو اندر آنے دوں لیکن تم میرے باپ کا پیغام لائے ہو۔

وہ جب اندر گیا تو دیکھا کہ ایک چارپائی پر اِبّن کی بیمار بیوی لیٹی ہوئی تھی۔ زرد چہرے پر بھوک، بے بسی اور خوف کے آثار تھے۔ دو بچے ایک چارپائی پر میلے کچیلے بستر میں سوئے ہوئے تھے اور تین ایک اور چارپائی پر چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے تھے۔

لڑکی پاس پڑی ہوئی چھوٹی سی میز پر لالٹین رکھ کر ماں کی پائنتی بیٹھ گئی اور اجنبی چارپائی کے قریب سٹول پر بیٹھ گیا۔ اُس نے جب بات کی تو اُس کے انداز اور لہجے سے ایسی بُو آئی جس میں اپنائیت اور ہمدردی تھی۔ بیمار عورت اور جواں سال لڑکی کے کھچے تنے اعصاب ٹھکانے آنے لگے۔

اجنبی نے اِبّن کی بیوی سے گھر کا حال احوال پوچھا تو اُس نے بڑی تلخ تفصیلات سنا ڈالیں آنسوؤں کی روانی میں اس نے اِبّن کی گمشدگی، گھر کی ناگفتہ بہ حالت، پولیس کی دست درازیوں اور زیادتیوں کی ایک ایک بات سنائی۔ لڑکی کے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

"دیکھو بہن!" ــ اجنبی نے کہا ــ "اِبّن لمبے کام پر گیا ہوا ہے۔ اُس کا غم نہ کرو" ــ اُس نے چادر میں سے ہاتھ نکالا۔ ہاتھ میں نوٹوں کا بنڈل تھا۔ اُس نے یہ بنڈل اِبّن کی بیوی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ــ "یہ رقم اِبّن نے بھیجی ہے.... چار ہزار روپیہ ہے۔"

نوٹوں کا بنڈل اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر عورت یوں پیچھے ہٹ گئی اور یوں تڑپی جیسے کالے ناگ نے اُس پر حملہ کر دیا ہو۔

"نہیں! یہ نوٹ مجھے نہ دکھاؤ"... وہ علیل سی خودداری سے بولی ــ "لے جاؤ یہ دولت!"

"نہیں بہن! یہ روپے...."

"یہ روپے ہم جیسے غریبوں کی عزّت خریدنے کے کام آتے ہیں" ــ اِبّن کی بیوی نے کانپتی لرزتی آواز میں کہا ــ "تم غریب کی بیٹی کی آبرو زبردستی لُوٹ سکتے ہو جیسے رہزن خنجر کی نوک پر کسی کی جیب خالی کرا لیا کرتے ہیں... چار ہزار؟ ... تم چار لاکھ دو تو بھی..."

"تم کیا کہہ رہی ہو بہن؟" ــــ سیاہ داڑھی والے اجنبی نے چار ہزار روپیہ پیچھے کرتے ہوئے پوچھا ــ "کس وہم میں پڑ گئی ہو؟ تمھیں مجھ پر اعتبار نہیں؟ قرآن ہاتھ میں لے کر بات کروں؟"

"جس کے ہاتھ میں چار ہزار روپیہ ہو اُس کے ہاتھ میں قرآن مجید ایک کتاب سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ چار ہزار پر عزت بک جاتی ہے۔ چار ہزار پر ایمان بک جاتا ہے۔"

اجنبی جھنجھلا یا۔ اُس نے اس عورت کو غور سے دیکھا جس کے چہرے پر مرض کی نہیں موت کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ کوڑی کوڑی کی، اناج کے دانے دانے کی محتاج تھی، مگر چار ہزار روپے کو قبول کرنے سے گریز کر رہی تھی۔ اجنبی نے اِس کمرے کو دیکھا جو کال کوٹھڑی جیسا تھا۔ چھت جالوں سے اٹی ہوئی اور دیواریں بدرنگ تھیں۔ کمرے میں ایسی بدبو تھی جیسے اس عورت نے یہ سارے بچے ابھی ابھی جنے ہوں۔ اس کمرے میں ایک عورت عزّت، آبرو اور ایمان کی باتیں کر رہی تھی۔

"میرے خاوند نے اتنی رقم کہاں سے حاصل کی ہے؟" ــــ اِبّن کی بیوی نے پوچھا ــ "وہ اپنے سارے خاندان کو بیچ ڈالے تو بھی اُسے چار ہزار روپیہ نہیں مل سکتا۔"

"یہ تم جانو اور اِبّن جانے" ــــ اجنبی نے کہا ــ "میں اس کی امانت دینے آیا ہوں۔ تم بھی اُس کی امانت ہو۔ اس کی بیٹی بھی امانت ہے۔ اپنی امانت لو اور میں جاتا ہوں لیکن میں یہ ضرور پوچھوں گا کہ تم نے ایسی باتیں کیوں کی ہیں۔ اگر کسی نے تمھیں پریشان کیا ہے تو مجھے بتاؤ۔"

ماں بیٹی کو یقین سا ہونے لگا کہ یہ کوئی دردمند ہے۔ انہوں نے ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"پریشانی کی پوچھتے ہو؟" ــــ اِبّن کی بیوی نے کہا ــ "پولیس نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ہم سے پوچھتے ہیں اِبّن کہاں ہے۔ ہم کبھی سے پوچھتی پھر رہی ہیں اِبّن کہاں ہے۔ پولیس والے یہ بھی نہیں بتاتے کہ وہ اِبّن کو کیوں ڈھونڈ رہے ہیں۔ یہاں کے لوگ ہمیں کہتے ہیں کہ پولیس کو کچھ دے دلا کر چلتا کرو۔ ہمارے پاس کچھ ہو تو دیں.... تم بتا سکتے ہو اِبّن لاہور کیوں چلا گیا ہے؟ مجھے شک ہونے لگا ہے کہ اُس نے کہیں ڈاکہ ڈالا ہے۔ اسی لیے اُسے پولیس ڈھونڈ رہی ہے۔"

"اُس نے کہیں بھی ڈاکہ نہیں ڈالا" ــ اجنبی نے کہا ــ "تم یہ رقم رکھ لو۔ مت ڈرو۔"

"ڈروں کیسے نہیں؟" ــــ اِبّن کی بیوی نے کہا ــ "کل شام ساڑھے چار سو روپوں نے ہماری عزّت لُوٹ لی ہے۔ اب تم چار ہزار لے کر آتے ہو" ــ عورت کے جسم میں اتنی سکت نہیں تھی کہ غصے، غم اور خون کے اُبال کو برداشت کر سکتی۔ اُس کے ہونٹ کانپنے لگے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"کیا کہا تم نے؟" ــــ اجنبی نے نوٹوں والا ہاتھ پیچھے کھینچ کر حیرت زدگی سے پوچھا ــ "ساڑھے چار سو روپوں نے کیا کیا؟ جلدی بتاؤ مجھے، جلدی بتاؤ۔"

"خدا غریبوں اور لاوارثوں کے گھر میں لڑکی پیدا نہ کرے" ــ عورت نے روتے ہوئے کہا ــ "جاؤ، نکل جاؤ یہاں سے... ہمیں دولت کا لالچ دینے آتے ہو۔"

"خدا کے لیے بہن! مجھے بتاؤ تو ہُوا کیا ہے؟ میں روپے لے جاؤں گا لیکن کچھ بتاؤ تو سہی۔"

"کل شام ایک غنڈہ آیا تھا" — ابّن کی بیوی نے چھت پر نظریں گاڑتے ہُوئے کہا اور لڑکی اٹھ کر باہر چلی گئی — "تمہاری ہی طرح میرے ہاتھ میں ساڑھے چار سو روپے گن کر دیئے اور بہت دیر چکنی چپڑی باتیں کرتا رہا۔ باتوں باتوں میں میری بیٹی کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے لڑکی کی گھٹی گھٹی چیخیں سنائی دیں۔ میں نے آوازیں دیں۔ زینت! زینت پکارا۔ اُس مردود نے شاید اس کا گلا دبا لیا تھا۔ مجھ میں اٹھنے کی ہمّت نہیں تھی۔ بچے باہر نکل گئے تھے۔ میں گرتی پڑتی اٹھی۔ اس دروازے تک چارپائی کے سہارے پہنچی۔ کواڑ کھول کے جو دیکھا تو..." وہ اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکی اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

اجنبی کا چہرہ غصّے سے لال پیلا ہو گیا۔ آنکھیں جیسے اُبھر کر باہر آیا چاہتی تھیں۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ غصے میں اٹھا اور نوٹوں کا بنڈل ابّن کی بیوی کے سینے پر پھینکتے ہوئے بولا — "یہ چار ہزار روپیہ ابّن نے لاہور سے بھیجا ہے۔ یہ تمھارے خاوند کا روپیہ ہے۔ میں اور ابّن ایک کاروبار کر رہے ہیں۔ یہ منافع ہے۔ میں تم پر احسان کرنے نہیں آیا۔ یہ رقم تمھاری ہے۔"

"آپ ہیں کون؟" — ابّن کی بیوی نے پوچھا — "آپ کا نام پتہ؟"

"میں کوئی بھی ہوں تمہیں اس سے کیا واسطہ؟ صرف یہ خیال رکھنا کہ کسی کو یہ علم نہ ہو کہ کوئی آیا تھا اور یہ رقم دے گیا ہے۔ اسے ایسی جگہ چھپا کے رکھو جہاں پولیس نہ دیکھ سکے۔ صحن میں دبا دو اور تھوڑا تھوڑا نکال کے خرچ کرتے رہنا۔"

"ان کا باپ کب لوٹے گا؟"

"تھوڑے عرصے بعد... میں پھر کبھی بتاؤں گا۔"

"اور یہ پولیس اُس کے پیچھے کیوں پڑی ہُوئی ہے؟"

"ایک کیس میں اُس کی گواہی ہے.... اور کچھ نہیں تم گھبراؤ مت" — وہ چل پڑا۔ پھر رک گیا اور بولا — "ہاں یہ واردات سن کر ضروری بات بھول چلی تھی۔ ابّن نے کہلا بھیجا ہے کہ میں کبھی کبھی اسی طرح روپیہ بھیجتا رہوں گا۔ لڑکوں کو سکول داخل کرا دینا اور سب سے پہلے کسی اچھے ڈاکٹر سے اپنا علاج ضرور کرانا.... اور بہن! مجھے اپنا بھائی سمجھو۔ مجھے اس لڑکی کا باپ سمجھو۔ ہمارا کاروبار خوب چل نکلا ہے۔ اب اپنے آپ کو غریب سمجھنا چھوڑ دو۔ باقی رہا پولیس کا قصہ! اگر تم چاہو تو میں تمہیں یہاں سے کسی ایسے مکان میں بھجوا سکتا ہوں جہاں پولیس کو ساری عمر پتہ نہ چلے گا۔"

"بھائی میرے!" — ابّن کی بیوی نے التجا کی — "اگر ایسا کر سکو تو بڑا احسان ہوگا۔"

"ایسے ہی ہوگا" — اُس نے کہا اور جس طرح اندھیرے سے نمودار ہُوا تھا، کمرے سے نکلا، صحن عبور کیا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

کراچی کی نمناک رات گزرتی جا رہی تھی۔

ناز اپنے کمرے میں لیٹی خیالوں کے تانے بانے میں اُلجھی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے وہ جیدا کی

ڈائری پڑھتی رہی تھی۔ اُس نے جیدا سے دل کی بات کہہ دی تھی اور آزاد ہونے کا مسئلہ طے کر لیا تھا۔ طے اس طرح کہ اس نے وہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ سکون سا محسوس کر رہی تھی۔ شام ہی کو اُس نے رسالے الگ پھینکے اور میز کی دراز کھول کر جیدا کی ڈائری نکالی۔ اس میں ناز کی اپنی اور اسلم کی داستان بھی چند ایک فقروں میں لکھی ہُوئی تھی۔

ناز نے ڈائری کے بے شمار اوراق پڑھ ڈالے اور اس پر انکشاف ہُوا کہ جیدا صرف جرائم پیشہ نہیں کچھ اور بھی ہے۔ درندہ تو ہے لیکن انسان بھی ہے۔ ناز کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ڈائری پڑھنے سے پہلے وہ جیدا کو بے ڈھب سے روپ میں دیکھتی رہی ہو۔ ڈائری میں جیدا نے اپنی ٹوٹی پھوٹی شخصیّت کا ہر ٹکڑا بے نقاب کر رکھا تھا۔

ناز ڈائری پڑھ کر تھک سی گئی تھی، اس لیے نہیں کہ وہ طویل تھی بلکہ اس لیے کہ اس کے اعصاب اس قدر تلخیوں کے ذکر کے متحمّل نہیں ہو رہے تھے۔ دو تین موقعوں پر اس کے آنسو نکل آتے تھے۔ ایک جگہ جیدا نے لکھا تھا:

"آج شام بچپن کے وہ دن یاد آتے رہے جب میری ماں زندہ تھی۔ ماں کے ساتھ میں بھی مر جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔"

ناز نے یہ فقرہ پڑھا تو ڈائری بند کر کے لیٹ گئی۔ اسے بھی وقت کے بہتے لمحوں کے اُس پار اپنا بچپن کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔

مُنّا ٹیپو اور بادل اپنے کمرے میں چرس کے دھوئیں میں سونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ساڑھے گیارہ بجے رات ان کے سونے کا وقت تو نہیں تھا لیکن ابّن کی لاش کے لیے گڑھا جو کھودا تو وہ تھک گئے تھے۔

یہ لوگ گناہوں کی دنیا کی مخلوق تھے۔ وہ مخلوق جو چوریاں کرتی ہے، جیبیں کاٹتی ہے، ڈاکے ڈالتی ہے اور ہر وہ جرم کر گزرتی ہے جس سے مہذّب دنیا کے انسان سہم سہم جاتے ہیں لیکن ان لوگوں کی فطرت اور عادات میں ہیر پھیر نہیں ہوتا۔ آپس میں مل بیٹھتے ہیں تو اپنے اپنے شکار کی باتیں کہہ سُن کر ہنستے ہیں۔ جب ہنستے ہیں تو دل کھول کر ہنستے ہیں۔ مذاق کرتے ہیں تو فحش اور عریاں مذاق کرتے ہیں۔ گالی دینا چاہیں گے تو گالی ہی دیں گے۔ لڑنے پر آجائیں تو لڑ کے ہی رہیں گے۔ دل میں کچھ اور زبان پر کچھ اور کبھی نہیں رکھتے۔ ان میں ظاہرداری نہیں ہوتی۔ فرمائشی قہقہے نہیں ہوتے، بے جا خوشامد نہیں ہوتی۔ مہذّب سوسائٹی والی ڈپلومیسی نہیں ہوتی۔ وہ ایک دوسرے کے ہمراز اور ہمدرد ہوتے ہیں۔ البتّہ مہذّب دنیا کے لوگوں میں بیٹھتے ہیں تو سرتاپا فریب ہوتے ہیں۔ ان کی قسمیں جھوٹی اور ان کی مسکراہٹیں بناوٹی ہوتی ہیں۔ وہ روئیں تو ان کی آنکھوں سے مگرمچھ کے آنسو بہتے ہیں۔

اس کے برعکس آج رات بادل کے دل پر ایک بوجھ تھا جو اُس نے ساتھیوں سے چھپا رکھا تھا۔ ایک دو بار جی میں آئی کہ مُنّے اور ٹیپو کو سُنا ڈالے لیکن جھجک گیا۔ وہ بے چین سا بھی تھا لیکن بے چینی کو بھی چھپا رہا تھا۔

تینوں اپنے اپنے بستروں میں لیٹے تو دروازے پر دستک ہُوئی۔ ناز کے خدمت گار لڑکے نے اپنے کمرے میں سے لالٹین اٹھائی اور باہر نکل کر دروازہ کھولا۔ جیدا کھڑا تھا.... سر پر ململ کی سفید ٹوپی

آنکھوں پر چشمہ، چہرے پر سیاہ داڑھی، پاجامہ قمیض پہنے ہوئے اور چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ وہ ابّن کی بیوی کو چار ہزار روپیہ دے کر لوٹا تھا۔ اُس نے دروازہ بند کر کے داڑھی، ٹوپی اور چادر اتار کر لڑکے کو دے دی۔

"سب کہاں ہیں؟" — اُس نے پوچھا۔

"کمرے میں ہیں، شاید تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔"

جیدا اُس کمرے میں چلا گیا جہاں اس کے تینوں ساتھی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ جب ایک دوسرے سے ملا کرتے تو ہنس کر ملا کرتے تھے۔ اُس رات جیدا کمرے میں آیا تو منّا اور ٹیپو تو ہنس پڑے مگر بادل کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی نہ آئی۔ جیدا کا چہرہ بھی سنجیدہ رہا۔ اس کا چہرہ تو اپنے ان ساتھیوں کو دیکھ کر پھول کی طرح کھل جایا کرتا تھا۔

منّے اور ٹیپو نے جیدا کی سنجیدگی دیکھی، پھر بادل کا چہرہ دیکھا، پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کوئی بات تھی۔ ضرور کوئی بات تھی۔ ان کا اُستاد بادل کے چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ منّے نے جلدی جلدی سے سگریٹ سے کچھ تمباکو نکالا۔ اسے ہتھیلی پر رکھ کر اس میں چرس ملائی۔ تمباکو سگریٹ میں بھرا اور سگریٹ سلگا کر جیدا کی طرف بڑھایا۔ جیدا نے سگریٹ کا کش لے کر سگریٹ ٹیپو کو دے دیا۔

"تم شاید ابّن کے گھر گئے تھے استاد!" — مُنّے نے جیدا سے پوچھا۔

"ہاں!" — جیدا نے جیسے آہ بھری ہو۔ کہنے لگا — "رقم اُس کی بیوی کو دے آیا ہوں" — اُس نے بادل کی طرف دیکھ کر کہا — "ہمارا دوست بادل بھی وہاں ساڑھے چار سو روپیہ دے آیا ہے تم سب کے سامنے میں نے اسے پانچ سو روپیہ دیا تھا۔"

"ارے؟" — ٹیپو نے پوچھا — "پورے پانچ سو کیوں نہ دیئے؟"

بادل کا رنگ اُڑ گیا۔ اس نے خالی خالی نظروں سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔

"تو اناڑی تو نہیں سالے!" — منّے نے بادل سے کہا — "ہم چور ہیں، اُٹھائی گیر ہیں، بے ایمان تو نہیں۔ اُستاد نے پانچ سو کی پاکٹ ماری اور تُو نے پچاس پر اپنا ایمان برباد کر لیا۔"

"مجھے پچاس کا غم نہیں" — جیدا نے کہا — "اس نے ایک اور جھک ماری ہے۔ وہ میں اسی کی زبان سے سننا چاہتا ہوں.... تم بھی سُنو۔"

بادل نے مُنّے اور ٹیپو کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھا لیکن انہوں نے نظریں پھیر لیں۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ اس سے کوئی ناقابلِ معافی حرکت سرزد ہو چکی ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ رحم کی درخواست بیکار ہے۔

"کل تم ابّن کے گھر ساڑھے چار سو روپے دینے گئے تھے؟" — جیدا نے بادل سے پوچھا۔

"ہاں استاد!" — بادل نے اکھڑی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

یہ وہ بادل تھا جس نے تن تنہا دو دو تین تین آدمیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اس کے ریکارڈ میں ڈکیتی کی تین وارداتیں تھیں۔ جیدا کا وہ جانباز ساتھی تھا لیکن جیدا کے سامنے وہ اب بالکل بے بس تھا۔ وہ اپنے اوپر فالج کا سا اثر محسوس کر رہا تھا۔

"تم نے ابّن کی بیوی کو روپے دیئے اور اس کی بیٹی سے کیا سلوک کیا؟"

"مجھ سے بھول ہو گئی اُستاد!" — بادل نے جواب دیا۔

"کیا میں نے تمہیں وہاں بدمعاشی کے لیے بھیجا تھا؟"

"نہیں استاد!" — بادل نے ڈرے ہوئے بچے کے لہجے میں جواب دیا۔

"کیا میں نے کبھی دھیان نہیں رکھا کہ تم مرد ہو؟"

"رکھا ہے استاد!"

کیا میں نے تمہیں ابّن کی بیٹی کو بے آبرو کرنے کی اجازت دی تھی؟"

"نہیں استاد!"

"اور تم نے اُس کو بے آبرو کیا!"

"بخش دو اُستاد! خطا ہو گئی۔"

"تم مرے ہوئے کے سینے پر کُودے ہو۔"

"جوان لڑکی کو دیکھ کر استاد!...."

"تم دونوں نے اس کا قصور اور بیان سن لیے ہیں؟" — جیدا نے اُسکی بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے منّے اور ٹیپو سے پوچھا۔

"سن لیے!"

"کیا یہ قصور وار ہے؟"

"اس میں شک ہی کیا ہے!" — منّے نے کہا اور ٹیپو نے تائید میں سر ہلا دیا۔

"اسے میں جو بھی سزا دوں، تم قبول کر لو گے؟"

"کر لیں گے استاد!" — منّے نے کہا۔

"بادل" — جیدا نے کہا — "تم جانتے ہو ہم کتنے برسوں سے اکٹھے ہیں اور ہم نے کہاں کہاں اور کیسی کیسی وارداتیں کی ہیں۔ کوئی ایک واردات بتا دو جو میں نے کسی جھگی میں یا کسی کوارٹر میں کی ہو یا تم میں سے کسی کو کرنے دی ہو۔ کیا ہم نے کبھی ایسے گھر کا تالہ توڑا ہے جہاں کے رہنے والے اپنے پیٹ کاٹ کر اپنی بیٹیوں کے جہیز بنایا کرتے ہیں؟ میں تمہیں کتنی بار کہہ چکا ہُوں کہ آسامی دیکھ لیا کرو۔ پہنے ہوئے کپڑوں سے اور چہرے سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ آدمی آدھا مہینہ تنخواہ پر اور باقی مہینہ اُدھار پر گزارتا ہے؟"

"سب ٹھیک ہے استاد!" — بادل نے گڑگڑا کر کہا — "یہ قصور معاف کر دو نا! بھول ہو گئی ہے" — اُس نے مُنّے اور ٹیپو کی طرف دیکھ کر کہا — "یار! وہ لڑکی دل کو اتنی اچھی لگی کہ...."

جیدا نے اسے ننگی گالی دے کر کہا — "وہ مرے ہوئے باپ کی بیٹی ہے۔ وہ اُس غریب باپ کی بیٹی ہے جس نے اس بیٹی کی خاطر اپنا ایمان بیچ ڈالا تھا" — جیدا کی آواز میں قہر آ گیا۔ دانت پیس کر بولا — "اس مُلک میں بہت سے لوگ ہیں جو ایمان بیچ کر بچوں کو کھلا رہے ہیں۔ ایمانداری نے انہیں فاقے کرائے تھے.... اور تم نے اس باپ کی بیٹی کو بے آبرو کیا۔"

بادل تو اُس کے آگے دب گیا تھا مگر اُسے اچانک غصّہ آ گیا۔ وہ دب اس لیے گیا تھا کہ جیدا اُس کا اُستاد تھا۔ جیب تراشی اور قفل شکنی کے جو ہاتھ جیدا نے اُسے سکھائے تھے، وہ کوئی اور نہیں سکھا سکتا

تھا۔ استاد کی جتنی عزت جرائم پیشہ لوگوں میں ہے، وہ معاشرے کے کسی اور شعبے میں نہیں ہوتی۔ استاد کا اتنا زیادہ احترام شاگردوں اور بالکوں کے دلوں میں اس لیے بھی ہوتا ہے کہ استاد انہیں گرفتار ہونے سے بچاتے رکھتا ہے۔ گرفتار ہوجانے کی صورت میں استاد ان کی ضمانت کراتا اور ان کے گھر والوں کے اخراجات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ پولیس کے ساتھ رابطہ رکھ کر کیس گول کرالیتا یا بری کرالیتا ہے۔

بادل جیدا سے جو دب گیا تھا، اس کی دوسری وجہ یہی تھی۔ جیدا کا رابطہ صرف پولیس کے ساتھ نہیں بلکہ اُس وقت کے ایسے سیاسی لیڈروں کے ساتھ بھی تھا جو اکثر وزیر بنتے رہتے تھے اور جب وہ حزب اختلاف میں ہوتے تھے تو جیدا ان کی بہت بڑی طاقت بن جاتا تھا۔ بادل کو جیدا نے سنگین وارداتوں میں گرفتاری سے بچا کے رکھا تھا، مگر اب ابّن کی بیٹی کے معاملے میں جیدا نے اُسے کچھ ایسی باتیں کہہ دیں کہ بادل بھڑک اُٹھا۔

"مولوی نہ بنو اُستاد!"۔۔۔ بادل نے کہا ۔۔"میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا ہے کہ غلطی ہوگئی ہے معاف کردو"

"میں معاف کرنا نہیں جانتا"۔۔۔ جیدا نے کہا۔

"میں جانتا ہوں تم مجھے کیا سزا دو گے"۔۔۔ بادل نے کہا ۔۔"اُستاد! یاد رکھو تمہارے پیٹ میں بھی مال ہے۔ اس مکان میں ایک لاش دبی ہوئی ہے اور ایک اغوا کی ہوئی لڑکی بھی ہے"۔۔۔ بادل اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا ۔۔"تم مجھے سزا دوگے تو میں بھی تمہیں سزا دے سکتا ہوں"۔

مُنّا اور ٹیپو حیرت سے بادل کو دیکھ رہے تھے۔ بادل جیدا کا پہلا شاگرد اور ساتھی تھا جو اُس کے سامنے اس طرح بولا۔ مُنّے نے غصے سے اُسے کہا ۔۔"کیا بکتا ہے رے! اُستاد کے پاؤں پکڑ لے"۔

جیدا نے خنجر نکالنے کے لیے ناف پر ہاتھ رکھا تو بادل نے ایک چوکڑی بھری، کمرے سے نکلا اور جتنی دیر میں جیدا خنجر نکال کر باہر نکلتا تھا، بادل مکان سے نکل گیا۔

تیسرے روز اخباروں میں چھوٹی سی یہ خبر چھپی؛

"آج صبح کھارادر کی ایک گلی میں ایک لاش پڑی ملی جس کے جسم پر خنجروں یا چاقوؤں کے گہرے زخم تھے۔ پولیس کا کہنا ہے کہ یہ عبدالعلی عرف بادل بمبیا کی لاش ہے جو تین بار کا سزا یافتہ اور تین وارداتوں میں مطلوب تھا۔ پولیس کے ایک ذمہ دار افسر نے بتایا ہے کہ بادل بمبیا کو غالباً اس کے جرائم پیشہ ساتھیوں نے چوری کے مال کی تقسیم پر جھگڑے میں قتل کردیا ہے۔ پولیس نے مقدمہ زیر دفعہ ۳۰۲ درج کرلیا ہے تاحال کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ لاش پوسٹ مارٹم کے بعد لاوارث ہونے کی وجہ سے پولیس کے انتظام کے تحت دفن کردی گئی ہے"۔

گرفتاری کبھی بھی عمل میں نہ آئی۔

اُس رات بادل بھاگ گیا۔ جیدا اُس کے پیچھے گیا اور دروازے سے واپس آگیا۔ وہ اُس کمرے میں چلا گیا جہاں ناز اُس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ جیدا اس کی طرف دیکھے بغیر میز کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے خنجر میز پر رکھا اور کہنیاں میز پر ٹیک لیں۔ ناز اس کے قریب آن کھڑی ہوئی اور اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کچھ پریشان نظر آتے ہو"۔۔۔ ناز نے کہا۔

"ہاں"۔۔۔ جیدا نے بے خیالی میں کہا۔

"کیوں؟"

"تمہارا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں"۔۔۔ جیدا نے کہا۔

"کیوں؟"

جیدا نے جھنجھلا کر کہا ۔۔"کیا یہ ضروری ہے کہ میں تمہاری ہر کیوں کا جواب دوں؟"۔۔۔ جیدا نے میز کی نیچے والی دراز کھولی اور شراب کی بوتل نکال کر اسے کھولا۔

"جیدے"۔۔۔ ناز نے کہا ۔۔"شراب چھوڑ دو"

"کیوں؟"۔۔۔ جیدا نے بے رخی سے پوچھا۔

"مجھے اس سے گھن آتی ہے"

"کیوں؟"۔۔۔ جیدا نے ناز کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

ناز نے بوتل اُس کے ہاتھ سے لے کر پرے رکھ دی اور بولی ۔۔"کیا یہ ضروری ہے کہ میں تمہاری ہر کیوں کا جواب دوں؟"۔۔۔ ناز کہنی اُس کے کندھے پر ٹیک کر اُس پر جھک گئی۔

جیدا نے چونک کر اُسے دیکھا۔ ناز مسکرا رہی تھی۔ ناز نے اُس کے ہاتھ سے بوتل اتنی سرعت اور ایسی بے ساختگی سے چھینی تھی کہ جیدا کو بُری معلوم نہ ہوئی۔ اُس نے ناز کی طرف دیکھا۔ ناز اُس پر اور زیادہ جھک گئی۔

"تم سوجاؤ"۔۔۔ جیدا نے کہا۔

"اور تم؟"

"مجھے نیند نہیں آرہی"۔۔۔ جیدا نے کہا ۔۔"تم سوجاؤ"۔۔۔ جیدا کے لہجے میں اکتاہٹ نہیں تھی۔

ناز نے ڈائری میں اُس کا اصلی روپ دیکھ لیا تھا ورنہ وہ اس کے ساتھ اتنا کھلنے کی جرأت کبھی نہ کرتی۔ جیدا سے بے تکلف ہوجانے میں اسے مسرت بھی محسوس ہورہی تھی۔

"جاؤ ناز!"۔۔۔ جیدا نے کہا ۔۔"سوجاؤ"

"تم بھی جلدی سوجانا"۔۔۔ ناز نے پیار بھرے لہجے میں کہا اور بستر کی طرف چل دی۔ چارپائی پر بیٹھی تو پوچھا ۔۔"چائے پیو گے؟"

"نہیں!"۔۔۔ جیدا نے جیسے بے خیالی میں جواب دیا ہو۔ دوسرے ہی ثانیے چونک کر پوچھا۔۔۔ "کیا پوچھا تھا تم نے؟"

"چائے پیو گے؟"۔۔۔ ناز نے کہا ۔۔"میں نے آج باورچی خانہ بنا لیا ہے"۔

"ہاں! پیوں گا"

ناز باہر نکل گئی اور جیدا خیالوں میں کھو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ناز نئی ٹرے میں سجایا ہوا نیا ٹی سیٹ لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ ٹرے جیدا کی میز پر رکھ کر چائے بنائی اور پیالی جیدا کے سامنے رکھ دی۔

جیدا نے پیالی اٹھانے کی بجائے جھک کر ایک گھونٹ لیا۔ گھونٹ پینے کی بجائے خلاؤں میں گھورنے لگا۔ اُس نے گھونٹ اس طرح منہ میں رکھا ہُوا تھا جیسے اس کا ذائقہ چکھ رہا ہو یا اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ اُس نے گھونٹ غیر ارادی سے طور پر نگل لیا۔ پھر پیالی سے اٹھتے دھوئیں کو تکنے لگا۔ اُس کی آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں اور پیشانی کے شکن گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

اُس نے ایک اور گھونٹ لینے کے لیے پیالی سے ہونٹ لگاتے ہی تھے کہ اس طرح پیچھے ہٹ گیا جیسے چائے بہت گرم تھی۔ وہ اپنے آپ میں ایک ہلچل محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر خلا میں گھورا جیسے کسی چیز کو دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"ناز! میں چائے نہیں پیوں گا" — جیدا نے قدرے اداس سے لہجے میں کہا۔

"کیوں؟ ٹھنڈی ہو گئی ہے؟"

"نہیں!"

"گرم تو ہے، پی لو"

"نہیں، نہیں.... میں نہیں پیوں گا"

"آخر کیوں؟.... اچھی نہیں بنی؟"

"صرف اس لیے کہ یہ بہت اچھی بنی ہے ناز" — اس کے لہجے میں دکھ سا پیدا ہونے لگا۔ ذرا سوچ کر پوچھا — "اِس چائے میں کیا ہے؟" — پھر بلند آواز سے بولا — "ناز! لے جاؤ یہ چائے مجھے ہوٹل کی چائے منگوا دو"

اُس کی آواز میں عجیب سا اتار چڑھاؤ تھا جو ناز نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی باتیں سننے لگی اور اس کی اندرونی کیفیت کسی حد تک سمجھنے بھی لگی۔

جیدا نے افسردہ سے لہجے میں کہا — "مجھے ہوٹل کی چائے لا دو۔ کسی گندے سے باورچی کے ہاتھ کی بنی ہُوئی چائے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں کی استعمال کی ہُوئی اور پھینکی ہُوئی پتی کی بنی ہُوئی چائے جس سے بدبُو اٹھ رہی ہو.... تمھاری چائے میں خوشبو ہے ناز! یہ نئی اور خوبصورت پیالی میں ہے مجھے ٹوٹے ہُوئے گلاس میں چائے پلاؤ جیسے ہوٹلوں میں ہوتے ہیں"

وہ خاموش ہو گیا۔ اُس پر دیوانگی سی طاری ہونے لگی۔ پوچھا — "یہ کیسی خوشبو ہے ناز؟.... سچ بتاؤ اس چائے میں تم نے کیا ڈالا ہے؟"

ناز نے اُسے نظریں بھر کر دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ناز کے دلفریب ہونٹوں پر ایسا تبسّم تھا جیسے بچہ خواب میں مسکرا رہا ہو۔ جیدا کو معلوم نہ تھا کہ وہ ہتھکڑیاں توڑ سکتا ہے، یادوں کے ڈھلے گے نہ توڑ سکے گا جس ماضی کو اُس نے جانے کہاں پھینک رکھا تھا وہ چائے کے لطیف دھوئیں میں لہرا رہا تھا۔ چائے کے ایک گھونٹ سے ہی اس کی ہمت پست ہوتی جا رہی تھی۔

"کیا ڈالا ہے تم نے اس چائے میں؟" — جیدا نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"عورت کی محبت!" — ناز نے رومانی سے انداز میں کہا۔

"ہوں" — جیسے جیدا نے اپنے آپ سے کہا ہو — "مجھے کچھ یاد آ رہا ہے۔ ایک واردات....

بھولی بسری ایک بات.... مجھے کیا یاد آیا چاہتا ہے ناز؟" — وہ ذرا بلند آواز سے بولا — "بتاؤ ناز! بتاؤ۔ میں یہ پیالی توڑ دوں گا۔ چائے کے اس گھونٹ نے میرے سینے میں آگ لگا دی ہے"

اگر جیدا کے شاگرد اُسے اس حالت میں دیکھتے تو کبھی نہ مانتے کہ یہ جیدا ہے۔ اُن کا استاد جیدا کبھی یوں ڈگمگا نہیں سکتا۔ وہ کبھی دورا ہے پر کھڑا نہیں ہُوا تھا۔

ناز نے بایاں بازو جیدا کے کندھے پر اس طرح رکھ دیا کہ بازو اُس کی گردن کے گرد گھیرا بناتا ہُوا اس کے بائیں گال کو چھونے لگا۔

جیدا عورت کے لمس سے ناواقف نہیں تھا۔ اس نے عورتوں کی خرید و فروخت کا کاروبار بھی کیا تھا۔ وہ اس مخلوق میں سے تھا جو عورت کو ہی تفریح کا ذریعہ سمجھتی ہے مگر وہ عورت کے جذبات بھرے لمس سے آشنا نہ ہُوا تھا، یا وہ اس لمس کو بھول چکا تھا جس کا تعلق جسم کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اب وہ ایک نئی دنیا میں داخل ہو رہا تھا جس میں وہ داخل نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن کوئی قوت یا کوئی کمزوری اسے آگے ہی آگے دھکیل رہی تھی۔

"کوئی عورت یاد آتی ہو گی تمہیں!" — ناز نے اس پر جھکتے ہوئے کہا — "شاید کوئی بہن.... شاید ماں.... یا بستا رستا ایک گھر!"

جیدا نے اُس کی طرف دیکھا۔ ناز کی سانسیں اس کی پیشانی پر بکھرنے لگیں۔ ریشمی دوپٹہ اس کے گالوں کو چھونے لگا۔ جیدا نے عورت کی عریانی دیکھی تھی مگر مستورِ نسائیت کے لطیف لمس کی قیامت خیزی کبھی نہ دیکھی تھی۔ ناز کی گرم سانسوں نے اور دوپٹے کے لمس نے اُسے دیوانہ بنا ڈالا۔ وہ اپنے آپ میں نہ رہا۔ کسی پر رحم نہ کرنے والے خوفناک مجرم کی ذہنی حالت قابلِ رحم ہو گئی۔

"کیا کہا تم نے؟" — اُس نے دُکھے ہُوئے لہجے میں پوچھا — پھر کہو ناز! شاید کوئی بہن.... بستا رستا ایک گھر.... شاید ایک ماں...." اس نے گال اور آگے بڑھا دیا۔ شاید اس لیے کہ دوپٹہ پوری طرح اُس کے گالوں کو چھُو سکے۔

ناز کے دوپٹے نے جیدا کے ماضی کا گھونگھٹ اٹھا دیا — بچہ شاید ماں کے دوپٹے سے کھیل رہا تھا — جیدا نے آہستہ سے اپنا ہاتھ سرکایا اور ناز کے میز پر رکھے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"میرے دل میں یہ بوجھ کیسا ہے؟" — اُس نے ناز کے ہاتھ کو دباتے ہُوئے کہا — "جیسے میں ڈر رہا ہوں"

"بہک گئے ہو جیدے؟" — ناز اُس پر اس قدر جھک گئی کہ اُس کی پیشانی کے بال جیدا کی پیشانی کو چھونے لگے۔ بولی — "تم اور ڈر؟"

جیدا نے اپنا سر اور دایاں گال پوری طرح ناز کے ساتھ لگا دیا۔ اُس پر خاموشی سی طاری ہو گئی۔ اُس نے آہستہ آہستہ سر گھمایا تو اس کی نظریں اپنے ہاتھ پر پڑیں جس میں اُس نے ناز کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ اُس نے تیزی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

طلسم ٹوٹ گیا۔

پیار نے جس بھیڑیے کو سُلا دیا تھا، وہ جاگ اُٹھا۔

"نہیں! نہیں!" — وہ غم آلود غصے میں بولا — "مت یاد دلاؤ مجھے.... لے جاؤ یہ چائے....

عورت کی محبت ....ایک ڈھونگ، ایک فریب .... وہ زمانہ بیت گیا... پچیس برس گزر گئے ہیں میں اب لوٹ کے اتنی دور نہیں جانا چاہتا"۔۔۔ اس نے میز سے خنجر اُٹھا کر کہا ۔"اس محبّت کو اور گزرے اُس زمانے کو میں نے اس خنجر کی نوک پر رکھ دیا ہے۔"

"جیدا!"۔۔ ناز نے اُس کا چہرہ ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا ۔"تمہیں محبت کی سرخوشی کبھی نصیب نہیں ہُوتی۔ تم نے شاید محبت کی نہیں۔ دیکھی نہیں .... میں تمہیں وہ محبت دے دوں؟"

اب جو دونوں کی آنکھیں ٹکرائیں تو جیدا کے وجود میں زلزلے بپا ہونے لگے، پھر ایک جان لیوا کشمکش!

"لو چائے پی لو"۔۔ ناز نے پیالی سرکاتے ہُوئے کہا ۔"طبیعت سنبھل جائے گی... شراب میں کیا رکھا ہے۔"

اگر ناز اُس کا چہرہ چھوڑ کر پیالی آگے نہ سرکاتی تو شاید یہ طلسم کچھ دیر اور قائم رہتا اور جیدا مسحور ہو کر گھٹنوں کے بل آجاتا۔

"نہیں!"۔۔ وہ قدرے دکھے ہوئے مگر سنبھلے ہُوئے لہجے میں بولا ۔"لے جاؤ۔ اٹھا لو.... ان برتنوں کی چمک میں مجھے وہ دنیا نظر آتی ہے جسے میں چکنا چور کر دینا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنی ہی دنیا میں رہنے دو ناز!"

وہ ایک دم اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"۔۔ ناز نے اُسے روکتے ہوئے پوچھا۔

مگر وہ بھیڑیئے کی طرح ایک ہی جست میں کمرے سے نکل گیا۔

"اپنی دنیا میں"۔۔ ناز نے بھٹکتی ہوئی سی گونج سنی پھر یہ گونج بھی جیسے جیدا کے ساتھ ہی باہر نکل گئی ہو ۔"اپنی دنیا میں۔"

رات آدھی گزر گئی۔۔ ناز جیدا کے انتظار میں بے تاب تھی۔ چائے کے برتن ابھی تک میز پر ہی رکھے تھے۔ ناز جانتی تھی کہ جیدا کی واپسی غیر یقینی ہے۔ وہ آتے نہ آتے، اپنے ہی کسی اڈے یا کسی رنڈی کے کوٹھے پر جا سویا ہوگا۔ اُس کی دنیا وسیع تھی اور ٹھکانے بےشمار لیکن ناز شدت سے محسوس کر رہی تھی کہ وہ آج کی رات اکیلے نہیں گزار سکے گی، اُسے نیند نہیں آئے گی اور جیدا نہ آیا تو رات بھر بےچین رہے گی۔ بیقراری نرالی سی تھی۔ رہ رہ کے اُس کی نظریں دروازے پر جا ٹھہرتی تھیں۔ ہر آہٹ اُسے جیدا کی آہٹ معلوم ہوتی تھی۔ چارپائی پر بیٹھتی تھی تو اچک کے اٹھ کر صحن میں نکل جاتی تھی۔ دروازے سے جا کان لگاتی پھر لوٹ آتی تھی۔ اُس نے اپنے آپ میں رقابت کی چنگاری سلگتی محسوس کی اور وہ اور زیادہ بیتاب ہونے لگی۔

وہ اُکتا کر دھڑام سے چارپائی پر بیٹھ گئی اور اس کا دماغ اپنے آپ ہی کسی اور طرف ہو گیا۔ اُسے یاد آ گیا کہ وہ تو اپنے آپ کو امیروں وزیروں کی چیز سمجھا کرتی تھی، سوسائٹی میں اُس کی بڑی مانگ تھی مگر وہ کسے چاہنے لگی ہے؟۔۔ اس خیال سے وہ جھینپ گئی اور یہ جھینپ بڑی تکلیف دہ تھی۔

اُس نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ وہ اس چرسی، شرابی غنڈے کو نہیں چاہتی اور اسے دھوکہ دے کر یہاں سے بھاگ نکلے گی۔۔ مگر اپنی سوسائٹی کو کیا بتائے گی کہ اتنا عرصہ کہاں رہی؟۔۔ اس سوال نے جیسے اُس کے پر نوچ لیے ہوں۔ وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

وہ اپنی سوچوں میں اس طرح الجھ گئی جیسے دوپٹہ خاردار جھاڑی میں الجھ جاتا ہے۔ ایک طرف سے الگ کرو تو دوسری طرف کے کانٹے اسے پکڑ لیتے ہیں۔

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا۔ ناز نے چونک کے دیکھا۔ جیدا کھڑا تھا۔ آنکھیں چڑھی ہُوئی، سر ڈول رہا تھا۔ چہرہ شراب کی گرمی اور نشے سے سرخ ہو رہا تھا۔ ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ ناز اٹھی مگر آگے نہ بڑھی۔

جیدا نے کواڑ کا سہارا لیا۔ پھر ڈولتے ڈگمگاتے قدموں سے آگے بڑھا۔ اُس کا جسم شل تھا۔ دو ہی قدم اٹھاتے ہوں گے کہ وہ بُری طرح ڈولا جیسے گر پڑے گا۔ سر سنبھل نہیں رہا تھا۔ ناز نے لپک کر اُسے تھام لیا اور چارپائی کی طرف لے جانے لگی۔ جیدا کا بےجان جسم ناز پر گرا جا رہا تھا۔

یہ دوسرا موقعہ تھا کہ ناز اور جیدا کا جسم اس حد تک ایک دوسرے کے قریب آئے تھے، ورنہ جیدا ناز کے جسم سے دور ہی رہا تھا۔ نیپیئر روڈ والے کمرے میں بھی اُس کے قریب نہیں گیا تھا اور اُسے اپنے کمرے میں قید رکھ کر بھی اُس کے جسم سے دور رہا تھا۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ وہ ناز کو اچھا لگنے لگا تھا۔

آج رات جب جیدا کا جسم بےلس ہو کر مکمل طور پر ناز کے بازوؤں میں آیا تو اُسے ایسا سکون محسوس ہُوا جو اس کی روح تک اُتر گیا اور چند لمحے پہلے اُس کے دماغ میں جو سوچیں آئی تھیں، وہ دھوپ کے سامنے دھند کی طرح اُڑ گئیں۔ جیدا کے منہ سے بدبو کے بھبھوکے نکل رہے تھے لیکن ناز جیسے اس بدبو سے بےنیاز اور لاتعلق ہو گئی تھی۔

چارپائی کے قریب پہنچ کر اُس نے جیدا کو لٹا دینا چاہا مگر غیر ارادی طور پر رک گئی۔ اس نے جیدا کے ماتھے تلے ہاتھ رکھ کر اس کے ڈھلکے ہُوئے سر کو اوپر اٹھایا اور اپنا گال اس کی پیشانی پر اس قدر زور سے دبایا کہ

وہ چونک اٹھی۔

"خدا جانے کتنی کچھ پی آتے ہو"۔۔۔ ناز نے اسے چارپائی پر لٹاتے ہوئے کہا۔۔۔ "اپنی بھی کچھ ہوش رکھا کرو۔"

جیدا سننے اور سمجھنے کی حالت میں نہ تھا۔ ناز جانتی نہ تھی کہ ایسے مدہوش آدمی کو کس طرح سنبھالتے ہیں وہ اُسے ہوش میں لانا چاہتی تھی ورنہ وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ سو نہ سکے گی۔ وہ اپنے آپ میں ایسا جذبہ سوس کر رہی تھی جس میں بیوی کی محبت تھی، بہن کا پیار اور ماں کا ایثار تھا۔

وہ اُسے اچھی طرح لٹا کر باورچی خانے میں گئی اور پیالے میں پانی بھر لائی۔ جیدا کے سرہانے بیٹھ کر رومال پانی میں بھگویا اور تہ کر کے اس کے ماتھے پر رکھ دیا۔ جیدا اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا تھا۔

رات گذرتی چلی گئی۔ ناز جیدا کا سر اپنے زانو پر رکھے اس کی پیشانی کو سہلاتی بھی رہی اور بھیگے ہوئے رومال سے ٹھنڈک بھی پہنچاتی رہی۔ وہ اُس پر کتنی بار جھکی۔ اسے شراب کی بُو بُری نہ لگی۔

بتی کا تیل ختم ہو گیا۔ شعلہ کانپا اور آہستہ آہستہ بجھ گیا۔ اس اندھیرے میں کس قدر قرار تھا، اس شب بیداری میں کس قدر لذّت تھی۔ جیدا کا سر گود میں رکھے اس کی خدمت میں کس قدر سکون تھا۔ ناز ایسے سرور سے مدہوش ہونے لگی جس کا ذائقہ اس نے پہلے کبھی نہ چکھا تھا۔

صبح کی سپیدی کمرے میں داخل ہوئی تو ناز نے جیدا کا سر نہایت آرام سے اپنی گود سے ہٹا کر سرہانے پر رکھ دیا اور باورچی خانے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد لڑکا کمرے میں داخل ہُوا۔ اُس نے چھوٹی میز چارپائی کے قریب رکھی اور کرسی بھی اُس کے ساتھ رکھ کر چلا گیا۔

چند منٹ بعد ناز کمرے میں آئی۔ ہاتھ میں ناشتہ تھا۔ ٹرے میز پر رکھ کر جیدا کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ لڑکا پانی سے بھرا بیسن اور تولیہ اُٹھائے کمرے میں آیا۔ بیسن چارپائی کے پاس اور تولیہ چارپائی پر رکھ کر چلا گیا۔

جیدا نے آنکھ کھولی۔

"شمی!"۔۔۔ جیدا نے آہستہ سے کہا۔ سر کو ذرا سا گھما کر بلند آواز سے بلایا۔۔۔ "شمی!"

ناز سامنے آ گئی۔

"اوہ ناز!"۔۔۔ وہ حیران سا ہو کر اُٹھ بیٹھا۔ بستر کو دیکھا، کمرے کو دیکھا، پھر ناز کو دیکھا۔

"لو منہ ہاتھ دھو لو"۔۔۔ ناز نے بیسن آگے سرکاتے ہوئے کہا۔

جیدا حیرت زدگی کے عالم میں ناز کو دیکھ رہا تھا۔ ناز اس کی کیفیت سمجھ رہی تھی۔ اس نے بیسن اُس کے پاؤں میں رکھ کر اُس کے سر کو جھکا دیا۔

"اِتنے بڑے ہو گئے، ابھی منہ ہاتھ دھونے کی تمیز نہیں آئی"۔۔۔ ناز نے اُس کا سر اور جھکاتے ہوئے بیسن سے چلّو بھر بھر کے اس کے منہ پر چھینٹے مارے اور بچے کی طرح اُس کا منہ دھو ڈالا۔ پھر اس کا چہرہ اُوپر کر کے تولیے سے صاف کیا اور تولیہ اُس کے کندھے پر ڈال دیا۔

ناز نے یہ سب کچھ اس قدر چستی اور جلدی سے کیا کہ جیدا کو مزاحمت کرنے یا کچھ کہنے یا سوچنے کی فرصت

ہی نہ ملی۔ ناز کی اس بے تکلفی اور بیساختگی میں ایسا اثر تھا کہ جیدا دم بخود سا ہو گیا۔ شمی، گلّی، بالی اور گلنار نے اسے ہر طرح کی جسمانی لذّت اور مسرت دی تھی لیکن آج ناز کے والہانہ انداز میں اُس نے جو راحت اور سرخوشی محسوس کی وہ اس کے لیے انوکھی تھی۔ اُس کی حالت اُس انسان کی سی ہونے لگی جس نے پہلی بار شراب پی ہو۔ دل پر لغزش کا بوجھ، دماغ میں خمار۔

"لو ناشتہ کر لو"۔۔۔ ناز نے کہا۔

"یہ برتن کہاں سے آتے ہیں؟"۔۔۔ جیدا نے تعجب سے پوچھا۔

"تم نے کل اتنے سارے پیسے جو دیے تھے"۔۔۔ ناز نے کہا۔۔۔ "میں نے یہ برتن اور دو چار اور چیزیں منگوا لی ہیں۔"

"میں رات یہیں سویا تھا؟"

"ہاں!"

"اور تم؟"

"فرش پر۔"

"مجھے یہاں کون لے آیا تھا؟ میں تو شمی کے پاس تھا۔"

"تم خود ہی آتے تھے۔"

"تم فرش پر کیوں سوئی تھیں؟"۔۔۔ جیدا نے ایسے لہجے میں کہا جیسے ناز کا فرش پر سونا اُسے ناگوار گزرا ہو۔ اس کے لہجے میں اُنس کی جھلک بھی تھی۔ بولا۔۔۔ "مجھے اُس کمرے میں کیوں نہ پھینک دیا۔"

"پتھر تو نہیں ہو تم کہ پھینک دیتی"۔۔۔ ناز نے پیار سے کہا۔

"تو اور کیا ہوں میں؟"۔۔۔ وہ ناز کی طرف دیکھ کر ایک لمحہ چپ رہا پھر قدرے دکھے ہوتے لہجے میں بولا۔۔۔ "ناز! میں پتھر ہی ہُوں۔"

"لیکن تم انمول پتھر ہو"۔۔۔ ناز نے شگفتہ مزاجی سے کہا اور اُسے اپنی انگوٹھی کا نگینہ دکھا کر بولی۔۔۔ "یہ بھی تو پتھر ہی ہے۔"

"ناز!"۔۔۔ جیدا نے آہ لے کر کہا۔۔۔ "مجھ پر ایک کرم کرو۔۔۔ میری ایک بات مان لو۔"

"کیا؟"

"مجھے میری ہی زندگی جینے دو"۔۔۔ جیدا نے کہا۔۔۔ "میں آشیانے اجاڑتا ہوں بناتا نہیں ہُوں۔"

"یہ بھی کوئی جینا ہے؟"

"دیکھ لو، جی رہا ہوں۔"

"تم سو آشیانے اجاڑو جیدا! سو آشیانے جلا دو، صرف ایک آشیاں مجھے آباد کر لینے دو اور اسے آباد ہی رہنے دو۔۔۔ چائے پیو، ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

جیدا نے چائے کی پیالی اٹھائی۔ ایک گھونٹ پیا اور ٹوسٹ اٹھا کر کہا۔۔۔ "میں کسی کے خون سے اپنے ہاتھوں میں مہندی نہیں لگاؤں گا۔ میں رستے بستے گھرانوں کو لوٹتا ہوں پھر خود لُٹ جاتا ہوں۔ ہزاروں روپے دوستوں اور رنڈیوں کو دے آتا ہوں، شراب پی لیتا ہوں، چرس پی لیتا ہوں۔"

"جو جی میں آتے کرو جیدا" — ناز نے چپ ہو کر نظریں جھکا لیں۔ دو چار ثانیے بعد نظریں اٹھا کر ملتجی لہجے میں بولی — "مجھے یہ گھر بسا لینے دو۔ پھر تم کبھی کبھی، جب تمہیں کبھی فرصت ملے، رات کی طرح نشے میں لڑکھڑاتے یہاں آ گرا کرو۔ میں تمہیں تھام کر گود میں سُلا لیا کروں گی۔ تم نقب لگا کے آؤ، خون کر کے آؤ لیکن یہاں آ جایا کرو۔ میں تمہاری راہ میں نہیں آؤں گی، تمہاری راہ دیکھا کروں گی۔ مجھے ایک عارضی سی منزل سمجھ لو جیدا! دم بھر کو ستا لیے اور آگے چل دیئے۔"

"میں تمہاری ان باتوں کو سمجھتے ہُوئے بھی ان کا مطلب نہیں سمجھتا۔"

"کیونکہ تم سمجھنا نہیں چاہتے" — ناز نے کہا — "تم اپنا روپ بدلنا نہیں چاہتے۔"

"اوہ" — جیدا نے طنزیہ لہجے میں کہا — "تم میرا روپ بدلنا چاہتی ہو۔ کل مجھے لیکچر دو گی کہ جیب تراشی اور چوری چکاری گناہ ہے۔"

"نہیں" — ناز نے جذباتی سے لہجے میں کہا — "میں تمہارا روپ نہیں بدلوں گی۔ لیکچر نہیں دوں گی۔ میں بھی گناہ گار ہُوں، تم بھی گناہ گار ہو۔ گناہ کو گناہ سے پیار ہوتا ہے۔ انسان ایک گناہ کر کے دوسرا گناہ یہ کرتا ہے کہ جھوٹ بولتا ہے کہ اُس نے گناہ نہیں کیا۔ گناہ کو گناہ چھپا سکتا ہے، جس طرح تم نے مجھے چھپا رکھا ہے اور میں تمہیں اپنے سینے میں چھپا لینا چاہتی ہوں۔"

پیالیوں میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ کراچی کا شور اُبھرتے سورج کے ساتھ ابھرتا آ رہا تھا۔ جیدا اور ناز ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے اپنا اپنا دل کھول کر ایک دوسرے کو دکھا رہے تھے۔ ناز کی آنکھوں میں شب بیداری کی تکان خمار بن کر اُس کے حسن کو سحر انگیز بنا رہی تھی۔ بکھرے بکھرے بے ترتیب بال اسے نیا روپ دے رہے تھے۔ جیدا پہلی بار محسوس کرنے لگا تھا کہ ایک زنجیر اُس کے گرد لپٹی جا رہی ہے اور وہ آزاد ہونے کو ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔

"ایک منزل!" — جیدا نے زیرِ لب کہا۔ پھر ایک لمبی آہ لے کے بولا — "میری راہیں منزل کے قریب سے ہمیشہ آزاد رہی ہیں ناز! میں رات تم سے بھاگ گیا تھا۔ صرف اس لیے کہ مجھے تمہاری ذات میں، تمہاری مسکراہٹ میں، تمہاری ہر بات میں اور چائے کی پیالی میں منزل کی بو آتی تھی.... ایک کھوئی ہوئی، چھنی ہوئی منزل کی بُو.... مجھ سے بہت کچھ چھین لیا گیا تھا ناز! اُس وقت میں ذرا جتنا بچہ تھا۔"

"تم تو اب بھی بچے ہی ہو" — ناز نے مسکرا کر اُس کی مزاجی تلخی کو ذرا کم کرنے کی کوشش کی۔ بولی — "چائے پیو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

جیدا نے پیالی کو دیکھا، چند لمحے دیکھتا رہا۔ پھر غٹا غٹ پوری پیالی پی لی اور پیالی پرچ میں رکھنے کی بجائے ناز کی طرف بڑھا دی۔ ناز نے پیالی پھر بھر دی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" — ناز نے کہا — "اتنی جلدی اداس نہ ہو جایا کرو۔ تم جیسے آدمی کو تو ہنستے کھیلتے رہنا چاہیئے۔"

جیدا نے یہ پیالی بھی پی ڈالی۔

"کچھ پیسے ہیں؟" — ناز نے پوچھا۔

"شام کو مل جائیں گے" — جیدا نے کہا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

جیدا کمرے میں داخل ہُوا تو منّا اور ٹیپو جاگ اُٹھے تھے۔ اُسے دیکھ کر تھکی تھکی سی انگڑائیاں لیں اور اُٹھ بیٹھے۔ منّے نے سرہانے کے نیچے سے چرس کی گولی نکالی پھر سگریٹ میں سے تمباکو نکالنے لگا۔

"ابّن کے بال بچوں کو کسی اور جگہ منتقل کر دو" — جیدا نے ان کے پاس بیٹھتے ہُوئے کہا۔

"کس جگہ؟" — منّے نے پوچھا۔

"تم دیکھ لو نا! کون سی جگہ مناسب ہے" — جیدا نے کہا — "پولیس کو پتہ نہ چلے۔"

"کوئی جھگی خالی کروا لیں؟" — ٹیپو نے پوچھا۔

"دیکھو!" — جیدا نے ذرا سوچ کر جواب دیا — "تین نمبر اڈہ کیسا رہے گا؟ دوسرے دونوں اڈوں کا پولیس کو علم ہے، تیسرا خالی کرا لو۔"

"ہاں!" — منّے نے چرس بھرے سگریٹ کا کش لگا کر کہا — "وہ جگہ بھی اچھی ہے اور استاد! وہاں جواہی تو کوئی آتا نہیں۔ سب دوسرے اڈوں پر جاتے ہیں۔"

"ہزار روپے کی ٹکیاں لے لینا" — جیدا نے منّے کے ہاتھ سے سگریٹ لیتے ہوئے کہا — "لیکن رات بہت دیر بعد۔ اور یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں کہ ابّن کی بیٹی یا بیوی کو...."

"ہمیں بادل سمجھ لیا ہے استاد؟" — ٹیپو نے سنجیدگی سے کہا۔

"دوسری بات!" — جیدا نے چرس کا دھواں اگل کر سگریٹ ٹیپو کی طرف بڑھایا اور بولا — "اپنے پاس پڑھا لکھا اور دیانت دار لونڈا کون سا ہے؟"

"سارے سبھی پڑھے لکھے ہیں" — ٹیپو نے جواب دیا۔

"دیانت دار تو وہ ہے" — منّا بولا — "کیا نام ہے اُس کا.... ارے وہی جس نے اُس روز آٹھ سو کا ہاتھ مارا تھا۔"

"کون؟ غوثا؟"

"ہاں! وہی!"

"اُسے ابّن کے خاندان کی دیکھ بھال پر لگا دو" — جیدا نے کہا — "اور اُسے صرف اسی کام پر لگا رہنے دو۔"

"غلط بات!" — ٹیپو نے مخالفت کی۔ بولا — "یہ کام لونڈوں چھوکروں کا نہیں۔ تمہیں لڑکی کا خیال ہے تو لونڈے کو وہاں نہ بھیجو" — ذرا سوچ کر کہنے لگا — "میں خود سنبھال لوں گا۔ تم مجھے بتا دینا وہاں کرنا کیا ہے۔"

"ہاں استاد! لونڈا بیکار ہو جاتے گا" — منّے نے کہا اور ٹیپو کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر ایک ہی کش میں ختم کر ڈالا۔

"اور سنو!" — جیدا نے کہا — "اس کے بچّوں کو سکول داخل کرا دینا۔ ان کے پاس روپیہ ہے۔ خیر۔ روپے پیسے کا معاملہ میں خود سنبھال لوں گا" — وہ اُٹھ کھڑا ہُوا اور بولا — "ابّن کے سمن شاہ کے تھانے میں ہیں۔ اُسے کہنا دو چار سو لے لو اور سمن عین غین کر دو۔ ابّن کے متعلق پوچھے تو کہنا ہمیں اس کا کچھ پتہ نہیں۔"

جیدا باہر نکلنے لگا تو رک گیا اور بولا — "اپنے تمام چھوکروں سے کہہ دینا کہ اپنے علاقے سے باہر نہ جایا کریں۔ پرسوں بشیرے نے گلہ کیا تھا کہ ہمارا ایک چھوکرا اُس کے علاقے میں سے دو سو کی آسامی مار لایا ہے۔

یہ حرکت ٹھیک نہیں۔ اگر آسامی ہاتھ سے نکل جاتے تو جانے دو۔ دوسرے کے علاقے میں مت جاؤ۔ وہاں کے استاد کو خبر کر دو جیبیں کاٹو، ایمان مت خراب کرو۔ میرا سر دوسروں کے سامنے نیچا نہ کرو۔"

وہ بات کر ہی رہا تھا کہ ناز کا خدمت گار لڑکا ہاتھ میں مُنّے اور ٹیپو کے لیے ناشتہ اٹھائے کمرے میں داخل ہُوا۔ یہ ناز نے بھجوایا تھا، ورنہ وہ لوگ تو ناشتے کی پابندیوں سے آزاد تھے۔ اُنہوں نے نئی پرچ پیالیاں دیکھیں، ٹوسٹ دیکھے تو وہ بجائے خوش ہونے کے سنجیدہ ہو گئے۔

"یہ کیا ہے؟"۔۔۔ مُنّے نے جیدا سے پوچھا۔

"ناشتہ ہے تمہارا!"۔۔۔ جیدا بولا۔ "ناز نے بھیجا ہے۔"

مُنّے اور ٹیپو نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور یوں اپنے درمیان رکھی ٹرے کی طرف ہاتھ بڑھائے جیسے خلافِ مرضی اپنے استاد کے حکم کی تعمیل کر رہے ہوں۔ جیدا کمرے سے نکل گیا۔

جیدا سورج غروب ہونے کے بعد واپس آیا۔ وہ جلدی میں تھا۔

"تمہیں کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟"

ناز اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھی خیالوں میں گم تھی کہ جیدا کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"اوہ تم آ گئے!"۔۔۔ اُس نے اٹھتے ہُوئے کہا۔ "پیسے؟.... جتنے دے سکو۔"

جیدا نے پتلون کی جیب سے پانچ اور دس دس کے بہت سے نوٹ بے پروائی سے اس کے سامنے پھینک دیتے۔

"کِس کا گھر اجاڑا ہے؟"۔۔۔ ناز نے پوچھا۔

"یہ چوری کا مال نہیں"۔۔۔ جیدا نے کمرے میں ٹہلتے ہوتے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ حلال کی کمائی ہے۔"

"حلال کی کمائی؟"۔۔۔ ناز ہنس دی۔ بولی۔ "اور تمہاری جیب میں؟"

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"۔۔۔ جیدا اور سنجیدہ ہو گیا۔ بولا۔ "فلاش میں جیتا ہوں"۔۔۔ اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ رک کے پوچھا۔ "میں جا رہا ہوں.... اور کچھ چاہیئے؟"

"تم خود ہی آجانا"۔۔۔ ناز نے شرارت آمیز مسکراہٹ سے کہا۔

"میں کسی کام کی چیز تھوڑے ہی ہوں"۔۔۔ جیدا نے کہا۔

"تو کوئی کام کے دو آدمی بھیج دینا۔"

"کام کیا ہے؟"

"یہ مت پوچھو"۔۔۔ ناز نے چہکتے ہُوتے کہا۔ "اور تم گھبراؤ نہیں میں بھاگوں گی نہیں۔ کچھ فرنیچر منگواؤں گی۔"

جیدا کے ماتھے کے شکن ذرا گہرے ہو گئے۔ اس نے ناز کو دیکھا اور باہر نکل گیا۔

وہ رات کو نہ آیا۔ صبح بھی نہ آیا۔ ناز نے رات کو گھر کے کچھ سامان کی فہرست بنالی تھی۔

صبح جیدا کے بھیجے ہوتے دو آدمی آ گئے۔ ناز نے انھیں فہرست دے کر چند ایک ہدایات دیں اور رقم ان کے حوالے کر دی۔ پھر اپنے خدمت گار لڑکے کو ساتھ لے کر بغلی کمرے کو کھولا جو اس سے

پہلے کبھی نہیں کھولا گیا تھا۔ وہاں چند ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائیاں رکھی تھیں اور تمام کمرہ جالوں سے ڈھکا ہُوا تھا۔ ناز نے لڑکے کو ساتھ لگا کر دونوں کمروں کی خوب صفائی کی چھت اور دیواریں تک جھاڑ ڈالیں۔

رات کا پہلا پہر گزر رہا تھا جب جیدا واپس آیا۔ مُنّا اور ٹیپو بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہ بھی تمام دن غائب رہے تھے۔ جیدا اپنے کمرے میں داخل ہُوا تو ٹھٹھک کے رہ گیا۔ پھٹی پھٹی نظروں سے کمرے کو دیکھنے لگا۔ ناز کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اُس کا حال حلیہ ملبے سے نکالی ہُوئی لاش سے ملتا جلتا تھا۔ وہ ابھی ابھی کمروں کی جھاڑ پونچھ اور سجاوٹ سے فارغ ہُوئی تھی۔

جیدا اپنے کمرے کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے غلطی سے کسی اور گھر میں آن گھسا ہو۔ اس کے کمرے میں سفیدی نہیں ہُوئی تھی۔ کواڑوں پر رنگ نہیں ہُوا۔ ناز نے وہاں صوفے نہیں رکھے تھے۔ قالین نہیں بچھائے تھے۔ ریشمی پردے نہیں لٹکائے تھے۔ کمرے میں عطر کی خوشبُو نہیں تھی۔ وہاں صرف یہ انقلاب آیا تھا کہ جالے صاف ہو گئے تھے اور دیواریں جھاڑ دی گئی تھیں۔ کواڑ دھل گئے تھے۔

اس صفائی کے علاوہ کمرے میں یہ تبدیلی آئی تھی کہ جیدا کی صدیوں پرانی میز اور پرانی کرسی وہاں نہیں تھی۔ جیدا جب اس کرسی پر بیٹھ کر کہنیاں میز پر رکھا کرتا تو میز اور کُرسی دائیں بائیں ہلتے رہتے تھے۔ ان دونوں کی جگہ اب وہاں نئی میز اور نئی کرسی رکھی تھی۔ دیوار کے ساتھ لکڑی کی چھوٹی سی الماری رکھی تھی۔ کمرے کے درمیان معمولی سی مگر نئی تپائی پڑی تھی۔ دوسری دیوار کے ساتھ نیا پلنگ پڑا تھا اور اس پر نیا پلنگ پوش تھا۔

"تُو نے میرا کمرہ اجاڑ کے ہی دم لیا"۔۔۔ جیدا نے اداس سی سنجیدگی سے کہا۔

ناز نے آگے بڑھ کر جیدا کو کلائی سے پکڑا اور دوسرے کمرے میں لے گئی۔ وہاں دو نئے پلنگ رکھے تھے۔ ان کے درمیان ایک تپائی تھی اور تپائی پر مصنوعی پھولوں کا گلدستہ تھا۔ دیواروں کے ساتھ تصویریں لٹک رہی تھیں۔ جیدا نے ان پر اس طرح نگاہ ڈالی جیسے دیکھ کر بھی نہ دیکھی ہوں۔

ناز اُسے پہلے کمرے میں لے آئی۔

"اب تم اس کرسی پر بیٹھو"۔۔۔ ناز نے کہا۔ "میں کھانا لاتی ہُوں۔"

جیدا کھویا کھویا سا کرسی پر بیٹھ گیا۔ ناز باورچی خانے میں چلی گئی۔ جیدا کے دل و دماغ اس قدر دل فریب تبدیلی کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ اسے پسند بھی کر رہا تھا ناپسند بھی۔ اُس کے اعصاب اس قدر خوبصورت گھر کے متحمل نہیں ہو رہے تھے۔ یہ کوئی بستا رستا گھر تھا۔

جیدا کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ دولت تو ہاتھ کا کھیل تھا۔ مگر دولت کو اُس نے کبھی یوں استعمال نہیں کیا تھا۔ سب کچھ ہوتے ہُوتے بھی وہ گرد سے اٹے ہُوتے فرش پر میلے کچیلے بستر میں ہی سو رہتا تھا۔ آج جب ناز نے اُس کے لیے نواری پلنگ بچھا دیتے اور اس اندھیرے غار کو فرنیچر اور تصویروں سے سجا دیا تو جیدا کی حالت اُس دائمی مریض کی سی ہونے لگی جو برسوں سے پرہیزی غذا کا عادی ہو چکا ہو اور اُس کے پیٹ میں مرغن غذا ٹھونس دی جاتے۔

یہ آباد آشیانہ اُسے پریشان سا کر رہا تھا۔ اس کا دماغ اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اس کا ذہن پلٹ کر ماضی کی منزلیں طے کرنے لگا۔ وہ ایک کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔

اس ذہنی کشمکش میں اُس نے دیوار پر نظر ڈالی اور تصویریں دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں ایک تصویر پر جم

کے رنگین، جواں سال عورت ننھے سے بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ مصوّر نے عورت کے خدوخال میں ممتا کو دل کش رنگوں سے سمویا تھا۔ ایک ایک روئیں سے ممتا پھوٹ رہی تھی۔ بچہ مسکرا رہا تھا۔ ایسی مسکراہٹ جس میں قدرت کی تمام تر مسرتیں اور رعنائیاں رچی ہوئی تھیں۔ عورت کی مسکراتی آنکھیں بچے کو دیکھ رہی تھیں۔

ناز نے یہ تصویر خاص طور پر منگوائی تھی۔ اُسے یاد تھا کہ وہ کتنی بار اپنے بھائی کے ساتھ کراچی آئی تھی تو صدر کے علاقے میں اس نے دو تین دوکانوں میں یہ تصویر دیکھی تھی۔ آج اس نے چھوکرے کو سمجھا بجھا کر بازار بھیجا تھا اور وہ یہ تصویر ڈھونڈ لایا تھا۔

جیدا نے اس تصویر سے نظریں ہٹانے کی کوشش کی مگر ہٹا نہ سکا۔ اُس کے دماغ میں جیسے سوئیاں سی چبھنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ذہن میں بگولے اٹھنے لگے۔ نفرت، حقارت، غصہ۔ انتقام، تلخ کامی، تشنگی اور جانے کیسے کیسے تباہ کن، زہر آلود جذبات جیدا کو جھنجھوڑنے لگے۔ یہ سارا طوفان ایسی تیزی سے اٹھا کہ جیدا سنبھل ہی نہ سکا۔

اُس کی نگاہوں نے اب تصویر سے ہٹنے کی جدوجہد نہ کی۔ جیدا تصویر کو دیکھتا رہا، پھر اُس پر وحشت طاری ہونے لگی۔ وہ ماضی کی کسی ایسی منزل پر پہنچ گیا جو اُس سے چھین لی گئی تھی، جہاں سے اُسے نکال دیا گیا تھا اور اب یہ منزل جل رہی تھی۔

جیدا جل اٹھا۔

وہ تصویر پر نظریں گاڑے ہوئے تھا جیسے تصویر نے اُسے ہپناٹائز کر لیا ہو۔ چہرے پر وحشت اور بربریت کے تاثرات ابھر آئے تھے اور اس کا ایک ہاتھ ناف کی طرف جا رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے پستول سامنے آ گیا۔ جیدا نے پستول تصویر کی طرف کیا اور "دھائیں دھائیں" کے دو دھماکوں نے کمرے کو ہلا کے رکھ دیا۔ ایک گولی ماں کے سینے میں لگی دوسری۔ بچے کی پیشانی کو چیر گئی۔ تصویر کا شیشہ چکنا چور ہو گیا مگر جیدا کا ماضی اُس کے سامنے دیوار کے ساتھ لٹکتا رہا۔

اگر جیدا کچھ دیر اور تنہا رہتا تو جانے کیا کر گزرتا لیکن اسے اتنی مہلت نہ ملی۔ منّا، ٹیپو، دو لڑکے اور ناز گولیوں کی آواز سنتے ہی گولیوں کی طرح کمرے میں آ پہنچے۔

یہ گھر تو جرم و گناہ کا زمین دوز اڈہ تھا جہاں کے مکینوں کو معلوم تھا جانے کس وقت کیا ہو جائے۔

وہ ہر لحظہ چوکس اور تیار رہتے تھے۔ جیدا کے ساتھی مرنے مارنے کے لیے دوڑے آئے تھے لیکن دیکھا جیدا کرسی پر بیٹھا تصویر پر نظریں گاڑھے ہوئے تھا۔ پستول ہاتھ میں تھا اور چہرہ لال سرخ، پیشانی پر پسینے کے قطرے اور دانت انتہائی غصے کی حالت میں پس رہے تھے۔

"کیا ہوا جیدے!"۔۔۔ ناز نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔۔۔ "گولی کیسے چلی؟"

وہ چپ چاپ تصویر کو دیکھتا رہا۔ ٹیپو نے اُسے دیکھا پھر تصویر کو دیکھا۔ وہ بات سمجھ گیا۔ منّا اور ٹیپو اس کے ہمراز تھے، بہت پرانا ساتھ تھا ان کا۔ اس کے مزاج کے زیر و بم کو سمجھتے تھے۔

"جیدے!"۔۔۔ ناز نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔۔۔ "جیدے!"

جیدا چونکا۔ ناز کی طرف دیکھے بغیر اُس نے سر میز پر پھینک دیا اور چہرہ دونوں بازوؤں میں چھپا لیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ کندھوں کی لرزش سے معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی گھگھی بندھ گئی ہے۔

"سب چلے جاؤ"۔۔۔ ٹیپو نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔۔۔ "منّے! سگریٹ بھر لاؤ۔"

لڑکے چلے گئے۔ منا سگریٹ میں چرس بھرنے اپنے کمرے میں چلا گیا اور ناز وہیں کھڑی رہی۔

"تم بھی چلی جاؤ"۔۔۔ ٹیپو نے ناز سے کہا۔

لیکن وہ جانا نہ چاہتی تھی۔ اُس نے ٹیپو کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔۔۔ "میں اسے اس حالت میں چھوڑ کر کیسے چلی جاؤں۔"

"ناز!"۔۔۔ ٹیپو نے جھلّا کر کہا۔۔۔ "تم یہاں سے چلی جاؤ۔"

ناز چلی گئی۔

ٹیپو نے جیدا کے ہاتھ سے پستول لے لیا۔ میز کی دراز سے وہسکی کی بوتل نکالی اور کارک نکال کر بوتل جیدا کے سامنے رکھ دی۔ منّا سگریٹ میں چرس بھر کے لے آیا۔ ٹیپو نے جیدا کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اُس نے سر اٹھا کر ٹیپو کی طرف دیکھا۔ لال سرخ آنکھوں میں آنسو تھے۔ منّے نے سگریٹ سلگا کر اس کی طرف بڑھایا اور ٹیپو نے وہسکی کی بوتل سرکا دی۔ جیدا نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور آہستہ آہستہ دھواں اگلنے لگا۔

ٹیپو نے ماں اور بچے کی تصویر پر نگاہ ڈالی جو ابکیل کے ساتھ ذرا ٹیڑھی ہو کے لٹک رہی تھی۔ پھر اس نے قہر آلود نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا اور منّے کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد ناز ٹیپو کے کمرے میں کھڑی تھی۔ منّا دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے بیٹھا تھا۔ ٹیپو کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اُس کے اترے ہوئے چہرے پر غصّے کا تاثر تھا۔

"آخر ہُوا کیا تھا؟"۔۔۔ ناز نے ان سے پوچھا۔ اس نے پہلے بھی پوچھا تھا لیکن ٹیپو اور منّے نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔

"تم پہلی عورت ہو جس پر استاد نے اتنا بڑا کرم کیا ہے"۔۔۔ ٹیپو نے رک کر کہا۔۔۔ "معلوم نہیں کیوں؟"

میں نے تو کچھ اور پوچھا تھا ٹیپو!"۔۔۔ ناز نے گھر کی مالکن کے انداز میں تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"سُن چھوکری!"۔۔۔ ٹیپو نے اُسے تلخ اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔۔۔ "ہم لوگ سجے سجائے گھروں میں رہنے والے نہیں۔ ہم زمین کی تہوں میں جینے والے انسان ہیں۔ ہم بستے گھروں کو اجاڑتے ہیں۔ گھر بساتے نہیں۔ ہم راتوں کو جاگتے ہیں دن کو سوتے ہیں۔ ہم سونے چاندی سے کھیلتے ہیں لیکن سوتے اس مٹی میں ہیں۔"

"میں جیدا کو اس ذلیل زندگی میں نہیں رہنے دوں گی"۔۔۔ ناز نے ذرا تن کر کہا۔

"تم خطرہ مول لے رہی ہو"۔۔۔ ٹیپو بولا۔

"کیسا خطرہ؟"۔۔۔ ناز نے طنزیہ پوچھا۔۔۔ "اپنی جان کا؟ مجھے اپنے مرجانے کا ڈر نہیں۔"

"تمھارے مرجانے کا کسی کو ڈر نہیں۔ نہ افسوس ہوگا"۔۔۔ ٹیپو نے ناز کو گھورتے ہُوئے کہا۔۔۔ "ہمیں جیدا کے مرجانے کا ڈر ہے۔ وہ جیتے جی مر جائے گا۔"

"وہ تصویریں وہاں سے ہٹا دو"۔۔۔ منّے نے کہا۔

"یہ پلنگ اور کرسیاں وہاں سے اٹھا دو"۔۔۔ ٹیپو نے غصے سے کہا۔۔۔ "یہ ٹھاٹھ جیدا کے لیے موت ہے۔ وہ خودکشی کر لے گا۔ آج وہ اس حالت کو پہنچ گیا تھا۔"

"تصویریں وہیں رہیں گی" ــ ناز نے تلخی سے کہا "سب کچھ وہیں رہے گا۔ یہ جیدا کے لیے ہے"
"پاگل نہ بنو لڑکی! پتھروں سے نہ ٹکراؤ تم ہو کیا؟" ــ ٹیپو نے طنز آلود مسکراہٹ سے کہا۔

ناز کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ جیدا کے کمرے میں بے ہنگم کھٹکا ہُوا۔ ناز دوڑتی پہنچی۔ دیکھا جیدا فرش پر پڑا تھا۔ کرسی ایک طرف گری ہوئی تھی۔ وسکی کی خالی بوتل میز پر پڑی تھی۔ وہ بہت زیادہ پی گیا تھا۔ شراب کے ساتھ وہ چرس بھی پیتا رہا تھا۔ دونوں چیزوں نے مل کر اسے اوندھا کر دیا۔ ناز اسے اٹھانے لگی لیکن اس کا بوجھ اس کی طاقت سے زیادہ تھا۔

منّا اور ٹیپو بھی پہنچ گئے ــ ایک نے جیدا کی ٹانگیں پکڑیں، دوسرے نے بازو اور اُسے لاش کی طرح اٹھا کر پلنگ پر پھینک دیا۔ منّے نے اس کی چپل اتاری اور پتلون کی پیٹی ڈھیلی کر دی۔ ناز کو ان کے اس گنوار پنے پہ غصہ آیا اور جیدا پر افسوس بھی ہُوا۔

"پڑا رہنے دو" ــ مُنّے نے کہا۔

"اس کے مُنہ میں پانی ڈالوں؟" ــ ناز نے گھبراتی ہُوئی آواز میں پوچھا۔

"گھبراتی کیوں ہو؟ .... مرتا نہیں" ــ مُنّے نے طنزیہ لہجے میں کہا ــ "زیادہ پی گیا ہے"

"شراب اور چرس پر ہی تو یہ زندہ ہے" ــ ٹیپو نے بیگانگی سے کہا۔

وہ دونوں اپنے کمرے میں چلے گئے لیکن ناز اپنے آپ میں نہ تھی۔ اُسے یوں لگا جیسے اُس کا واحد سہارا اُس سے چھن رہا ہے۔

اس اندھیرے غار میں جیدا ہی اس کا سہارا تھا۔ منّے اور ٹیپو کے رویّے میں جو غیریت تھی، ناز کو اس سے نفرت تھی۔ جیدا ان دونوں کا استاد تھا لیکن ناز یُوں محسوس کرتی تھی جیسے یہ دونوں جیدا کو خراب کر رہے ہوں۔

وہ جیدا کے سرہانے کھڑی اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے سوچا جیدا پاگل تو نہیں ہو گیا؟ خودکشی تو نہیں کر لے گا؟ ناز کا دل ایسے اذیت ناک خدشوں کو قبول تو نہیں کر رہا تھا لیکن کوائف اور قرائن سرو ہم منوا رہے تھے۔ جیدا نے اپنی پیاری تصویر کو گولی مار کر توڑ ڈالا تھا۔ وہ رویا بھی تھا اور اب وہ بیہوش بھی پڑا تھا اور اس کے ساتھیوں نے اُسے مُردار کی طرح اُٹھا کر پلنگ پر پھینک دیا تھا۔

"آخر یہ سب کیا ہے؟ ایسے کیوں ہُوا تھا؟" ــ ناز بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھی۔ اس انوکھی دنیا میں وہ اجنبی تھی، کچھ بھی نہ جانتی تھی۔ وہ انسانی نفسیات سے بے بہرہ تھی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ جرائم پیشہ انسان نارمل نہیں ہُوا کرتے۔ وہ نیم پاگل ہوتے ہیں۔ وہ تو اپنی نفسیات سے بھی واقف نہیں تھی۔ اسے بھائیوں نے ابنارمل بنایا تھا، اسی لیے اسے ابنارمل آدمی ہی اچھا لگا تھا۔ یہ ذہن لاشعور کی کرشمہ سازیاں تھیں۔

وہ اسی قدر جانتی تھی کہ جیدا بے ہوش ہے۔ بے بس ہے اور وہ خود اس سے کہیں زیادہ بے بس ہے۔ اُس نے پہلی بار محسوس کیا جیسے جیدا سے اُسے بے پناہ محبّت ہے اور وہ دونوں جرائم پیشہ دنیا میں بھٹک کے چلے آتے ہیں اور وہ دونوں یہاں قید ہیں ــ جیدا بھی ناز بھی!

بے ہوش جیدا کو دیکھ کر ناز کو ایک ثانیہ کے لیے یوں محسوس ہُوا جیسے جیدا اُسی کی کوکھ سے پیدا ہُوا ہو۔ بجلی کی طرح یہ خیال سا چمکا اور بجھ گیا اور ناز کے آنسو نکل آتے۔

دو مہینے گزر گئے۔

تصویر اُسی حالت میں دیوار کے ساتھ لٹکتی رہی۔ جیدا کا معمول وہی رہا۔ اکثر راتیں غائب رہتا اور کبھی کبھار ایک آدھ رات ناز کے کمرے میں گزارتا تھا۔ جب سے ناز نے کمروں کو سجا سنوار لیا تھا وہ زیادہ ہی غیر حاضر رہنے لگا تھا۔ اگر کمرے میں آتا تو اس کا دماغ غیر حاضر معلوم ہوتا تھا۔

اُس کا گروہ کراچی میں جرائم کی رفتار اور اعداد و شمار میں اضافے کرتا رہا۔ کراچی کی راتوں کے اندھیرے اور زیادہ خوفناک ہوتے گئے اور جیدا ایک ہیبت بن کر چھایا رہا۔

ابّن کا خاندان نئے گھر میں آباد ہو چکا تھا۔ بچے سکول میں داخل کرا دیے گئے تھے اور اس کی بیوی رو بصحت تھی۔ ان کے تو دن پھر آتے تھے۔ ڈکیتی کا کیس عدالت میں چل رہا تھا لیکن پولیس ابھی تک اپنے گمشدہ وعدہ معاف گواہ ابّن کو ڈھونڈ رہی تھی۔ اب تو ابّن کا سارا کنبہ ہی غائب ہو چکا تھا۔ پولیس کے لیے پورے کنبے کی تلاش کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یہ کنبہ اُس وقت وہاں سے نکلا تھا جب پولیس کا ایک مخبر وہاں موجود تھا۔ کنبے کو وہاں سے نکالنے والے منّا اور ٹیپو تھے۔ مخبر دونوں کو جانتا تھا اور دونوں مخبر کو جانتے تھے۔ مخبر کوئی زاہد اور پارسا نہیں تھا۔ منّے اور ٹیپو کے پیشے کا ہی آدمی تھا۔ ابّن کا کنبہ اُس کی نظروں کے سامنے وہاں سے نکلا تھا اور اُس نے دو روز بعد پولیس کو اطلاع دی کہ گھر کے سب لوگ جانے کس وقت نکل گئے ہیں۔

ایک رات جیدا ابن کے ہاں گیا۔ وہ اُسی بہروپ میں تھا ــ سیاہ داڑھی، سر پر ململ کی ٹوپی، چادر اوڑھے ہوئے، قمیض اور تنگ پاجامہ پہنے۔ ان دو مہینوں میں اس نے خوب ہاتھ مارا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ابّن کی بیوی اُٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے پر رونق عود کر آئی تھی۔ بچے سو گئے تھے۔ جیدا خیر خبر پوچھنے لگا اور ابّن کی بیٹی جیدا کے لیے چائے بنانے چلی گئی۔

جیدا نے ابّن کی بیوی کو ڈیڑھ ہزار روپیہ دیا اور بتایا کہ یہ رقم ابّن نے لاہور سے بھیجی ہے۔ لڑکی چائے بنا کر لائی تو ماں نے روپے اُس کی طرف بڑھا دیے۔

"یہ لے بیٹی! تیرے ابّا نے بھیجے ہیں"

"ابّا کب آئیں گے؟" ــ لڑکی نے جیدا سے پوچھا۔

"وہ ابھی نہ ہی آتے تو اچھا ہے" ــ جیدا نے اطمینان سے جواب دیا ــ "آ بھی جاتے گا۔ کاروبار کا معاملہ ہے۔ الحمدللہ آمدنی خوب ہو رہی ہے"

"آخر آپ کا کاروبار کیا ہے؟" ــ ابّن کی بیوی نے پوچھا۔

جیدا بوکھلا سا گیا۔ وہ اس سوال کے لیے تیار نہ تھا۔ اپنے آپ کو سنبھالتے ہُوئے بولا ــ "کچھ سپلائی وغیرہ کا دھندا ہے"

"خدا آپ کے کاروبار میں برکت دے" ــ بیوی نے دعائیہ لہجے میں کہا "دیکھئے نا! جیسے گھر آجانے سے میں اتنے بڑے روگ سے آزاد ہو گئی ہوں۔ بچّے سکول پڑھنے لگ گئے ہیں۔ اچھا پہنتے ہیں۔ سب دکھ دور ہو گئے ہیں اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ پولیس کی جھک جھک سے چھٹکارا مل گیا ہے" ــ وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ ذرا سے توقف کے بعد بولی ــ "بھیّا! ایک اور ضروری بات

ہے"۔۔۔ وہ جھجک کے بولی۔۔۔ "کہتے بھی شرم آتی ہے۔"

اُس کی بیٹی اٹھ کے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"کہو بہن! ضروری باتوں میں شرم نہیں کرنی چاہیئے۔"

"زینت کی طبیعت ٹھیک نہیں"۔۔۔ ابّن کی بیوی نے کہا۔

"کیا بات؟"

"وہی جس کا ڈر تھا"۔۔۔ بیوی نے سر جھکا کر کہا۔۔۔ "اُس روز وہ سوا ساڑھے چار سو روپے دینے آیا تھا نا! بات تو تم جانتے ہو، پھر کیا ہُوا تھا"۔۔۔ اور وہ نظریں جھکا کر چپ ہو گئی۔

"اوہ"۔۔۔ جیدا نے چونک کر کہا "میں سمجھ گیا"۔۔۔ ذرا سوچ کر بولا۔۔۔ "تم فکر نہ کرو۔"

"فکر کیسے نہ کروں، کنواری بیٹی ہے"۔۔۔ وہ بولی۔۔۔ "ہم تو کہیں کے نہ رہے۔۔۔۔ دنیا کیا کہے گی۔"

"دنیا کو پتہ ہی کیوں چلنے دیں گے ہم؟"

"اور اس کے باپ کو میں کیا منہ دکھاؤں گی؟"۔۔۔ ابّن کی بیوی نے کہا۔۔۔ "وہ آئے گا تو میری ہڈی پسلی ایک نہ کر دے گا؟"

"اُسے میں سنبھال لوں گا"۔۔۔ جیدا نے خود اعتمادی سے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ۔۔۔" ابّن کی بیوی نے رک رک کر کہا۔۔۔ "کوئی ایسا بند و بست ہو جاتا۔۔۔۔ یا کوئی ایسی دوائی۔۔۔۔ ابھی تو تیسرا مہینہ شروع ہُوا ہے۔"

جیدا کے ماتھے کے شکن گہرے ہو گئے۔۔۔ "یوں کرو"۔۔۔ ذرا دیر بعد بولا۔۔۔ "بیٹی کو باہر نہ نکلنے دیا کرو۔ نہ کوئی دیکھے نہ شک کرے۔ کوئی پوچھ بھی بیٹھے تو کہہ دو اس کا خاوند ڈھاکے چلا گیا ہے۔۔۔۔ یہ کراچی ہے بہن! یہاں پڑوسی پڑوسی کو نہیں جانتا یہاں رہنے والوں کے ہاں محلّے برادری والی تو بات ہی نہیں ہوتی۔ کراچی میں نفسا نفسی ہے۔ ہر کوئی اپنی فکر میں گم رہتا ہے۔"

"لیکن میرے گھر ناجائز بچہ جنم ہی کیوں لے؟"۔۔۔ ابّن کی بیوی نے کہا۔۔۔ "میں تو چاہتی ہوں قصّہ ہی پاک ہو جاتے۔"

"نہیں بہن!"۔۔۔ جیدا نے کہا۔۔۔ "بچّہ پیدا ہوتے ہی میں اُٹھا لے جاؤں گا۔۔۔۔ کوئی بچہ ناجائز نہیں ہوتا۔ نہ بچّہ قصوروار ہے نہ تمہاری بیٹی۔ یہ میرا قصور تھا کہ اس طرح کا آدمی تمہارے گھر بھیج دیا تھا اس کی سزا میں بھگتوں گا۔"

"آپ کا بھی کیا قصور تھا، غریبوں کی قسمت میں یہی لکھا تھا"۔۔۔ ابّن کی بیوی نے آہ بھر کر کہا۔

"جی نہیں!"۔۔۔ جیدا نے اُسے سمجھاتے ہوتے کہا۔۔۔ "امیروں غریبوں کا سوال نہیں۔ امیروں کی قسمت میں حرامی بچے زیادہ لکھے ہوتے ہیں۔ انگریزوں کی اندھا دھند نقل اتار کے امیروں نے سب بندھن توڑ ڈالے ہیں۔ کراچی کے گٹر اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر گواہ ہیں۔۔۔۔ بہرحال تم بچے کا فکر نہ کرو"۔۔۔ جیدا نے اُسے تسلّی دیتے ہوتے کہا۔۔۔ "میں زچگی سے پہلے اور بعد کا بند و بست کروں گا کسی اور مصیبت میں نہ پڑ جانا، ورنہ پولیس کو بھی پتہ چل جاتے گا کہ تم لوگ یہاں رہتے ہو۔"

"ہمارے نصیب!"۔۔۔ ابّن کی بیوی نے لمبی آہ بھری۔

"ہونی ہو جاتی ہے بہن!"۔۔۔ جیدا نے اسے تسلی دی۔۔۔ "میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کہہ جو دیا غم نہ کرو۔ ابّن آ گیا تو میں اُسے بھی سنبھال لوں گا۔"

جیدا وہاں سے اٹھ آیا اور آتے آتے داڑھی کے بہروپ میں چھ سو کی جیب کاٹ لایا۔

جیدا، منّے اور ٹیپو کے کمرے میں داخل ہُوا۔

دونوں جاگ رہے تھے۔ جیدا نے داڑھی اتاری اور بٹوہ ان کی طرف پھینک کر کہا۔۔۔ "لاؤ بھئی سگریٹ تو پلاؤ"۔۔۔ اور وہیں نیم دراز ہو گیا۔

نازا اپنے کمرے میں بیٹھی جیدا کی ڈائری پڑھ رہی تھی۔

"۲۲ ستمبر ۱۹۵۶ء۔

آج دن کے پچھلے پہر جیکب لائنز کے کوارٹروں سے گزر ہُوا۔ ایک کوارٹر میں کوئی ستار بجا رہا تھا۔ ستار کے نغموں سے مجھے اتنی ہی محبت ہے جتنی انسانوں سے نفرت۔ میرے قدم رک گئے اور میں بہت دیر وہاں کھڑا ستار سنتا رہا"۔۔۔ ناز نے ڈائری سے نظریں ہٹا لیں۔ وہ دو ڈھائی مہینوں سے جیدا کی ڈائری پڑھ رہی تھی۔ اس کی بعض تحریریں بے معنی اور اوٹ پٹانگ سی تھیں اور بعض واضح اور بامعنی۔ ناز نے جیدا کی تمام کمزوریاں چن چن کر یاد کر لی تھیں۔ آج جب اُسے ڈائری سے معلوم ہُوا کہ جیدا کو ستار سے بھی لگاؤ ہے تو وہ خلاؤں میں ایک تصور کو آراستہ کرنے لگی۔ وہ مسرت سے جھوم اٹھی جیسے اس نے جیدا کو پابہ زنجیر کر لیا ہو۔

اتنے میں جیدا کمرے میں داخل ہُوا۔

"اوہ! تم آ گئے؟"۔۔۔ ناز نے چونک کر کہا اور جذبات سے بھرپور انگڑائی لی۔ پھر یہ انگڑائی زہد شکن اور دعوت انگیز مسکراہٹ میں سمٹ آئی۔ جیدا دروازے میں رکا کھڑا رہا۔ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ ناز نے بازو اُس کی طرف پھیلاتے ہُوتے کہا۔۔۔ "آؤ نا! تم تو رک ہی گئے ہو۔"

جیدا وہیں رکا رہا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ جواں سال اور حسین لڑکی کی اس قدر اشتعال انگیز انگڑائی اور مسکراہٹ اُسے ذرہ بھر متاثر نہ کر سکی۔ وہ بے پرواہی سے پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"تم یہ دھندا چھوڑ کر افسانہ نویسی یا شاعری کیوں نہیں شروع کر دیتے؟"۔۔۔ ناز نے کرسی اس کی طرف گھسیٹتے ہُوتے کہا۔۔۔ "ڈائری کی تحریر تو اچھے خاصے ادیب کی ہے۔"

"بھوکا مارنے کا ارادہ ہے کیا؟"۔۔۔ جیدا نے پلنگ پر نیم دراز ہوتے ہُوتے کہا۔۔۔ "چھ غزلیں کہہ لینے کی بجائے ایک جیب کاٹ لینا کیا بُرا ہے؟"

"کسی کو لوٹتے تمہارا دل لرزتا نہیں؟"۔۔۔ ناز نے پوچھا۔

"دل کے لرزے کو ساکن کرنے کی خاطر ہی تو میں لوٹتا ہوں"۔۔۔ جیدا نے کہا۔

"جیدا!"۔۔۔ ناز نے اُسے تشنہ سی نگاہوں سے دیکھتے ہُوتے کہا۔۔۔ "تم کچھ بھی کہو مگر اب ہم ایک دوسرے سے دور نہیں رہ سکتے۔ کیوں نہ اب۔۔۔۔"

"شادی کر لیں!"۔۔۔ جیدا نے اسے گھورتے ہُوتے فقرہ مکمل کر دیا۔

"دیکھو تو ذرا"۔۔۔ ناز نے کہا۔۔۔ "میں نے کس قدر خوبصورت گھر بنا لیا ہے۔ یہاں ایک ننھا کھیل رہا ہو تو اچھا نہ لگے؟"

"تمہیں بچہ پالنے کا شوق ہے؟" — جیدا نے پوچھا۔

"کیوں نہیں!"

"کراچی میں بچوں کی کیا کمی ہے!" — جیدا نے کہا — "کسی صبح کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے یا کسی گٹر سے ایک نوزائیدہ بچّہ اٹھا لاؤں گا۔ پال لینا۔ شادی کے تکلّف کی کیا ضرورت ہے؟ اگر کہو تو کسی کا دودھ پیتا بچّہ اٹھا لاؤں گا۔"

"لیکن میں کسی اور کا بچہ تو پالنا نہیں چاہتی" — ناز نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے اپنا بچہ چاہیئے.... تمھارا بچّہ!"

"مجھے کوئی بچہ نہیں چاہیئے ناز!" — جیدا نے کہا — "میرے پاس بے شمار بچے ہیں جو جانے کس نے جنے ہیں اور کس نے پالے ہیں۔ یہی میری اولاد ہے اور مجھے انہی سے پیار ہے۔"

"کون ہیں وہ؟" — ناز نے پوچھا۔

"یہی جو ساری کراچی میں جیبیں کاٹتے پھرتے ہیں" — جیدا نے کہا اور اکتائی ہوئی سی انگڑائی لی۔

ناز نے جیدا کا بدلتا ہُوا مزاج دیکھ کر موضوع کو بدل دینا چاہا۔

"اچھا نہ سہی" — ناز نے آہ سی لے کے کہا — "میرا ایک شوق پورا کر دو۔"

جیدا نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو ناز بولی — "ستار سیکھنے کا بہت شوق ہے۔"

"ناچ گانا سکھا دوں؟" — جیدا نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہُوئے کہا۔

"اُونہہ!..... ناچ گانا" — ناز نے روٹھنے کے انداز سے کہا — "میرا مطلب وہ تھوڑے ہی ہے اکیلے جی اکتا جاتا ہے۔ ستار سے ہی دل بہلا لیا کروں گی بچپن سے ستار بجانے کا شوق ہے۔"

"شوق بُرا نہیں" — جیدا نے کہا۔

"تو ستار اور ایک استاد کا بندوبست کر دو" — ناز نے چہک کر کہا۔

"ستار آجاتے گی لُستاد کا یہاں آنا ممکن نہیں" — جیدا نے کہا — "یہاں ہمارے سوا اور کوئی نہیں آسکتا۔"

"تو میں استاد کے پاس چلی جایا کروں گی" — ناز نے کہا — "برقعے میں جایا کروں گی۔ اپنا کوئی آدمی ساتھ بھیج دیا کرو۔ تیری قسم جیدا بھاگوں گی نہیں۔"

جیدا زیرِ لب مسکرا دیا اور بولا — "بھاگ کے جاؤ گی کہاں؟" — اور ذرا سے وقفے کے بعد اُس نے کہا — "ستار اور استاد کا بندوبست ہو جاتے گا۔"

اگلے ہی روز جیدا نے ناز کے لیے ستار اور استاد کا بندوبست کر دیا۔ وہ ہر شام استاد کے ہاں ستار سیکھنے جانے لگی اب وہ زیادہ تر ستار میں ہی محو رہنے لگی۔ بعض اوقات وہ ریاض میں یوں کھو جاتی تھی جیسے اس کے جینے کا مقصد ہی یہی ہو۔

ایسے میں وہ اکثر تصوّر میں کھو جاتی جیسے جیدا اس کے سامنے بیٹھا جھوم رہا ہو اور اُس نے جیدا کا ستار سنبھال کر اُس میں اپنی محبت بھر دی ہو۔ اس تصور سے ناز پر بے خودی طاری ہو جاتی تھی، اس کی انگلیاں تاروں پر رقص کرنے لگتی تھیں۔

وقت ستار کے نغموں پر تیرتا جا رہا تھا۔

جیدا اور اُس کا گروہ کراچی میں جرائم کی رفتار میں خوفناک اضافے کر رہا تھا۔

ناز کی انگلیاں ستار پر اور جیدا کی انگلیاں کراچی والوں کی جیبوں پر چلتی رہیں اور سات مہینے گزر گئے۔

دن کا پچھلا پہر تھا۔ جیدا کمرے میں پلنگ پر لیٹا ہُوا تھا۔ اُس کا ایک نوعمر شاگرد آیا۔ اُسے دیکھ کر جیدا مُسکرا اٹھا۔

چودہ پندرہ برس کی عمر کا یہ خوش شکل لڑکا ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ چند برس گزرے تین نفوس کا یہ کنبہ سالا لاتن کی جھگیوں میں رہا کرتا تھا۔ باپ کسی مِل میں مزدور تھا اور شام کو فٹ پاتھ پر پان سگریٹ کی چھابڑی بھی لگا لیتا تھا۔ وقت اچھا کٹ رہا تھا۔ سر چھپانے کو گھاس پھونس کی جھونپڑی تھی۔ کھانے اور پہننے کو آمدنی کافی تھی۔ اکلوتے بچے کو انہوں نے سکول داخل کرا دیا تھا اور باپ نے مستقبل کے بے شمار سپنے اس بچے کے ساتھ وابستہ کر دیتے تھے۔

جھگیوں کی اس بستی میں کارپوریشن نے نل بھی لگا دیا تھا جو دن میں ایک آدھ مرتبہ تھوڑی سی دیر کے لیے پانی ٹپکایا کرتا تھا۔ دن بھر نل کے ساتھ مٹکوں، گھڑوں، بالٹیوں اور انسانوں کی لمبی قطار لگی رہتی تھی۔ نل تو خاموش رہتا تھا لیکن لوگ ہنگامہ بپا کیے رکھتے تھے۔ کوئی گھڑا، بالٹی یا بناسپتی گھی کا خالی ڈبہ لائن توڑ کر غلطی سے یا دانستہ آگے ہو جاتا تو پیاسا ہجوم واویلا بپا کر دیتا تھا۔ کبھی دو گھڑے ٹکرا جاتے اور ٹوٹ جاتے تھے۔ گالی گلوچ، پھر ہاتھا پائی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی لڑائی مار کٹائی ہوتی اور خون خرابہ بھی ہو جاتا تھا۔ نل پانی دے نہ دے، خون کے فوارے پھوٹ پڑتے تھے۔ غُصّہ جو کارپوریشن اور اس کے نل پر ہوتا اسے لوگ ایک دوسرے پر نکالتے رہتے تھے۔ جھگیوں کی پیاسی مخلوق پیاسی ہی رہتی اور گھڑا بھرنے کی باری پر یہ لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے۔

اِس نل پر پانچ برس گزرے، اس لڑکے کا باپ بالٹی بھرنے گیا تھا۔ اُس نے بالٹی آگے کی، ایک اور آدمی نے گھڑا بڑھا دیا۔ بالٹی اور گھڑے کے تصادم میں گھڑا ٹوٹ گیا۔ تُرش کلامی ہوئی، بات بڑھی اور دونوں لہولہان ہو گئے۔ دوسرا آدمی تھانے جا پہنچا اور پولیس لڑکے کے باپ کو پکڑ لے گئی۔ قصوروار وہ اکیلا نہیں تھا۔ اسے بھی چوٹیں آئی تھیں لیکن دوسرا آدمی سٹی کورٹ کا چپراسی تھا وہ کچہری اور پولیس کے تاریک راستوں سے خوب واقف تھا۔ وہ قانون کی چکی کے پتھروں کی چال کو بھی خوب سمجھتا تھا۔

لڑکے کا باپ پسنے لگا۔ مقدمے کی تاریخوں پر تاریخیں مل رہی تھیں مگر سماعت نہیں ہوتی تھی۔ وہ جیل کی حوالات میں بند تھا اور ضمانت کی درخواست مسترد ہو چکی تھی۔ درخواست منظور بھی ہو جاتی تو ضامن کہاں سے آتا؟

گھر میں فاقوں تک نوبت پہنچی تو لڑکے کی ماں نے مرچ مسالے کے ایک تھوک بیوپاری کے ہاں مرچیں پیسنے کی نوکری کر لی۔ وہاں کتنی اور عورتیں کام پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ پچھلے کمرے میں اینٹیں اور پپیتے کے بیج پیسا کرتی تھیں۔ اینٹوں کو پیس کر مرچوں میں اور پپیتے کے بیجوں کو کالی مرچوں میں ملایا جاتا تھا۔ یہ تھوک فروش پپیتے کے خشک بیج سالم کالی مرچ میں ملا کر بیچا کرتا تھا۔

باپ کو جیل میں ایک سال ہو چلا تھا اور ماں کو اینٹیں مرچیں پیستے تین چار ماہ ہو گئے تھے۔ اس ایک سال کے طویل عرصے میں صرف دو گواہوں کے بیان قلمبند ہُوتے تھے۔ وکیل تھا نہیں جو مقدمہ لڑتا یا کر پلّے پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی کہ کچھ دے دلا کر گلو خلاصی کرا لیتا۔ تھانیدار نے پہلے روز اُسے کہا تھا کہ کچھ ہے

تو لے آؤ، معاملہ یہیں رفع دفع ہو جائے گا۔

وہ رضامند ہو گیا تھا مگر تھانیدار پورے پانچ سو مانگ رہا تھا اور جس کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی، وہ دو سو روپوں کا مطالبہ کر رہا تھا۔ لڑکے کا باپ تو ایک سو کی بھی اسامی نہیں تھی، سات سو روپے کہاں سے لاتا؟ اُس نے اپنے حریف کے آگے ہاتھ جوڑے اور تھانیدار کے پاؤں پکڑے اور کہا کہ اِدھر اُدھر سے قرض اٹھا کر تین سو روپیہ دے دوں گا مگر کورٹ کا چپراسی اور تھانیدار اسی میدان کے کھلاڑی تھے۔

"بیوی کو بیچو، جھگی بیچ ڈالو" — تھانیدار نے اسے کہا تھا — "سات سو پورے لاؤ، ورنہ تم دیکھ رہے ہو کہ یہ آدمی تمہارے ہاتھوں زخمی ہُوا ہے اور عوام کے جان و مال کی حفاظت کرنا اور دنگا فساد کرنے والوں کو سزا دلانا پولیس کا فرض ہے۔ مجھے اپنا فرض عزیز ہے۔"

لڑکے کی ماں جس کے ہاں کام کرتی تھی وہ پہلے روز سے ہی اس پر ڈورے ڈالنے لگا تھا لیکن عورت خوددار تھی، اُسے ٹرخاتی رہی۔ حالات کا تقاضا تھا کہ وہ ہر چوٹ سہتی چلی جاتے۔ لڑکا سکول سے آتا تھا تو باپ کی طرح فٹ پاتھ پر پان سگریٹ کی چھابڑی لگا لیتا تھا۔ ماں بیٹا باپ کے لیے وکیل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ کمانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ایک شام مرچوں کے بیوپاری نے باقی عورتوں کو چھٹی دے دی اور لڑکے کی ماں کو روک رکھا۔ بولا — "گھنٹہ بھر اور کام کر لو، دو تین روپے فالتو دے دوں گا۔"

عورت حاجت مند تھی، مان گئی۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا اور وہ ابھی تک چکی پیس رہی تھی۔ اُس کے کندھے دُکھنے لگے تھے۔ اسے رہ رہ کر خاوند یاد آ رہا تھا۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں جیل کی دیواریں گرا رہی تھی، سلاخیں توڑ رہی تھی، عدالت میں چیخ چیخ کر خاوند کی صفائی میں بول رہی تھی مگر چکی کی گھم گھم اسے تصوّروں کی دنیا سے بیدردی سے گھسیٹ کر مرچوں کے ڈھیر کی طرف لا رہی تھی۔

اُس کا خون کھولنے لگا، دانت غم و غصّہ سے پلنے لگے اور ان دانتوں میں وہ ہر اُس انسان کی بوٹیاں چبانے لگی جس نے اُس کے سہاگ کو کال کوٹھڑی میں بند کر دیا اور اُسے چکّی پر بٹھا دیا تھا۔ غصے اور احتجاج نے سینے میں آگ سی لگا دی اور وہ سراپا شعلہ بن گئی۔ چکی اور تیز گھومنے لگی۔ پسینے کے قطرے تیزی سے بہنے لگے اور اُسے معلوم ہی نہ ہُوا کہ اُس کا آقا اس سے دو قدم دور کھڑا اسے بھوکی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہ ہُوا کہ اُس نے گودام کا دروازہ اندر سے بند کر دیا ہے۔

"بس کرو عائشہ!" — جیسے چکی کی گھم گھم سے آواز اُبھری ہو — "یہ لو دس روپے۔ کیوں پھول جیسا مُکھڑا ستیاناس کر لیا ہے۔"

عورت نے چونک کے دیکھا۔ موٹا بھدا سا بیوپاری اُس کے سر پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ عورت نے پہلے ان کے نوٹ کو پھر بیوپاری کو دیکھا۔ بیوپاری نے بڑھ کر اُسے اٹھایا اور بازوؤں میں جکڑ لیا۔

بند گودام میں ہوس اور آبرو کی جنگ شروع ہو گئی۔ تھکی ہاری عورت کی آہ و بکا سننے والا کوئی نہ تھا۔ وہ پہلے ہی جلی بھُنی ہوئی تھی۔ بیوپاری کی دست درازی پر سراپا شعلہ بن گئی۔ اُس نے اسے ایسا دھکا دیا کہ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ پیچھے چکی تھی جس کی ٹھوکر سے بیوپاری اپنے پھولے ہوئے جسم کو سنبھال نہ سکا اور چکی پر گر پڑا۔ عورت کے کان میں جیسے کسی نے کہہ دیا ہو کہ یہی ہے وہ جس نے تیرے خاوند کو قید کر رکھا ہے۔ اُس نے

سِل اٹھالی۔ بیوپاری اپنا بوجھل جسم چکی سے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ پتھر کی وزنی سِل جس پر پیستے کے بیج پیس کر پسی ہوئی کالی مرچ میں ملاتے جاتے تھے، اُس کے سر پر پڑی۔ کھوپڑی سے خون کا دھارا پھوٹا اور پھر بیوپاری اٹھ نہ سکا۔

مرچوں کی چکی رک گئی اور قانون کی چکی کے دو مہیب پتھر تیزی سے گھومنے لگے۔ بے بس عورت بہت روئی، بہت چیخی لیکن مقتول کے لواحقین کے ہاں بے انت پیسہ تھا۔ انہوں نے درجن بھر گواہ خرید لیے تھے۔ عورت کا صرف معصوم بیٹا تھا جو کبھی جیل کے باہر کبھی عدالت کے برآمدے میں رو رو کر ہلکان ہو رہا تھا۔ باپ پہلے ہی جیل میں بند تھا، ماں بھی جیل میں بند کر دی گئی۔

لڑکے کے باپ کو جیل میں اس حادثے کی خبر ملی تو اُس پر خاموشی طاری ہو گئی۔ دن رات خلاؤں میں تکتا رہتا۔ کڑھتا رہتا، سوتا تھا نہ کچھ کھاتا تھا یا زار و قطار رونے لگتا تھا۔

ان ہی دنوں ٹیپو ایک سال کی سزا بھگت رہا تھا۔ لڑکے کے باپ نے اُسے جیل میں کئی بار اپنی داستانِ غم سنائی تھی اور اسے بتایا تھا کہ اُس کا ایک ہی بچہ ہے جو معلوم نہیں کس حال میں جی رہا ہوگا۔

جرائم پیشہ لوگ جب جیل میں جاتے ہیں تو وہ سزا سے ڈر کر جرائم سے توبہ نہیں کرتے بلکہ وہاں نوآموزوں کو تربیت دیتے اور آرام کرتے ہیں۔ انہیں الگ نہیں رکھا جاتا بلکہ اُن قیدیوں کے ساتھ رکھا جاتا اور رات کو انہی کے ساتھ بند کیا جاتا ہے جو بھولے بھٹکے کوئی جرم کر بیٹھتے ہیں یا اس لڑکے کے باپ کی طرح لڑائی جھگڑے کے مجرم ہوتے ہیں۔ ان سے اتفاقیہ جرم کا ارتکاب ہو جاتا ہے۔ وہ پیشہ ور نہیں ہوتے۔ ان میں لڑکے کے باپ کی طرح کے وہ افراد بھی ہوتے ہیں جو پاس پلّے نہ ہونے کی وجہ سے بے انصافی کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ قانون اور سوسائٹی کے خلاف بھڑکے ہُوئے ہوتے ہیں۔ ان میں انتقامی جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جو عقل اور ہوش پر غالب آ جاتا ہے۔ ان کی حالت لال گرم لوہے کی سی ہوتی ہے جسے ضربوں سے کسی بھی شکل میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

جرائم پیشہ لوگ اور ان کے ساتھی ایسے ہی قیدیوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ وہ لال گرم لوہے کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ اس لڑکے کے باپ جیسے قیدیوں کو جرائم کی تربیت دے کر انہیں اپنے گروہوں میں شامل کر لیتے ہیں — اور یوں جرائم اور جرائم پیشہ مخلوق میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

جیدا کے ساتھی ٹیپو نے اس آدمی کی بپتا ہمدردی سے سنی اور جب اُسے پتہ چلا کہ اس آدمی کا ایک کمسن بیٹا بھی ہے تو وہ اس کا اور زیادہ ہمدرد بن گیا۔ یہ لوگ ایسے لڑکوں کی تلاش میں رہتے تھے۔

ایک روز جیدا ٹیپو سے ملنے جیل گیا تو ٹیپو نے اُسے اس لڑکے کے متعلق بتایا کہ اس کا باپ بھی جیل میں ہے اور ماں بھی۔ جیدا تو ایسے لڑکوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ وہ ٹیپو سے مل کر رسالہ لائن کی جھگیوں میں گیا۔ جھگی تو مل گئی، لڑکا نہ ملا۔ جھگیوں والوں نے بتایا کہ لڑکا اکثر غائب رہتا ہے یا ان گلیوں میں پھرتا ہے۔ جیدا نے اپنے دو آدمی اُس کی تلاش پر لگا دیئے۔

ایک تو لڑکے کے باپ کا مقدمہ تھا جو ایک سال سے فائلوں میں پڑا تھا، دوسرے اُس کی ماں کا کیس جو چھٹے مہینے ہی سیشن سپرد ہو گیا اور آٹھویں مہینے اُسے چودہ سال سزائے قید سنا دی گئی۔ اُس وقت

تک باپ کڑھ کڑھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ جب اُس نے اپنی بیوی کا فیصلہ سنا تو اُسے خون کی قے آئی اور چند روز بعد وہ اپنے کیس کا فیصلہ سُننے سے پہلے ہی مر گیا۔

چند روز بعد ٹیپو اپنی قید پوری کر کے نکلا تو اُس نے جیدا کو لڑکے کے باپ کی موت کی خبر سنائی جیدا لڑکے کی تلاش میں اور زیادہ بیتاب ہو گیا۔ آخر ایک روز وہ اُسے مِل گیا۔ نو دس برس کی عمر کا بھولا بھالا سا بچہ ویران جھگی میں بیٹھا ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ جیدا نے بڑھ کر اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اُسے سینے سے لگا لیا۔ جیدا پہلا انسان تھا جس نے اس بھیانک عرصے میں اُسے سینے سے لگایا تھا۔ بچہ یوں جیدا سے چپک گیا جیسے اُسے تپتی ریت سے اٹھا کر کسی نے یخ کمرے میں لا بٹھایا ہو۔

جیدا اُسے اپنے مکان میں لے آیا۔ اسے نہلایا، دُودھ پلایا اور اسے اپنے پیار میں جذب کر لیا۔ رات کی تنہائی تھی، بچہ فرش پر بچھے بستر پر بیٹھا اونگھ رہا تھا اور جیدا اُس کے پاس بیٹھا اُسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کے گول مٹول پیارے پیارے خدوخال میں اپنا بچپن دیکھ رہا ہو۔ اس کے سینے سے آہ نکل گئی۔ جیدا نے سرگوشی میں کہا — "سو جا ننھے! تیری ہی عمر میں میرے بھی ماں باپ چھِن گئے تھے میں بھی گلیوں میں روتا پھرا تھا۔ مجھے بھی ایک جیب کترے نے سینے سے لگایا تھا۔ تجھے بھی ایک جیب کترے نے گودی اٹھایا ہے۔ آج میں سکھی ہوں کل تُو بھی سکھی رہے گا.... تُو میرا بچہ ہے ننھے! سو جا!"

بچہ کچھ بھی نہ سن سکا۔ وہ سو گیا تھا — یہ پانچ برس پہلے کی ایک رات تھی۔ جیدا ملول ہو گیا تھا اور وسکی کی آدھی بوتل پی گیا تھا۔

تھوڑے ہی دنوں میں بچہ جیدا سے گھل مِل گیا تھا اور اسی کے ساتھ رہنے لگا اور اس کی جھگی جیدا کے تین چار بالکوں نے سنبھال لی تھی۔

اور اُس وقت جب جیدا نے اُسے اپنا بیٹا بنا لیا تھا، اُس کے باپ کی لاش ایک میڈیکل کالج میں پڑی تھی۔ جیل والوں نے اُس کی لاش لاوارث قرار دے کر میڈیکل کالج کو دے دی تھی جو چیری پھاڑی ہوئی تھی اور ایک میز پر پڑی تھی۔ اس کے اردگرد طلبا اور طالبات کھڑی تھیں اور ایک پروفیسر انہیں لاش کے اندرونی حصے دکھا رہا تھا۔

"یہ لاش ہمیں جیل سے ملی ہے" — پروفیسر نے سبق پورا کر کے ازراہِ مذاق کہا — "یہ کوئی مجرم تھا کھوٹا سکہ تھا لیکن دیکھو، تمہارے لیے کتنا قیمتی ثابت ہُوا ہے۔ ہم اس کا گوشت پوست الگ کر کے ہڈیوں کا ڈھانچہ شوکیس میں رکھیں گے، پھر یہ تمہاری آئندہ نسلوں کے بھی کام آئے گا۔"

آج پانچ برس بعد لڑکا جیدا کے گروہ کے نوعمر لڑکوں میں سب سے زیادہ تیز لڑکا تھا۔ جیدا نے اسے گھر بھیدی کی ٹریننگ دی تھی اور اسے کئی کوٹھیوں میں ملازم رکھوا کر اس کی مخبری اور راہنمائی میں ڈاکے ڈالے تھے۔ اس کے علاوہ جیدا نے اسے جیب تراشی میں اس قدر طاق کر دیا تھا کہ پانچ برسوں میں وہ ایک بار بھی گرفتار نہیں ہُوا تھا۔

آج دن کا پچھلا پہر تھا۔ جیدا پلنگ پر لیٹا ہُوا تھا۔ ناز دوسرے کمرے میں ستا رہی تھی کہ وہ لڑکا کمرے میں داخل ہُوا۔

"آ پٹھے!" — جیدا نے مسکرا کر کہا۔

"اُستاد!" — لڑکے نے جیدا کے پاس بیٹھ کر پوچھا — "جیکب لائن کے اڈے کا تمہیں پتہ ہے؟"

"اُوں ہوں!" — جیدا نے کہا — "وہاں کوئی اڈہ نہیں۔"

"ہے اُستاد! میں پانچ چھ روز سے دیکھ رہا ہُوں۔"

"کراچی کا کون سا اڈہ ہے جو مجھ سے پوشیدہ ہے" — جیدا نے کہا — "وہ لبشیرے کا علاقہ ہے اور اُس کی تمام جگہوں کو میں جانتا ہُوں.... تم کیا دیکھ آئے ہو؟"

"جیکب لائن کی جھگیوں کے ساتھ نئے کوارٹر ہیں نا" — لڑکے نے بتایا — "ایک کوارٹر میں ایک بڈھا رہتا ہے.... اِتنی لمبی سفید داڑھی، شاید اکیلا رہتا ہے۔ رات اس کے ہاں رنڈیاں آتی ہیں اور وہاں دیر تک گانا بجانا لگا رہتا ہے۔ بڈھا ستار بجاتا ہے۔ ہارمونیم بھی بجاتا ہے میں پانچ چھ روز سے دیکھ رہا ہوں جاپانی روڈ والی شمیم اور تاجی آگرے والی اور تین چار نئی لڑکیاں اکثر شام آتی ہیں۔"

"تماش بین بھی آتے ہیں؟"

"نہیں!" — لڑکے نے کہا — "بڈھے کے سوا اور کوئی مرد نہیں ہوتا۔ وہ ایک ایک کر کے آتی ہیں باری باری چلی جاتی ہیں۔ ریر ہے وہ اڈہ اُستاد!"

"لبشیرے کو کبھی دیکھا ہے وہاں؟" — جیدا نے پوچھا۔

"کبھی نہیں" — لڑکے نے کہا — "ہوسکتا ہے لبشیرے کو علم ہی نہ ہو کہ اُس کے علاقے میں کسی اور نے خفیہ اڈہ کھول رکھا ہے۔"

جیدا گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کراچی کا کون سا قحبہ خانہ یا جوئے بازی کا اڈہ اُس سے پوشیدہ تھا وہ کراچی کے ایک ایک پمپ کو جانتا تھا۔ شہر یا مضافاتی نئی بستیوں میں کہیں بھی ڈاکہ پڑے جیدا کو معلوم ہوتا تھا کہ کس پارٹی کی واردات ہے اور مال کہاں ہے۔

آج جب لڑکے نے اُسے جیکب لائنز کے اڈے کی خبر سنائی تو اُس نے ذہن پر بہت زور دیا لیکن اُسے ایسا کوئی اڈہ یاد نہ آیا۔ لڑکے نے جس شمیم اور تاجی آگرے والی کے نام لیے تھے وہ کراچی کی طرحدار رنڈیاں تھیں۔ وہ تو بہت اونچے گاہکوں کی فرمائشی چیزیں تھیں۔ گاتی ناچتی بھی تھیں اور باہر بھی جاتی تھیں۔

جیکب لائنز کا علاقہ ایک اور استاد لبشیرے کا تھا جو جیدا کی ٹکر کا استاد تھا۔ جیدا نے چاہا کہ لبشیرے سے بات کرے لیکن سوچا پہلے دیکھ تو لے کہ وہ بڈھا کون ہے، لڑکے کو شاید غلطی لگی ہو۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ لبشیرے کا شمیم اور تاجی کے ساتھ دور کا بھی تعلق نہیں۔ ان کے اپنے پمپ بڑے گھاگھ تھے۔ انہیں کسی استاد کی سرپرستی کی ضرورت نہیں تھی۔

"مجھے کوارٹر بتا دو" — جیدا نے لڑکے سے کہا — "میں رات کو جا کے دیکھوں گا۔"

رات کا پہلا پہر تھا۔ جیدا اس کوارٹر کے دروازے پر کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔ دروازہ کھُلا۔ جیدا ذرا ہٹ کر ٹہلنے لگا۔ ایک عورت باہر نکلی۔ گلی کے اندھیرے میں جیدا اسے پہچان نہ سکا۔ وہ دور نکل گئی تو جیدا کوارٹر میں داخل ہو گیا۔ صحن عبور کیا اور برآمدے میں رک گیا۔ اُسے خیال آیا کہ کوئی پردہ دار گھر ہی نہ ہو لیکن اُسے معاً یاد آ گیا کہ وہ کون سا شریف آدمی ہے، ڈاکو ہی تو ہے۔

کمرے سے ستار کا دھیما دھیما الاپ اُٹھنے لگا۔ کسی سچّے راگ کا الاپ تھا اور تاروں پر پھرتی انگلیاں کسی استاد کی تھیں۔ جیدا جیسے کھچا ہُوا کمرے کے دروازے میں جا کھڑا ہُوا۔ کمرے میں دری پر ایک بُوڑھا بیٹھا ستار بجا رہا تھا۔ عمر کم و بیش ستّر برس، داڑھی اور سر کے لانبے لانبے بال دودھ کی طرح سفید تھے اور وہ الاپ میں یوں کھویا ہُوا تھا جیسے زندگی کا عظیم ترین اور آخری نغمہ تخلیق کر رہا ہو۔

جیدا دروازے میں ہی کھڑا رہا۔ شاید وہ بھی ستار کے نغمے میں کھو چلا تھا اور بوڑھے کو جیسے اس کی موجودگی کا احساس ہی نہ تھا۔

بوڑھے نے بے خیالی میں جیدا کو دیکھا مگر الاپ میں ہی محو رہا پھر جیسے تاروں کے مترنّم ارتعاش سے ہی آواز آئی ہو — "آؤ بیٹا بیٹھو!"

جیدا دو قدم آگے بڑھا مگر کھڑا ہی رہا۔ بڈھے کا چہرہ نورانی تھا سپید ریشم کے باریک اور چمکیلے تاروں جیسی داڑھی چہرے کے نور میں اضافہ کر رہی تھی۔ جیدا نے اس چہرے کے ایک ایک نقش، ایک ایک خط اور ایک ایک جھری کو بڑے ہی غور سے دیکھا لیکن اُسے کہیں جرم و گناہ کی ہلکی سی پرچھائیں بھی نظر نہ آئی۔ کمرے میں پھیلتا ہُوا تاروں کا ترنّم طلسم کی طرح جیدا کو اپنے آپ میں تحلیل کرتا جا رہا تھا اور وہ بھولتا جا رہا تھا کہ یہاں کیوں آیا ہوں اور میں ہوں کیا؟

"بیٹھو نا بیٹا" — بڈھے نے ستار سے نظریں ہٹاتے بغیر ایک بار پھر کہا — "کھڑے کیوں ہو!"

بڈھے کی آواز میں بھی موسیقی تھی اور "بیٹا" کا لفظ جیسے اس کے سینے کی کسی عمیق تہ سے اُبھرا تھا۔ جیدا اس لفظ کی بے ساختگی اور خلوص کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ یوں آگے بڑھ کے دری پر بیٹھ گیا جیسے بڈھے نے اُسے جادو کے زور سے بٹھا لیا ہو۔

"ایک جگہ میں الجھ گیا تھا" — بڈھے نے ستار پر انگلی پھیرتے جیسے اپنے آپ سے کہا ہو — "انگلیاں بُڑھیا گئی ہیں نا! اب تو انگ بھی چھوڑ جاتی ہیں" — اور بڈھے نے ستار اتار دی، پھر کھل کر مسکرایا اور بولا — "کیسے آئے بیٹا؟"

"ستار بجتے سنی تو بنا پوچھے گھُس آیا" — جیدا نے کہا۔

"تو اچھا کیا جو گھُس آئے" — بڈھا ہنس پڑا — "کون آتا ہے بڈھے کی کٹیا میں؟ وقت ان تاروں کو چھیڑتے گزر جاتا ہے.... کون آتا ہے یہاں! ابھی ابھی بچیوں نے ذرا رونق لگائی تھی۔ کل شام تک یوں ہی تنہائی میں پڑا رہوں گا" — بڈھا پھر ہنس دیا۔

"بچیاں؟" — جیدا نے مسکرا کر کہا — "بڑے میاں! وہ تو ناچتی گاتی ہیں اور پیشہ کماتی ہیں جو تمہارے پاس آتی ہیں۔ وہ تو رنڈیاں ہیں"

"ہوں گی" — بڈھے نے سنجیدہ سی مسکراہٹ سے کہا — "لیکن میری کٹیا میں وہ میری بچیاں ہیں رنڈیاں وہاں ہوں گی جہاں ناچتی اور گاتی ہیں.... تم انہیں کیسے جانتے ہو بیٹا؟"

"بس جانتا ہوں" — جیدا کے لہجے میں بوکھلاہٹ سی تھی۔ بولا — "تمہارے پاس کیوں آتی ہیں؟"

"گانا سیکھنے!" — بڈھے نے کہا اور یوں اِدھر اُدھر دیکھا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو۔ پھر اٹھا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"اِدھر ہی آجاؤ بیٹے!" — دوسرے کمرے سے آواز آئی۔

جیدا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کمرے میں دو تین ٹرنک رکھے تھے۔ ایک پلنگ بچھا تھا اور ایک میز تھی جس پر چائے کے برتن، دیگچی اور چند اور برتن رکھے تھے۔ ایک کونے میں طبلوں کی جوڑی اور ہارمونیم پڑا تھا۔ بڈھا میز پر رکھی دیگچی کا ڈھکنا کھول کے دیکھ رہا تھا۔

"کیا کہا تھا تم نے یہاں کیوں آئے تھے؟" — بڈھے نے جیدا کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"ستار کی آواز سنی تھی" — جیدا نے یوں کہا جیسے کہنا کچھ اور چاہتا تھا۔ خالی خالی سے لہجے میں بولا — "سوچا تم مان گئے تو ایک آدھ راگ سنوں گا"

"سناؤں گا۔ ضرور سناؤں گا" — بڈھا دیگچی اٹھاتے باہر نکل رہا تھا۔ برآمدے میں جا کے بولا — "اِدھر ہی آجا بیٹے!"

جیدا باہر گیا تو دیکھا کہ بڈھا چولہے میں چھوٹی چھوٹی لکڑیاں رکھ رہا تھا۔

"ہر راگ بجا لیتا ہوں بیٹا" — بڈھے نے دیا سلائی جلائی اور کہا — "پر تان سین والا وہ راگ نہ آیا جس سے سنا ہے آگ لگ جاتی تھی.... دیکھو نا چولہا جلاتے وقت بڑی دقّت ہوتی ہے۔ لکڑیاں ہیں کہ جلنے کا نام نہیں لیتیں"

"تم اکیلے رہتے ہو یہاں؟"

"اکیلا!"

"بچّے نہیں ہیں؟"

"اوں ہُوں!" — بڈھے نے چولہے میں پھونک مار کر کہا — "اپنا کوئی نہیں.... ویسے جو بھی آتا ہے اپنا ہی بچّہ ہوتا ہے.... تم بھی میرے بچّے ہو"

جیدا کو بڈھے پر ترس آنے لگا۔ وہ آگے بڑھا اور آگ جلانے لگا لیکن لکڑیاں جل ہی نہیں رہی تھیں۔ پھونکیں مار مار کر اُس کی ناک اور منہ سے پانی بہنے لگا۔ بڈھے نے بڑا جاندار قہقہہ لگایا اور جیدا کو پرے ہٹا کر لکڑیوں تلے کاغذ رکھے اور آگ لگائی۔ ذرا سی دیر بعد چولہا جل اٹھا۔

جیدا آنکھیں مل رہا تھا۔ بڈھے نے سالن کی دیگچی چولہے پر رکھی اور جیدا سے کہا — "دوپہر کو پکایا تھا۔ بہت بچ گیا ہے۔ ہم دونوں کے لیے کافی ہے.... میں روٹیاں اٹھا لاتا ہوں۔ انہیں بھی گرم کر لیتے ہیں۔ تم ذرا چمچہ ہلاتے رہنا"

اور جیدا معصوم سے برخوردار بچّے کی طرح چپ چاپ چمچہ ہلانے بیٹھ گیا۔ چولہے سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور جیدا کی آنکھوں کو لگ رہا تھا لیکن اب اُسے دھوئیں کی چبھن سے ایسی لذت محسوس ہونے لگی جو نئی اور انوکھی نہیں تھی — بہت ہی پرانی، دھندلی دھندلی یاد کی طرح اُس کے ذہن میں محفوظ تھی۔ چولہے کی تپش اور دھوئیں نے جیدا کی داخلی دنیا سے وہ پردہ اُٹھا دیا جو برسوں گزرے گر پڑا تھا اور جیدا کی نظروں سے چولہے چوکے کی دنیا ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گئی تھی۔ اس پردے نے جیدا کی نظروں سے رستے بستے آنگن کی رونقیں اور باورچی خانے میں بجتے برتنوں کا جل ترنگ چھپا لیا تھا۔ اُن لوریوں کی تان ہی توڑ دی تھی اس پردے نے جو آج بھی جیدا کے گرد پھیلتے دھوئیں میں منڈلا رہی تھیں — کبھی کبھی سی مترنم گونج کی طرح!

جب اُس نے دیگچی میں چمچہ ہلایا تو چمچہ دیگچی کے کناروں سے ٹکرانے لگا اور لطیف سی "ٹن ٹن" جیدا کی ہستی میں یوں بجنے لگی جیسے کسی عبادت گاہ میں پجاری گھنٹیاں بجا رہے ہوں اور ساری کائنات عبادت گاہ کی دہلیز پر سجدہ ریز ہوگئی ہو۔ ایک تقدس سا، پیارا سا اور روحانی سا ایک قرار جیدا کو بے خود کرنے لگا۔

اور وہ بے خود ہی ہو گیا۔ گرد و پیش کو بھول ہی گیا اور اس پر وہی طلسم طاری ہونے لگا جو اُس رات طاری ہُوا تھا جب ناز نے اُس کے سامنے چائے کی پیالی رکھی تھی۔ اُس رات تو وہ بھاگ گیا تھا اور شمّی کے ہاں جا پہنچا تھا مگر آج وہ بھاگ نہ سکا نہ بھاگنے کی کوشش کی۔ اس کی جذباتی کیفیت اُس بے بس بیوی کی سی ہوگئی جسے خاوند سے بے پناہ پیار ہو اور وہ خاوند سے دل کھول کر پیار بھری باتیں کرنے کو بیتاب ہو مگر خاوند اُس کے ساتھ بات کرنے سے بھی بیزار ہو۔ وہ بھاگ جانا چاہتی ہو لیکن نہ بھاگنے میں ہی اور اسی خاوند کے قدموں میں ہی سر رکھے رہنے میں ہی اُس کی روح کو قرار ملتا ہو۔

جیدا طلسماتی دنیا میں تحلیل ہوگیا۔

سالن گرم ہوگیا، روٹیاں بھی گرم ہوگئیں۔ فرشی دری پر دسترخوان بھی بچھ گیا۔ بڈھے نے جیدا کو کھانے پر بھی بٹھا لیا اور جیدا کے گرد مترنم سی ایک بڑھیاتی ہوئی آواز، بڑی ہی پیاری، پیار سے لبریز، منڈلانے لگی.... "بیٹا!.... بیٹا.... کھاؤ بیٹا!.... آیا کرو نا بیٹا!"

"تم کہیں نوکر چاکر ہو بیٹا؟" ــــ بڈھے موسیقار نے پوچھا ــــ "کرتے کیا ہو؟"

"جیبیں کاٹتا ہوں ابا جان!" ــــ بے خودی کے عالم میں جیدا کے منہ سے نکل گیا۔

اور طلسم ٹوٹ گیا ــــ اُس کے اپنے منہ سے نکلے ہوئے "ابا جان" کے دو لفظوں نے طلسم توڑ دیا۔ بھونچال کے شدید جھٹکے آنے لگے۔ جیدا کو جیسے کسی نے حسین خواب سے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو۔ اُس نے چونک کر گرد و پیش کو دیکھا ــــ سامنے دسترخوان بچھا تھا جس پر روٹیوں کے ٹکڑے اور خالی پلیٹیں رکھی تھیں، پرے ستار پڑی تھی۔ سامنے بوڑھا بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

جیدا نے پھٹی پھٹی نظروں سے ہر چیز کو دیکھا اور اُسے یوں لگا جیسے ہر چیز اُس پر طنز کر رہی ہو ــــ

"کسے کہا تھا ابا جان؟.... کہاں ہیں تیرے ابا جان؟.... باپ کہاں ہے تمھارا؟.... جیدا.... جیب کترا.... اٹھائی گیر.... ڈکیت!"

خمار یکبارگی اتر گیا۔ سیاہ پردہ گر پڑا اور جیدا نے جس کسی کو بے خودی میں ابا جان کہا تھا، وہ پردے کے عقب میں روپوش ہوگیا۔

وہ اٹھ کھڑا ہُوا۔ بڈھے کو دیکھا اور دوسرے لمحے میں وہ ایک ہی جست میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ بڈھے نے آواز دی ــــ "کہاں چلے بیٹا! سنو تو" ــــ لیکن جیدا صحن بھی پھلانگ گیا تھا۔ بڈھے نے پھر پکارا لیکن باہر کا دروازہ دھماکے سے بند ہُوا اور جیدا کراچی کی پُراسرار رات میں جذب ہوگیا۔

بڈھے موسیقار کے گھر سے تو جیدا بہت تیزی سے نکلا تھا لیکن سڑک پر جا کر اُس کے قدم رکنے لگے پھر وہ رک ہی گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ بندر روڈ کے فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ بسیں، وکٹوریہ، ٹیکسیاں اور رکشا گزر رہے جا رہے تھے لیکن اُس نے کسی کو نہ روکا۔ پیدل ہی چل پڑا۔ اس کے قدموں میں ہر روز والی تیزی اور چال میں

ہر روز والا اضطراری پن نہیں تھا۔ سر جھکا ہُوا تھا جیسے ضمیر نے آج پہلی بار بوجھ اٹھایا ہو یا پہلی بار بوجھ محسوس کیا ہو۔ اُس کے دل میں کانٹا سا اتر گیا تھا جس کی خلش میں تلخی بھی تھی مٹھاس بھی۔

وہ کھارادر سے گزر رہا تھا۔ پولیس کا ایک کانسٹیبل پان والے کی دکان کے سامنے بنچ پر گرا ہُوا بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اُس نے جیدا کو آتے دیکھا تو اٹھ کھڑا ہُوا۔ چند ہی دن گزرے اس علاقے میں جیدا کا ایک چھوکرا جیب کاٹتے موقع پر ہی پکڑا گیا تھا۔ یہ کانسٹیبل ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے چھوکرے کو بڑی صفائی سے ہجوم سے غائب کر دیا تھا۔

کانسٹیبل کو توقع تھی کہ جیدا رُکے گا۔ دو چار باتیں کرے گا۔ علاقے کا حال احوال پوچھے گا اور چلتے چلتے مُٹھی میں پانچ کا مڑا ہُوا نوٹ تھما جائے گا لیکن جیدا سر جھکائے نکل گیا۔ کانسٹیبل اُس کے پیچھے ہو لیا اور چند قدم آگے جا کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"کیوں استاد!" ــــ کانسٹیبل نے کہا ــــ "داؤ ہار آئے یا کوئی مر گیا ہے۔ یوں سر جھکا رکھا ہے جیسے جنازے کے ساتھ جا رہے ہو۔"

جیدا چونکا اور رک گیا۔ اُس کے منہ سے نکل ہی چلا تھا ــــ "یوں لگتا ہے دوست جیسے آج میں ہی مر گیا ہُوں" ــــ لیکن اُس نے کچھ بھی نہ کہا۔ بڑی مشکل سے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا پھیکا سا تاثر پیدا کر کے یوں چل پڑا جیسے کسی نے گہری نیند سے جگا دیا ہو اور وہ کروٹ بدل کر پھر سو گیا ہو۔ وہ تو جیسے نیند میں ہی چل رہا تھا۔

"سو تو نہیں گئے؟" ــــ اُسے کسی نے جھنجھوڑا ــــ "کہاں کھو گئے؟"

جیدا چونک اٹھا۔ دیکھا، وہ اپنے کمرے میں پلنگ پر بیٹھا تھا۔ ناز اُس کے پاس بیٹھی اُسے کندھے سے آہستہ آہستہ جھنجھوڑ رہی تھی۔ جیدا کا شعور بیدار ہوگیا۔ اُسے خیال آیا کہ ناز اسے تین چار بار بلا چکی ہے لیکن اسے یہ یاد نہ آیا کہ وہ کب اور کیسے کمرے میں آ پہنچا ہے۔ اُس کے اعصاب پر ابھی تک بوڑھے موسیقار کا طلسم طاری تھا اور اُس کے ذہن میں دیگچی اور چمچے کا جل ترنگ گونج رہا تھا۔

اُسے تھکن محسوس ہونے لگی اور اسے یاد آنے لگا کہ وہ کراچی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پیدل چلا ہے۔ عام ذہنی کیفیت میں وہ چند قدم بھی پیدل نہ چلتا۔ اسے کوفت سی محسوس ہونے لگی کیونکہ اس نے کبھی شکست تسلیم نہیں کی تھی۔ اس کی جذباتی حالت پہلے بھی کئی بار بگڑی تھی اور وہ چرس کا دم لگا کر یا وہسکی کی آدھی بوتل پی کر سنبھل گیا تھا، مگر آج کا خمار نرالا تھا۔ آج اسے چرس کا خیال آیا نہ شراب کا۔ جانے کس قوت یا کس کمزوری نے اُسے بے بس کر دیا تھا۔

اُس نے ناز کو ایک بار پھر دیکھا۔ اسے ناز کی صورت بدلی بدلی سی نظر آئی۔ ناز کے ساتھ اُس نے کبھی کھل کے بات نہیں کی تھی، حالانکہ وہ نو دس مہینوں سے اُس کے کمرے میں بند تھی۔ اس کے متعلق وہ اسی قدر جانتا تھا کہ اس لڑکی کو اُس نے خریدا ہے اور کبھی نہ کبھی روز اسے بڑے اُونچے گاہکوں کے لیے تیار کرے گا۔ وہ ناز پر بے دریغ پیسہ خرچ کر رہا تھا۔ جانتا تھا کہ یہ پیسہ کاروبار میں لگ رہا ہے جو ناز ہی کے حسن و جوانی سے ایک کے بدلے پچاس کے حساب سے واپس مل جائے گا لیکن آج رات اُس کے دل میں ہلکا ہلکا احساس پیدا ہونے لگا جیسے ناز کاروباری چیز نہیں بلکہ اس کی

اپنی ملکیت ہے اور بھٹکی ہوئی اس لڑکی کا تعلق کچھ نہ کچھ اس کے جذبات کے ساتھ ضرور ہے۔

"میرا پاس بیٹھنا بُرا لگتا ہے تو اٹھ جاؤں؟" — ناز نے اسے گُم گُم دیکھ کر بے چارگی سے کہا۔

جیدا نے یوں چونک کر ناز کو دیکھا جیسے کہنا چاہتا ہو — "نہیں تو تم اٹھ گئیں تو میں کس کے پاس بیٹھوں گا؟" — لیکن وہ کہہ نہ سکا، سنبھل گیا۔ پھر بھی اُس نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ ناز کے ساتھ باتیں کرنا چاہتا ہے لیکن یہ احساس بھی بیدار ہو گیا کہ وہ اس لڑکی سے روحانی سہارے کی بھیک مانگنے چلا ہے جسے اُس نے پانچ سو روپوں پر خرید کر اپنی دنیا میں قید کر رکھا ہے۔

الجھن سے اس خمار میں اب تلخی سی پیدا ہونے لگی۔ دل پر بوجھ سا آپڑا۔ جیدا کی اظہاریت کے ذریعے یہی تھے — جُرم، جُوا، شراب اور چرس — مگر آج وہ دوراہے پر کھڑا تھا۔ اُسے نہ جرم کا خیال آیا نہ جوئے کا نہ شراب کا نہ چرس کا۔ اُس کا سر پھر جھک گیا۔ ناز نے دونوں ہاتھوں سے تھام کر بڑے پیار سے اُس کا سر اٹھایا۔

"کیا بات ہے آج؟" — ناز نے شگفتہ سی سنجیدگی سے پوچھا — "تمھارے منہ سے بُو نہیں آ رہی شراب نہ چرس نہ بھنگ نہ افیم! آخر کیا انوکھی بات ہوئی جو اس قدر کھوئے کھوئے سے ہو؟"

"کیا یہ بات انوکھی نہیں کہ میرے منہ سے کوئی بُو نہیں آ رہی" — جیدا نے کھل کر کہا۔

ناز اٹھی اور دوسرے کمرے سے وہسکی کی بوتل اٹھا لائی اور جیدا کے ہاتھ میں دے دی۔ جیدا نے بغیر توقف کارک نکالا اور بوتل منہ سے لگا کر کئی گھونٹ پی گیا۔

"تمھیں ستار سیکھتے ایک زمانہ ہو گیا ہے" — جیدا نے مُنہ سے بوتل ہٹا کر کہا — "کچھ سیکھا بھی ہے؟"

ناز اُس روز سے بیتاب تھی کہ جیدا کبھی اس کے پاس بیٹھے اور اس سے ستار سنے جس روز اُس نے ستار کا پہلا سبق لیا تھا۔ جیدا کے شوق کے پیشِ نظر ہی اُس نے ستار سیکھنے کا تہیہ کیا تھا لیکن مہینوں گزر گئے، جیدا نے کبھی پوچھا بھی نہ تھا کہ ناز تم نے ستار سیکھ لی ہے؟ آج جیدا نے ستار کا نام ہی لیا تو ناز نے باچھیں کھِلا کر پوچھا — "سنو گے؟ پسند کرو گے؟"

"لاؤ تو سہی!"

ناز دوسرے کمرے سے ستار لے کر آئی تو جیدا پلنگ پر لیٹ چکا تھا۔ ناز اُس کی پائنتی بیٹھ گئی اور دوسرے لمحے ناز کی انگلیاں تاروں پر رینگنے لگیں۔ ناز کے استاد نے اس کی پتلی پتلی لانبی انگلیوں میں استادی کے انگ سمو دیئے تھے۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ جیدا استاد کی چیز ہے۔

ناز نے شام کلیان کا الاپ چھیڑ دیا تھا لیکن وہ جان نہ سکی کہ اُس نے جیدا کی ہستی کے اُس تار کو چھیڑ دیا ہے جسے پہلے کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اور جس پر جیدا نے جرم و گناہ کے تاریک پردے ڈال رکھے تھے۔

کمرے میں تاروں کی ہلکی ہلکی گونج تیرنے لگی جیسے جل پریوں کا غول شب کی خامشی میں سمندر کی سطح پر دھیرے دھیرے گنگناتا جا رہا ہو۔ جیدا کی ہستی میں بوڑھے موسیقار کا سحر جاگ اٹھا۔ اس نے کنکھیوں سے ناز کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہا حتّٰی کہ اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد ناز نے دیکھا جیدا گہری نیند سو رہا تھا اور اس کی پلکوں نے دو آنسو تھام رکھے تھے۔

جیدا کی آنکھ کھلی۔ صبح کا اجالا پھیل رہا تھا۔ جیدا نے اس اجالے کو یوں دیکھا جیسے زندگی کی پہلی صبح کو دیکھ رہا ہو۔ اُس نے انگڑائی لی پھر جمائی لی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے اپنی انگڑائی اور جمائی کو محسوس کیا۔ اُسے خیال آیا شاید وہ ہر صبح اسی طرح انگڑائیاں لے کر اٹھتا ہے۔ وہ اٹھ بیٹھا اور کھڑکی میں سے صبح کی سپیدی کو دیکھنے لگا۔ اُسے ماحول میں تبدیلی سی محسوس ہو رہی تھی جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

وہ صبح کو دیکھ رہا تھا کہ ناز آگئی۔ اُس کے ہاتھ میں ناشتے کی ٹرے تھی۔ جیدا ناز کو یوں دیکھنے لگا جیسے اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس سے پہلے ناز کاجل، پوڈر اور لپ سٹک سے آراستہ ہو کر اُس کے سامنے بیٹھی رہتی تھی لیکن جیدا نے اس میں کبھی کوئی کشش، کوئی انوکھا پن یا کوئی ندرت نہیں دیکھی تھی اور آج صبح ناز نے ابھی تک منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا تھا، نیند کا خمار ابھی تک پلکوں پر اونگھ رہا تھا، چہرے پر شب بیداری کے آثار بھی تھے، پھر بھی جیدا نے اُس میں جاذبیت محسوس کی۔ وہ جیسے اپنے آپ سے کہہ اٹھا ہو — "یہ لڑکی میرے پاس بیٹھتی کیوں نہیں؟ میرا سر جھکا کر میرے منہ پر پانی کے چھینٹے کیوں نہیں مارتی؟"

ناز اُس کے سامنے بیٹھی چائے بنا رہی تھی، اُس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ جیدا کی آنکھیں اس کے بکھرے بکھرے بالوں سے کھیلنے لگیں۔ وہ اپنے آپ میں ایک کشمکش میں اُلجھ گیا۔ وہ ایک کوشش میں مصروف ہو گیا، صرف اتنا کہنے یا اتنا نہ کہنے کی کوشش میں کہ ناز! آج تم مجھے بہت اچھی لگ رہی ہو۔

اُس نے ہمّت باندھی لیکن اپنی ہی کسی قوت یا اپنی ہی کسی کمزوری نے اس کی ہمّت پست کر دی۔ وہ سٹپٹا اٹھا۔ ادھر ناز نے اسے گُم سُم دیکھ کر کہہ دیا — "جیدا کیا سوچ رہے ہو؟ نیند پوری نہیں ہوئی تو ناشتہ کر کے سو جانا۔"

جیدا کا انگ انگ بیدار ہو گیا۔ وہ اپنے آپ میں جھنجھلایا۔ لپک کر چائے کی پیالی اٹھائی اور حلق میں انڈیل دی۔ ایک ٹوسٹ اٹھایا، اٹھا، ٹوسٹ کا ایک ہی نوالا بنا کر منہ میں پھینکا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

ناز اُسے دیکھتی رہی پیشتر اس کے کہ وہ اُسے روکتی وہ جا چکا تھا۔ وہ سمجھی شاید وہ روزمرّہ کے چکّر میں نکل گیا ہو گا لیکن جیدا کمرے سے نکلا تھا، مکان سے باہر نہیں گیا تھا۔ وہ برآمدوں میں سے ہوتا ہُوا منّے اور ٹیپو کے کمرے میں چلا گیا جہاں وہ شام تک نہ جاگنے کے ارادے سے گہری نیند سوتے ہوتے تھے۔ یہ جیدا کی اپنی دنیا تھی جہاں اُس کی حکمرانی تھی۔ جہاں کوئی ذہنی کش مکش نہیں تھی، جہاں کوئی جذبات نہیں تھے، کوئی بُڈھا موسیقار نہیں تھا، جہاں بستے گھر کے چولہے کا دُھواں اور برتنوں کا جل ترنگ نہیں تھا۔ اُس کی دنیا میں کوئی نغمہ نہیں کوئی ساز نہیں تھا، اور اس زمیں دوز دنیا میں کوئی دوراہا نہیں تھا۔ اُس نے گرد آلود فرش پر کمبل بچھایا، لیٹ گیا اور لیٹتے ہی سو گیا اور ایک ثانیے میں پیار اور نغموں کی دنیا سے نکل بھاگا۔

ناز کو معلوم نہ ہو سکا کہ جیدا ساتھ والے کمرے میں گُم ہو گیا ہے۔ وہ اس کمرے میں بہت کم جایا کرتی تھی۔

رات جب ناز لڑکے کو ساتھ لے کر استاد کے ہاں ستار کی مشق کرنے چلی گئی تو جیدا کی آنکھ کھلی۔

"ابّن کی بیوی نے بلا بھیجا ہے" — منّے نے اُسے بتایا — "ٹیپو وہاں چلا گیا ہے اور تمھیں

بلا گیا ہے۔"

جیدا جلدی سے اٹھا۔ چہرے پر نقلی سیاہ داڑھی لگائی، سر پر ململ کی ٹوپی رکھی، پاجامہ نما پتلون اتار کر تنگ پاجامہ پہنا، اوپر چادر اوڑھی، پستول ناف میں اڑسا اور باہر نکل گیا۔

وہ ابّن کے ہاں پہنچا تو ٹیپو کو وہاں سر جھکاتے بیٹھے دیکھا۔ ابّن کے بچّے سوتے ہوئے تھے پہلو کے کمرے کا دروازہ بند تھا جس کے عقب سے گھٹی گھٹی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ یکبارگی ہولناک آہ و بکا بلند ہوئی۔ جیدا اور ٹیپو بند دروازے پر نظریں گاڑے ہوتے تھے۔ دونوں نے آپس میں کوئی بات نہ کی۔

تھوڑی دیر بعد آہ و بکا تھم گئی اور نوزائیدہ بچّے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ جیدا اور ٹیپو سراپا انتظار بنے بند دروازے کو دیکھ رہے تھے۔

دروازہ کھلا اور ابّن کی بیوی، پریشاں حال اور اُداس باہر آئی۔

"لڑکا پیدا ہوا ہے"۔۔۔ اُس نے بیزاری سے کہا۔

"اور زینت؟"۔۔۔ جیدا نے پوچھا۔

"وہ ٹھیک ہے"۔۔۔ اِبّن کی بیوی نے جواب دیا۔

"بچّہ ابھی لے جاؤں؟"۔۔۔ جیدا نے ذرا سوچ کر پوچھا۔

"ابھی؟"۔۔۔ اِبّن کی بیوی نے پوچھا۔۔۔ "لے کہاں جاؤ گے؟ کہیں۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئی اور اُس کے آنسو نکل آتے۔

"ہاں ابھی!"۔۔۔ جیدا نے کہا۔۔۔ "میں بچّے کو کہیں پھینکوں گا نہیں۔ یہ بچّہ زندہ رہے گا میرے ہاں تمھارے ہاں نہیں۔ تمھاری اور زینت کی پریشانی آج ختم ہو گئی ہے۔ اب چین آرام سے رہو۔ بچّہ مجھے لا دو۔ ٹیپو یہاں رہے گا۔ کوئی ضرورت ہو تو اسے کہنا۔۔۔ بچّہ لا دو۔"

اِبّن کی بیوی سر جھکاتے چلی گئی اور بچّہ لا کر جیدا کی جھولی میں ڈال دیا۔ جیدا نوزائیدہ بچّے کو اٹھائے اندھیرے میں گم ہو گیا اور ابّن کی بیوی آنسو پونچھتے ہوتے اپنی بیٹی کے پاس چلی گئی۔

لطیف سے جھٹکوں نے ناز کو گہری نیند سے جگا دیا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ اُس کی آنکھ کھلی تو آنکھیں چندھیا گئیں۔ لالٹین جل رہی تھی۔ اُس نے دیکھا۔ جیدا ایک نوزائیدہ بچّے کو بازوؤں پر اُٹھائے پلنگ کے پاس کھڑا تھا۔ ناز گھبرا کے اُٹھ بیٹھی۔

"ناز یہ لو بچّہ!"۔۔۔ جیدا نے کہا۔

"کہاں سے اٹھا لائے ہو یہ بچّہ؟"۔۔۔ ناز نے گھبراہٹ اور استعجاب سے پوچھا۔۔۔ "یہ بچّہ کس کا ہے؟"

"تم نے کہا نہیں تھا کہ اس گھر میں ایک ننھا کھیلے تو۔۔۔"

"اوہ جیدے!"۔۔۔ ناز نے جیسے سر پیٹ لیا ہو۔ بولی۔۔۔ "خُدا نے تجھے کیسا ظالم بنا دیا ہے کس مامتا کی ماری کی کوکھ اجاڑ دی ہے تم نے؟"

"جسے ابھی بچے کی ضرورت نہیں تھی"۔۔۔ جیدا نے بچّہ ناز کی طرف بڑھاتے ہوتے کہا۔۔۔ "یہ

بچہ تمھارا ہے۔"

ناز نے جھجکتے ہوتے بچّے کو ہاتھوں میں لے لیا اور جیدا نے اُسے بچّے سے متعلق ساری بات سنا دی۔

"اوہ۔۔۔۔ مجھے یاد آ گیا"۔۔۔ ناز نے کہا۔۔۔ "یہ اُس رات کی بات ہے، بادل اُسی رات سے غائب ہے۔ وہ ہے کہاں؟"

"اپنے کیے کی سزا پا گیا ہے"۔۔۔ جیدا نے کہا۔۔۔ "وہ زندہ نہیں۔"

"تم نے اُسے؟۔۔۔"

"ہاں! میں نے اُسے مروا دیا تھا"۔۔۔ جیدا نے یوں کہا جیسے اُس نے کوئی خارش زدہ یا باؤلا کتا مروا دیا ہو۔ اُس کے لہجے میں تاسف نہیں تھا، ڈر نہیں تھا جیسے اُسے معلوم ہی نہ ہو کہ قتل کی سزا موت ہے یا عمر قید۔

"تم نے اپنے آپ کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر رکھا ہے"۔۔۔ ناز نے کہا۔۔۔ "پولیس نے بادل کے قتل کی تفتیش تو کی ہو گی۔"

"کس پولیس کی بات کر رہی ہو؟"۔۔۔ جیدا نے پوچھا۔۔۔ "انگلینڈ کے سکاٹ لینڈ یارڈ کی؟ میں پاکستان کی پولیس کی بات کر رہا ہوں۔ بادل کی لاش پولیس کو ملی تھی تو پولیس نے سب سے پہلے مجھے بلایا تھا تھانیدار کو معلوم تھا کہ بادل میرا آدمی تھا۔ میں نے اُسے کہا تھا۔۔۔ 'جانے دو'۔۔۔ اور پولیس نے لاش لاوارث قرار دے کر دفن کر دی یا کسی میڈیکل کالج کو دے دی ہو گی۔"

"تھانیدار تم سے اتنا ڈرتا ہے کہ۔۔۔"

"اُس کا ایک بیٹا کالج میں داخل ہوا تو باپ سے کہنے لگا کہ کالج بہت دور ہے سکوٹر لے دو"۔۔۔ جیدا نے کہا۔۔۔ "تھانیدار نے مجھے بتایا۔۔۔۔ میں نے اُس کے بیٹے کو سیکنڈ ہینڈ سکوٹر لے دیا تھا۔۔۔ ان باتوں کے ساتھ تمھارا کوئی تعلق نہیں ہے ناز! اس بچّے کو اپنے بچّے کی طرح پالنا ہے۔"

"میں اسے اپنے ہی بچّے کی طرح پالوں گی جیدا!"۔۔۔ ناز کے جذبات مرتعش ہو گئے تھے۔ بولی۔۔۔ "یہ میرا بچّہ ہے"۔۔۔ اور اُس نے بچّے کو سینے سے لگا لیا۔

"ناز!"۔۔۔ جیدا نے کہا۔۔۔ "اس بچّے کی پرورش اور تربیّت ایسی ہو، ایسی ہو۔۔۔۔"

"جیسی؟"

"جیسی میری نہیں ہوئی تھی"۔۔۔ جیدا نے دکھ زدہ لہجے میں کہا۔

"ویسی ہی ہو گی جیدا!"۔۔۔ ناز نے کہا۔۔۔ "لیکن ایک وعدہ تم بھی کرو۔"

"کیا؟"

"کہ اب اس کمرے کی فضا اس معصوم کی طرح پاک رہے گی"۔۔۔ ناز نے کہا۔۔۔ "یہاں کوئی گناہ نہیں ہو گا۔ کوئی جرم نہیں ہو گا۔ یہاں شراب نہیں آئے گی اور نہ تم یہاں شراب اور چرس پی کر آؤ گے۔"

"نہیں!"۔۔۔ جیدا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔۔۔ "میں نے کبھی جھوٹا وعدہ نہیں کیا۔ وہی کہوں گا جو کر سکتا ہوں۔۔۔۔ ہاں یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ میں اس کمرے میں نہیں آیا کروں گا۔"

"یہ مجھے منظور نہیں۔"

"اور وہ مجھے منظور نہیں"۔۔۔ جیدا نے کہا۔

ناز چپ ہو گئی۔ اُس نے گود میں کلبلاتے بچّے کو دیکھا۔ پھر جیدا کو دیکھا۔ وہ جانے کس تصور میں کھو چلی تھی کہ جیدا اٹھ کے چل پڑا۔

"کہاں جا رہے ہو؟"۔۔۔ ناز نے پوچھا۔

"دوسرے کمرے میں!"۔۔۔ جیدا نے جواب دیا۔

"نہیں!"۔۔۔ ناز نے کہا۔۔۔"یہیں سوؤ، اسی کمرے میں۔"

جیدا لوٹ آیا۔ دوسرے پلنگ پر لیٹ گیا اور چھت کو گھورنے لگا۔

"اس کے لیے جو کچھ ضرورت ہو صبح لڑکے سے منگوا لینا"۔۔۔ جیدا نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔"دودھ کی بوتل وغیرہ!"

ناز نے جب روئی جیسے ملائم بچّے کو اپنے سینے سے لگایا تو اُس کے رگ و ریشہ میں مسرّت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ بے خود سی ہونے لگی۔ اس نے بچّے کی بند مٹھی کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تو ناز کے سینے میں جیسے ماں کی مامتا بول اٹھی ہو۔۔۔"ننھے تیری پرورش ویسی نہیں ہوگی جیسی جیدا کی ہوئی تھی۔"

جیدا نے ناز کو اور بچّے کو کنکھیوں دیکھا اور کروٹ بدل کے سو گیا۔

جیدا بندر روڈ پر تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ نیپئر روڈ سے ہزار تیّے کی ٹیکسی لے کر آگے جائے گا۔ صبح صبح اُسے پیغام ملا تھا کہ ایک سابق سفیر نے بلایا ہے جو کسی ملک میں پاکستان کا سفیر تھا اور ملک کے بدلے ہوئے حالات کو دیکھ کر سفارت سے مستعفی ہو گیا تھا۔۔۔ بدلتے حالات کو سدھارنے نہیں بلکہ ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے۔

وزارتیں دھڑا دھڑ ٹوٹ رہی تھیں۔ سب سے اونچی کرسی پر جم کے بیٹھا ایک شخص ملک کے تمام سیاستدانوں کو شطرنج کے مہروں کی طرح استعمال کر رہا تھا۔ ان چالوں کے بغیر اس کی کرسی ڈولتی تھی۔ بساط پر اسی کا قبضہ تھا۔ وہ سیاستدانوں سے ہی نہیں دس کروڑ انسانوں سے کھیل رہا تھا۔ جیت ہر حال میں اسی کی تھی دس کروڑ زندہ لاشوں کی سسکیاں اونچے ایوانوں تک پہنچ نہ پاتی تھیں۔

عوام ان بنتی ٹوٹتی وزارتوں کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے کسان پیاسے کھیتوں کے کنارے کھڑا آسمان پر اڑتے بادلوں کو دیکھ رہا ہو اور بادل کے ہر نئے ٹکڑے کو دیکھ کر پکار اٹھے۔۔۔"یہ تو ضرور برسے گا"۔۔۔ کچھ بادل گرجتے ہوئے آتے اور گرجتے ہوتے چلے گئے، پھر بھی لوگ اخباروں کی موٹی موٹی سرخیاں اور وعدوں سے سجے ہوتے بیانات اور تقریریں پڑھ کر اپنے آپ کو فریب دیے ہی لیا کرتے تھے۔ دن دہاڑے لُٹے ہوئے گھروں اور بارش کے پانی میں ڈوبتی تیرتی جھگیوں کو دیکھ کر بھی لوگ امید کو سینے سے لگاتے ہی رہے۔ امید دم توڑنے لگتی تھی تو وزارت ٹوٹ جاتی تھی اور ایک اور وزیراعظم نئے وعدے لیے وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر آ بیٹھتا تھا۔

بزدلی اور خود فریبی کے مارے ہوئے عوام کو غالباً معلوم نہ تھا کہ ملکی سیاست، معاشرت اور معاشیات میں وزیروں اور وزیراعظموں کا نہیں جیدا اور اس کی قماش کے چند درا ستادوں کا عمل دخل ہے۔

جیدا بندر روڈ پر جا رہا تھا اور فٹ پاتھ پر متحرک ہجوم کو معلوم ہی نہیں تھا کہ کل صبح جب وہ اخباروں میں کسی سیاسی جلسے میں کسی لیڈر کی تقریر کے دوران ہلڑ بازی کی خبریں پڑھیں گے تو اس کے پس منظر میں اسی جیدا اور اس کے گروہ کا ہاتھ ہوگا۔ ہجوم میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ جو کارپوریشن کے آنے والے انتخابات کا ہنگامہ سن رہے ہیں وہ اسی عام سے لوفر انسان کے بل بوتے پر لڑے جائیں گے جسے دن کی روشنی نہیں رات کے اندھیرے پہچانتے ہیں یا پولیس پہچانتی ہے اور پولیس ایسے بہت سے جیدوں کو پہچانتی ہے جو ہر سیاسی پارٹی میں پردوں کے پیچھے موجود ہیں اور "بغل میں چھُری" کا کام دیتے ہیں۔

اور یہ عام سا گمنام سا انسان اُس سفیر کے بلاوے پر جا رہا تھا جو سیاست کے اکھاڑے میں اترنے کے لیے سفارت کو لات مار آیا تھا۔ جیدا کی مدد کے بغیر اس کی جیت ممکن نہیں تھی۔ وہ جیدا کا پرانا گاہک تھا۔ اس اُستاد جرائم پیشہ نے پہلے بھی اس سیاست دان کی حریف پارٹیوں کے جلسے جلوسوں میں دنگا فساد بپا کیا تھا۔ مردہ باد کے نعرے لگواتے تھے اور کوئی جلسہ کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔ جیدا کا گروہ ان کاموں میں ماہر تھا اور منہ مانگے دام لیتا تھا۔ اس لحاظ سے جیدا پاکستان کا کامیاب ترین سیاستدان تھا۔

وہ بندر روڈ پر بہت تیز چلا جا رہا تھا۔ بندر روڈ کے فٹ پاتھ پر تیز کون چلنے دیتا ہے۔ وہاں صرف پیدل چلنے والے لوگ ہی نہیں ہوتے۔ اس دو گز چوڑے راستے پر ہر قسم کی دکانیں سجی ہوئی ہوتی ہیں کیبن، ریڑھے چھابڑیاں، دوکانوں کے آگے بڑھے ہوئے تختے، بوٹ پالش والے سفری دندان ساز حکیموں کے مجمعے آئس کریم اور شربت بیچنے والے، گنّے کا رس نکالنے والے بیلنے۔ جرم و جاسوسی کے ناول بیچنے والوں کے ناول پھیلائے ہوتے ہیں اور کپڑا فروشوں نے کپڑے کے تھان کھول کر راہ میں بکھیرے ہوتے ہیں۔ ذرا آگے جوتشیوں اور نجومیوں کی قطار بیٹھی ہوتی ہے۔ ان فٹ پاتھوں پر کھوئے ملائی سے لے کر کھوئی ہوئی جوانی تک سب کچھ مل جاتا ہے۔ صرف ایک چیز ناپید ہے۔۔۔ چلنے کا راستہ!

جیدا کپڑے کے تھانوں اور ناولوں کو پھلانگتا، دھکے دیتا اور دھکے کھاتا اپنا راستہ بناتا جا رہا تھا کہ اس کا پاؤں فٹ پاتھ پر بچھے ہوئے کمبل میں اُلجھ گیا۔ اس نے رُک کے نیچے دیکھا۔ ایک جوتشی نے کمبل پھیلا کر اس پر اپنا ساز و سامان سجا رکھا تھا۔ سامنے ایک تختی تھی جس پر ہاتھ کا خاکہ تھا اور لکھا تھا۔۔۔"آپ کی قسمت آپ کے ہاتھ میں ہے۔"

"جری ٹھہر جا سیٹھ!"۔۔۔ جوتشی نے جیدا کو روکتے ہوئے کہا۔۔۔"تیرے ماتھے پر ایک لکیر ہے جو کسی ماتھے پر نہیں ہوتی۔ تو بڑا بھاگوان ہے۔ بڑا نیک ہے۔"

جیدا کو غصہ آ گیا۔ اُس نے سوچا یہ لوگ کس قدر بے ایمان اور بزدل ہیں کہ لوگوں کو فریب دے کر پیسے بٹور لیتے ہیں۔ کیوں نہیں یہ اُٹھ کے جیبیں کاٹتے اور تالے توڑتے؟

اُس نے کمبل میں اُلجھا ہوا پاؤں نکالا تو دیکھا کہ جوتشی کی پوتھی کے نیچے سے پانچ کے نوٹ کا کونہ نظر آ رہا تھا۔ جیدا بیٹھ گیا۔

جوتشی نے پوتھی اٹھائی تو نوٹ سامنے کمبل پر پڑا نظر آیا۔ جوتشی نے پوتھی کھول کر جیدا سے کہا کہ پانچ آنے پوتھی پر رکھ کر کسی خانے میں انگلی رکھ دے۔ جیدا نے آگے جھک کر ایک ہاتھ اُس کے پانچ کے نوٹ پر اور دوسرے ہاتھ کی انگلی پوتھی کے ایک خانے میں رکھ دی۔

"تیری قسمت ہے بڑی تیز سیٹھ" — جوتشی نے کہا — "پانچ آنے دھر دے، تیرے کو اندر باہر کا حال بتا دیں۔"

جیدا نے لکنت سے کہا — "پھر آؤں گا جوتشی بابا! ابھی بہت جلدی میں ہوں" وہ اٹھا اور بندر روڈ کی بھیڑ میں گم ہو گیا۔

جوتشی پوتھی کمبل پر رکھنے لگا تو اُسے پانچ کے نوٹ کا خیال آیا لیکن نوٹ غائب تھا۔ نوٹ اُس "سیٹھ" کے ساتھ چلا گیا تھا جسے اُس نے کہا تھا کہ تو بڑا بھاگوان ہے، بڑا نیک ہے اور تیری قسمت بڑی تیز ہے۔

جیدا جب بندر روڈ کے ٹرام جنکشن پر پہنچا تو علاقے کے کانسٹیبل نے اُسے دیکھ لیا۔ وہ زور سے کھانسا تو جیدا نے اُسے دیکھا۔ کانسٹیبل بھکاریوں کی سی مسکراہٹ مسکرایا۔ جیدا نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جیب کے اندر ہی پانچ کے نوٹ کو موڑ توڑ دیا اور کانسٹیبل کے قریب سے گزرتے ہوئے اُس کے ہاتھ میں دے کر آگے نکل گیا۔

کانسٹیبل کی مسکراہٹ اور زیادہ پھیل گئی اور اُس نے کہا — "جیو بھاگوان جیو۔"

جیدا نے ٹیکسی سٹینڈ سے ٹیکسی لی اور سابق سفیر کے ہاں پہنچا اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ اُس کی محل نما کوٹھی کے ڈرائینگ روم میں بیٹھا وہسکی کی بوتل اور گلاس سامنے رکھے سیاستدان کا پیش کیا ہوا غیر ملکی سگار پی رہا تھا۔ سیاست دان جیدا کو بتا چکا تھا کہ وہ پھر سیاست کے میدان میں آ گیا ہے اور اُس کے عزائم کیا ہیں اور یہ کہ وہ حریف پارٹی کے پاؤں اکھاڑنا چاہتا ہے۔ اس نے اپنے پروگرام جیدا کو سنا ڈالے۔

یہ سیاستدان سندھ کے وڈیروں کا وڈیرا تھا۔ زمین اتنی کہ اپنے آپ کو مخلوقِ خدا کا روزی رساں سمجھتا تھا۔ دولت کے دریا بہتے تھے۔ ضرورت پیش آتے تو وہ پارٹی بدل لیا کرتا تھا۔ اکثر برسرِ اقتدار پارٹی میں رہتا تھا۔ اب جس پارٹی میں تھا، اُس نے اسے کوئی وزارت دینے کی بجائے سفیر بنا کر ملک سے باہر بھیج دیا تھا۔ اُس نے وہاں اپنے ملک کے روپے پیسے سے عیش و عشرت تو بہت کی لیکن اُسے وزارت والا مزہ نہ آیا۔ اسے سفارتی فرائض کا نہ علم تھا نہ دلچسپی۔ جس ملک میں وہ سفیر بن کے گیا تھا وہاں کے لوگ پاکستان سے صرف اتنی سی واقفیت رکھتے تھے کہ یہ کوئی گمنام سا ملک ہے اور اس کا ایک سفارت خانہ بھی ہے۔

اس دوران پاکستان کا ایک مرکزی وزیر اس ملک کے دورے پر گیا۔ دورے کا مقصد یہ تھا کہ اس وزیر نے ابھی یہ ملک نہیں دیکھا تھا۔ لہٰذا اُس نے سیر و سیاحت کو سرکاری دورے کا نام دے کر تمام اخراجات حکومتِ پاکستان سے وصول کیے۔ اُس کی ملاقات اس سفیر سے ہوئی تو وزیر نے اُسے بتایا:

"آپ ہیں تو بڑے پرانے سیاسی لیڈر لیکن آپ جھانسے میں آ گئے۔ آپ دیکھتے رہتے ہیں کہ پاکستان کی حکومت اُن سیاسی لیڈروں کو سفیر بنا کر دوسرے ملکوں میں بھیجتی ہے جن سے اُسے خطرہ ہوتا ہے، یا اُن لیڈروں کو جنہیں برسرِ اقتدار پارٹی انعام دینا چاہتی ہے۔ آپ کو اس پارٹی نے دراصل ملک سے نکالا ہے کیونکہ وزیراعظم آپ کی جگہ ایک اور لیڈر کو ایک وزارت دینا چاہتا تھا۔ آپ کے خلاف پارٹی کے اندر سازش ہوئی ہے۔ آپ سفارت کی عیاشیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ملک میں آپ کی مقبولیت ختم ہو رہی ہے۔ وہاں آئے دن وزارتیں ٹوٹتی اور بنتی ہیں۔ آپ سفارت سے استعفیٰ دیں اور پاکستان میں جا کر اپنی مقبولیت بحال کریں۔"

بات سفیر کی سمجھ میں آ گئی۔ اُس نے اُسی روز استعفیٰ بھیج دیا جو فوراً ہی منظور ہو گیا۔ سفیر پاکستان میں آ گیا اور جس وزیر نے اسے استعفیٰ دینے کا مشورہ دیا تھا، وہ سفیر بن کر اس ملک میں چلا گیا۔ اُسے سفیر بننے کا بہت شوق تھا۔ اُس نے وزیراعظم کی بہت خدمت کی تھی۔ وزیراعظم نے اسے کہا تھا کہ کسی سفیر سے استعفیٰ دلا دو اور اُس کی جگہ تم چلے جاؤ۔ چنانچہ جس وقت سابق سفیر کراچی میں آ کر سیاست کے میدان میں اُترا اور اُس نے جیدا کو اپنے ہاں بلایا اس وقت سابق وزیر سمندر پار کے ایک ملک میں سفیر بن کر عیش کر رہا تھا، شراب پی رہا تھا اور اُس نے اس ملک کی بڑی ہی حسین سوسائٹی گرلز اپنے گرد جمع کر لی تھیں۔

سابق سفیر پاکستان میں آ کر سیاسی اکھاڑے میں اتر چکا تھا۔ کامیاب سیاسی لیڈر کی تمام خوبیاں اس میں موجود تھیں۔ اس کے پاس پانی کی طرح بہانے کے لیے پیسہ تھا۔ دوسری خوبی یہ کہ جیدا جیسے جرائم پیشہ لوگ اور غنڈے اس کے ہاتھ میں تھے۔ نامی گرامی استاد تو برسرِ اقتدار پارٹی کے پاس تھے لیکن زیادہ اُجرت پیش کرو تو مخالف پارٹی کا کام بھی کر دیتے تھے۔ سیاسی لیڈران کے ممنون رہتے تھے۔ ان کے بغیر کوئی سیاسی پارٹی کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔

اس سابق سفیر کی حریف پارٹی کا جلسہ دوسرے دن آرام باغ میں ہو رہا تھا۔ دو اخباروں نے اس کا خوب پروپیگنڈہ کیا تھا۔ جس طرح سیاسی پارٹیوں کو جیدا جیسے استاد مل جاتے تھے، اسی طرح سودا طے کر کے اخباروں کی حمایت بھی خرید لی جاتی تھی۔

"تو جیدا بھائی! یہ جلسہ کامیاب نہ ہونے پائے" — سابق سفیر نے کہا — "تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہے" — اُس نے آہ بھر کر کہا — "اگر یہ پارٹی کامیاب ہو گئی تو ملک کا بیڑہ غرق ہو جائے گا۔ عوام بھوکے مر رہے ہیں۔ مہنگائی دیکھو کہاں تک جا پہنچی ہے" — اس نے وہسکی کی بوتل کھولی اور تین چار پیگ گلاس میں انڈیلنے اور دو تین گھونٹ پی کر اُس نے بلند آواز سے سانس چھوڑی اور بولا — "آدھی قوم ہر رات بھوکی سو جاتی ہے۔ میں جب اپنے عوام کی یہ حالت دیکھتا ہوں تو رات کی نیند اڑ جاتی ہے۔ میں صحیح معنوں میں جمہوریت بحال کرنا چاہتا ہوں، اور میں ....."

جیدا نے اُس کی ران پر ہاتھ رکھ کر دبایا اور بولا — "سائیں! آپ جلسے میں تقریر نہیں کر رہے، جیب کترے سے بات کر رہے ہیں۔ قوم جس طرح پہلے بھوکی سو جایا کرتی ہے اسی طرح آپ کی حکومت میں بھی بھوکی سو جایا کرے گی۔ آپ فکر نہ کریں میرے ساتھ معاملے کی بات کریں"

سیاسی لیڈر نے کھسیانہ سا ہو کے کہا — "میں جمہوریت کی بات کر رہا ہوں۔ اس ملک میں جمہوریت کے نام پر عوام کی قسمت ....."

جیدا نے ہنس کر اُس کی بات کاٹ دی اور کہا — "سائیں میرے! آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس ملک میں میری جمہوریت چل رہی ہے .... جیب کتروں اور اٹھائی گیروں کی جمہوریت"

سیاسی لیڈر اپنے آپ میں آ گیا اور مسکرا کر بولا — "تمہارے پاس آدمیوں کی کمی تو نہیں؟"

"نہ جی" — جیدا نے کہا — "آدمیوں کی کوئی کمی نہیں۔ آپ گندم امریکہ سے لیتے رہیں، غنڈے بدمعاش مجھ سے لیں۔ ہمارا ملک صرف اناج پیدا نہیں کر سکتا۔ غنڈے بدمعاش اتنے ہیں کہ آپ دوسرے ملکوں کو بھی سپلائی کر سکتے ہیں۔ یہ سیاست اور آپ جیسے لیڈروں کی جمہوریت چلتی رہی تو ملک میں مجرموں کی اور ہاتھ کی صفائی سے روزی کمانے والوں کی اور کرائے کے غنڈوں کی کمی نہیں رہے گی .... آپ فکر نہ کریں۔ میرے پاس اتنے جیب کترے اور اٹھائی گیر ہیں جو ایک نہیں دس جلسوں کا ستیاناس کر سکتے ہیں"

"میرے دوست!" — سیاسی لیڈر نے جیدا کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا — "منہ مانگے دام دوں گا۔ کل کا جلسہ تباہ کر دو۔ اور تباہ اس طرح کرو کہ دیکھنے والے سمجھیں کہ یہ ہنگامہ لوگوں نے کیا ہے۔ یہ کام میری مرضی کے مطابق کر دو پھر سارے کراچی میں تالے توڑتے پھرو، ڈاکے ڈالو، جو جی میں آتے کرو۔ تمہارا کوئی ایک بھی آدمی پکڑا گیا تو اپنا آدمی مجھ سے لے جانا"

"میں جب کرنے پر آتا ہوں تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں کیا کچھ کر گزرتا ہوں" — جیدا نے کہا — "آپ کو یاد ہو گا، دسمبر ۱۹۵۲ء میں سکولوں کالجوں کے لڑکوں نے اپنے مطالبے منوانے کے لیے کیا کیا تھا؟ .... ہر روز جلوس نکالتے اور مظاہرے کرتے تھے مگر ہنگامہ نہیں کرتے تھے۔ اُن کے مظاہرے اور جلوس پُرامن ہوتے تھے۔ اُس وقت بھی آپ ہی کی حکومت تھی۔ آپ کی حکومت کو لڑکوں پر تشدد کرنے کا کوئی جواز نہیں ملتا تھا۔ آپ کے اشارے پر میرے لڑکوں نے جلوس میں طالب علموں کے روپ میں شامل ہو کر توڑ پھوڑ، لوٹ مار اور ہنگامے شروع کر دیے تھے۔ پُرامن جلوس فساد بن گیا اور پولیس نے لڑکوں پر آنسو گیس بھی چھوڑی اور گولی بھی چلائی تھی۔ آپ بھولے تو نہیں ہوں گے کہ سینکڑوں لڑکوں کو آپ کی حکومت نے ایک وزیر کی کار کو آگ لگانے کے جرم میں گرفتار کر لیا تھا۔ یہ تو کسی کو بھی پتہ نہ چل سکا تھا کہ کار کو آگ لگانے والے میرے آدمی تھے اور کار کو آگ لگانے کا اشارہ کار والے وزیر نے کیا تھا"

"وہ کار سرکاری تھی" — سیاسی لیڈر نے کہا — "اگر تم لوگ لڑکوں کے جلوس اور مظاہروں کو دنگا فساد کی شکل نہ دیتے تو لڑکے ہمارے لیے مصیبت بنے رہتے .... وہ تمہارا کمال تھا جیدا بھائی! اسی لیے میری پارٹی نے کبھی کسی اور استاد کا سہارا نہیں لیا .... اچھا، اپنی کہو تمہاری پارٹی کا کیا حال ہے؟ کوئی پکڑ دکڑ تو نہیں ہوئی؟"

"میری پارٹی مزے میں ہے" — جیدا نے بوتل میں بچی ہوئی وہسکی اپنے گلاس میں انڈیلتے ہوئے جواب دیا — "اکّا دکّا چھوکرا پکڑا جاتا ہے جس کی میں پروا نہیں کیا کرتا۔ ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ چھوکرے جیل میں جا کر تیز ہو آتے ہیں۔ انھیں ذرا آرام بھی مل جاتا ہے .... اور کبھی کبھی ایک دو چھوکرے میں خود پکڑوا دیا کرتا ہوں تاکہ تھانے والوں کی کارگزاری پوری ہوتی رہے۔ اخباروں میں خبریں شائع کرائی جاتی ہیں کہ کراچی کے ایک بدنام چور کو پولیس نے ڈرامائی انداز میں بڑی دلیری سے پکڑا ہے۔ دو تین کانسٹیبلوں کو آئی جی پانچ پانچ سو روپیہ انعام دیتا ہے اور لوگ خوش ہو جاتے ہیں کہ ہماری پولیس بڑی ہوشیار ہے"

"ہاں بھائی!" — سیاسی لیڈر نے کہا — "ہمیں پولیس کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ہم اپنے مخالفین کو تمہارے ہاتھوں یا پولیس کے ہاتھوں ختم کرایا کرتے ہیں۔ تم تو اپنے آدمی ہو لیکن پولیس کو پبلک کا بھی سامنا کرنا ہوتا ہے"

"جس طرح آپ پولیس کو استعمال کرتے ہیں اس سے پبلک سمجھ گئی ہے کہ پاکستان پولیس سٹیٹ بن چکا ہے" — جیدا نے کہا — "جب آپ کی مخالف پارٹی کی حکومت ہو گی تو وہ پولیس کو آپ کے خلاف استعمال کرے گی"

"یہ ہماری سیاست ہے جیدا بھائی!" — سیاسی لیڈر نے کہا — "پبلک کا اس سیاست میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ تم اپنی بات کرو۔ مجھے ایک وزارت ملنے والی ہے۔ میں وزیرِ اعظم اور پریذیڈنٹ کو خوش کرنا چاہتا ہوں۔ پھر سارے کراچی کو اپنا سمجھو .... پیسے ابھی لینا چاہو تو لے جاؤ۔ چیک کاٹ دوں؟ کیش دے دوں؟"

"پیسے تو لے ہی لوں گا" — جیدا نے کہا — "سال بھر ہونے کو آیا ہے میرے دو آدمی ڈکیتی کے کیس میں گرفتار ہیں۔ آدمی بڑے کام کے ہیں۔ کورٹ نہ کیس چلاتی ہے نہ ضمانت لیتی ہے"

"وہ کیس میں جانتا ہوں" — سیاست دان نے کہا — "تمہارے آدمیوں نے ڈاکہ اس آدمی کی کوٹھی میں ڈالا ہے جو سرکاری بلیک میلر ہے۔ حاکم اور وزیر اس کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ پریذیڈنٹ کا خاص آدمی ہے"

"تو پھر آپ کس مرض کی دوا ہیں؟"

"مجھے مجسٹریٹ کا نام بتا دو۔"

جیدا نے نام بتایا تو سیاست دان نے نوٹ کر لیا اور بولا — "میں آج ہی بندوبست کرتا ہوں تمہیں دونوں آدمی واپس مل جائیں گے۔"

جیدا جانے کے لیے اٹھا تو سیاست دان مسکرا کر بولا — "اور جیدا بھائی کوئی تازہ مال؟"

"ہے تو سہی!" — جیدا نے سنجیدگی سے کہا — "مگر ابھی سوچ رہا ہوں۔"

"ایسے کاموں میں بھی بھلا سوچا کرتے ہیں؟" — سیاستدان نے کہا۔

"یہ دانہ کچھ اور قسم کا ہے" — جیدا نے کہا — "خیر بندوبست ہو جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کی سیاست میرے مال کے بغیر نہیں چلا کرتی۔"

اور جیدا اُس کے ہونٹوں پر رال آلود مسکراہٹ چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

شام تک جیدا سارے کراچی میں اپنے آدمیوں کو تلاش کرتا پھرا۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد اس نے پچاس کے لگ بھگ آدمی ڈھونڈ لیے اور انہیں دوسرے دن چار بجے آرام باغ پہنچنے کو کہا۔ باقی کام انہیں معلوم تھا۔

سورج غروب ہو رہا تھا جب جیدا صدر کے علاقے میں داخل ہوا اور ایمپریس مارکیٹ کے سامنے ٹیکسی سے اتر کر ٹیکسی چھوڑ دی۔ ایک ہوٹل کے سامنے سے گزرا تو اُسے خیال آیا کہ وہ صبح سے بھوکا ہے۔ وہ ہوٹل میں جا بیٹھا۔ تین چار بیرے اُس کا آرڈر لینے کو لپکے۔ انہیں معلوم تھا کہ جیدا پانی پینے آئے تو بھی دو چار آنے ٹپ دے جاتا ہے۔

"آج تو کوئی خاص چیز لاؤ بھئی!" — اُس نے ایک بیرے سے کہا اور میز سے اخبار اٹھا کے دیکھنے لگا۔

پہلے صفحے پر ایک سیاسی پارٹی کے جلسے کا اعلان تھا۔ جیدا کے ہونٹوں پر طنز آلود مسکراہٹ پھیل گئی اور اُس نے اخبار رکھ دیا۔

"آج تیتر کھاؤ اُستاد!" — بیرے نے کہا — "روسٹ تیتر۔"

"تیتر؟" — جیدا نے مسکرا کر کہا — "یہ میرے رمضان ماسٹر کے پکڑے ہوتے کوّے تو نہیں؟"

"توبہ کرو استاد" — بیرے نے کہا — "کوّے تمہیں کھلائیں گے؟ اور تھوڑے گاہک آتے ہیں؟ ..... شامی کباب اور مرغ پلاؤ لے آؤں؟"

"لے آؤ۔ جو جی میں آتا ہے، لے آؤ۔"

وہ تمام دن آدمیوں کے پیچھے بھاگ بھاگ کے تھک گیا تھا۔ اس نے سر کرسی کی پیٹھ پر رکھ کر آنکھیں بند کر دیں۔ ہوٹل کے ریڈیو میں ستار بج رہی تھی جس کا نغمہ جیدا کے تھکے ہوتے اعصاب کو سہلانے لگا اور ایک لذّت آگیں اثر اس کی رگ رگ میں سرایت کرتا چلا گیا۔ ذہن میں ایک تصوّر نے انگڑائی لی جب یہ تصور نکھرا تو یہ ناز کا تھا۔ وہ ستار پر پُرسوز نغمہ بجا رہی تھی اور جیدا اُس کے سامنے لیٹا بے خودی میں اونگھ رہا تھا۔ اُس نے ناز سے نظریں ہٹا کر نغمے میں ڈوب جانا چاہا لیکن نغمے نے بھی ناز کا روپ دھار لیا۔

اُس کا ذہن ناز کے تصوّر کو قبول کرنے سے گریز کر رہا تھا اور اسی ذہن کے کونے سے ایک خیال اُٹھا — "ناز شاید کھانے پر انتظار کر رہی ہوگی" — اور اس خیال نے ایک بچے کو جنم دیا۔ جیدا نے اپنے آپ میں گدگدی سی محسوس کی۔ وہ اس گدگدی سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ بیرے نے میز پر پلیٹیں رکھیں تو جیدا بیدار ہو گیا۔ اُس نے سر کے ایک ہی جھٹکے سے ذہن سے ہر خیال جھٹک ڈالا لیکن اس نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ کوئی بات بھول رہا ہے یا کوئی چیز کہیں رکھ کے بھول گیا ہے اور یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ چیز کیا تھی اور کہاں رہ گئی تھی۔ وہ کسی چیز کی کمی محسوس کر رہا تھا۔

اس نے سوچا شاید بھوک زیادہ لگ رہی ہے یا شاید تھکن زیادہ ہو گئی ہے یا شاید وہ سابق سفیر کے ہاں وسکی زیادہ پی گیا ہے۔ اُس نے پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ریڈیو پر ستار کا نغمہ اور زیادہ پُرسوز ہو گیا اور ناز اور بچے کا تصور نکھر آیا۔ جیدا نے بھنے ہوتے تیتر کو ہاتھ لگایا تو اُسے بچے کا لمس یاد آ گیا۔ کل رات کی ہی تو بات تھی جب اُس نے نوزائیدہ بچے کو اٹھایا تھا۔ بچے کا لمس اس کے ہاتھوں پر اور سینے میں جیسے ابھی تک تر و تازہ تھا۔ اُس نے تیتر پلیٹ میں رکھ دیا۔

پھر اُسے ناز اور بچہ سوتے ہوتے نظر آتے۔ جیدا نے اس تصوّر کو جھٹکنے کی کوشش نہ کی اور لاشعوری انداز سے پلاؤ پیٹ میں پھینکنے لگا۔ کھاتے کھاتے بیرے کو بل لانے کو کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

بیرا بل لایا تو جیدا نے ہاتھ دھوتے بغیر جیب سے دو تین نوٹ نکالے، بیرے کو دیتے اور بھاگنے کی رفتار سے ہوٹل سے نکل گیا۔

وہ اندھا دُھند چلا جا رہا تھا۔ وہ کچھ سوچ نہیں رہا تھا لیکن اس کا ذہن خالی بھی نہیں تھا۔ اس کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی مگر شعوری طور پر اسے معلوم نہ تھا کہ وہ جا کہاں رہا ہے۔ اُس کے گرد ستار کے نغمے کی گونج یوں منڈلا رہی تھی جیسے شہر کی ہزاروں مکھیاں اس کے سر پر اڑتی جا رہی ہوں ..... اور اس گونج میں ایک بچہ رو رہا تھا، ایک بچہ ہنس رہا تھا۔

اس نے چلتے چلتے جیسے ناز کی آواز سنی ہو — "جیدا! جیدا! آ کے دیکھ میں نے تیرے لیے کتنا خوبصورت گھر بنا دیا ہے۔ دیکھ تیرے آنگن میں ننھا کھیل رہا ہے۔"

ستار کی مترنم گونج بلند ہوتی چلی گئی اور جیدا جیسے اس کے تعاقب میں بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ وہ بغیر دستک دیتے ایک دروازے میں داخل ہوا تو وہ چونک اُٹھا اور گھبرا کر رک گیا۔

"آؤ بیٹا! بابا کی یاد تمہیں کھینچ ہی لائی" — بوڑھا موسیقار اس سے ہمکلام تھا۔

"میں ..... میں کہیں اور جا رہا تھا" — جیدا لوکھلا گیا۔ بولا — "جانے یہاں کیسے آ پہنچا!" — اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"چلو کسی طرح ہی آ پہنچے، آ تو گئے" — بابا کمرے کے وسط میں دری پر بیٹھا تھا بولا — "آؤ! بیٹھو تو سہی! جلدی میں ہو؟"

جیدا آگے بڑھ کے بیٹھ گیا۔ بولا — "بابا کوئی الاپ ہی سنا دو۔"

بوڑھا ہنس دیا۔ ایسی ہنسی جو اُس باپ کے ہونٹوں پر ہی آ سکتی ہے جس کا ننھا پیاری سی ضد کر بیٹھا ہو۔ بوڑھے نے ستار سنبھال لی۔

"کیا سنو گے؟"

"جو سنا دو" — جیدا نے کہا "جس میں تمہارے من کی سنگت ہو"

تار لرزے اور لرزتی ہوئی ایک گونج جیدا کے رگ و ریشے میں سرایت کرنے لگی۔ رعشہ گیر انگلیوں نے جب ایک تار سے مالکونس کا انترا اٹھایا تو سرگم نے جیدا کے سینے میں بیٹھے ہوئے رہزن کو جیسے لوریاں دے کر سلا دیا ہو اور انسان کو لطیف سے جھٹکے دے کر جگا لیا ہو۔

جیدا موسیقار کے چہرے پر چھائی ہوئی گہری لکیروں میں کھو گیا تھا۔

بوڑھے نے ستار اتار دی اور الگ رکھ دی۔ تار خاموش ہو گئے لیکن ان کی گونج کی لہریں جیسے ابھی تک کمرے میں محوِ رقص ہوں۔ جیدا پر خود فراموشی طاری تھی۔ اُسے تو جیسے محسوس ہی نہ ہُوا تھا کہ بوڑھے نے ستار اتار دی ہے۔ الاپ کی لہریں اسے ابھی تک ہلارے دے رہی تھیں۔

"تم نے اس روز کہا تھا کہ تم جیبیں کاٹتے ہو؟" — بوڑھے نے کہا — "سچ کہتے تھے تم؟"

جیدا بیدار ہو گیا جیسے کسی نے اُسے ایک ہی شدید جھٹکے سے جگا دیا ہو۔ اس کا جسم یوں لرزا جیسے بھونچال سے پتھروں کی مضبوط عمارت ہل گئی ہو۔

"میں چور ہوں، ڈاکو ہوں" — جیدا نے قہر آلود آواز میں کہا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اُس نے بڑھ کر موسیقار کی کلائی پکڑ لی اور بولا — "میں اٹھائی گیر ہوں! اس وقت یاد نہ دلاتے تو تمہارا کیا بگڑ جاتا بابا! میرے منہ پر تھوک دیا ہوتا۔ گالی دے لی ہوتی۔ ذرا سی دیر تو مجھے بھول جانے دیا ہوتا کہ میں جیب کترا ہوں"

وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ اس کی جذباتی افراتفری اس کے چہرے سے عیاں تھی ~~~ ہوتی جا رہی تھیں۔

"میرا مطلب یہ تو نہ تھا بیٹا" — بوڑھے نے اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا — "مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تم کون ہو اور کیا ہو۔ تم نے ہی کہا تھا کہ جیبیں کاٹتا ہوں۔ میں تو مذاق سمجھ رہا تھا۔ میں تمہیں بیٹا ہی سمجھتا ہوں۔ میرے پاس جو شریف گھرانے کی لڑکی آتی ہے، وہ بھی میری بیٹی ہے اور جو طوائف گانا سیکھنے آتی ہے وہ بھی میری بیٹی ہے۔ طوائف کو تو میں زیادہ پیاری بیٹی سمجھتا ہوں کیونکہ اُسے بیٹی کہنے والا کوئی نہیں" — بوڑھے نے جیدا کے ہاتھ تھامتے ہوئے پیار سے کہا — "میں نے تمہیں طعنہ تو نہیں دیا تھا بیٹا!"

"میری زندگی مسلسل طعنہ ہے!" — جیدا نے قدرے سنبھلی ہوئی آواز میں کہا — "اس دنیا میں انسانوں کی باتیں مجھے طعنوں کی طرح لگتی ہیں۔ زہر آلود تیروں کی طرح چھلنی کرتی ہیں اور میں ان طعنوں کا جواب دے رہا ہوں.... تالے توڑ کر، جیبیں کاٹ کر، ڈاکے ڈال کر اور خون کر کے.... میرے پاس اور کوئی جواب نہیں"

"اپنے بابا کو تو غلط نہ سمجھو بیٹا!"

جیدا نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہُوا اور باہر نکل گیا۔

بوڑھا حیران و ششدر بیٹھا اُس خلا میں گھورتا رہا جہاں تھوڑی دیر پہلے جیدا بیٹھا تھا۔

جیدا گھر پہنچا تو اُس نے لڑکے سے منّے اور ٹیپو کے متعلق پوچھا۔ لڑکے نے بتایا کہ وہ رات دیر سے آئیں گے۔ اس کمرے میں فرش پر کمبل بچھا تھا۔ جیدا اسی پر لیٹ گیا اور اسے اونگھ آنے لگی مگر ایک نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہُوا اور خراماں خراماں اپنے کمرے کے دروازے میں جا کھڑا ہُوا۔

ناز چوبیس گھنٹے کی عمر کے بچے کو ہاتھوں پر اٹھائے بہلا رہی تھی اور بچّہ روئے جا رہا تھا۔ ذرا سا لوتھڑا ناز سے سنبھل ہی نہیں رہا تھا۔ دوپٹہ ڈھلک کر کندھوں پر آ گیا تھا۔ چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ دروازے کی طرف پیٹھ کیے ہوئے تھی۔ جیدا کو نہ دیکھ سکی۔

"خدا کے لیے چپ ہو جا" — ناز نے جھنجھلا کر کہا۔

"رونے دے ناز! بچے کو رونے دے" — جیدا نے انوکھی سی آواز سے کہا — "میں نے تمام عمر کسی بچے کو قریب سے روتے نہیں سنا۔ ذرا سی دیر اور رونے دے"

"اوہ تم؟" — ناز نے گھوم کے دیکھا۔ وہ پہچان ہی نہ سکی کہ یہ الفاظ اور یہ لب و لہجہ جیدا کا ہے۔

جیدا نے خود محسوس کیا کہ جو کچھ وہ کہہ بیٹھا ہے اس نے خود نہیں کہا۔ وہ جھینپ سا گیا۔

"کیوں رو رہا ہے یہ؟" — اُس نے خفت زدہ سے لہجے میں پوچھا۔

"میں کیا جانوں!" — ناز نے کہا — "بتاتا تھوڑے ہی ہے۔ شاید بھوکا ہوگا"

"بھوکا ہے تو دودھ پلا دو" — جیدا نے کہا — "دودھ کی بوتل منگوالی ہے؟"

"ہاں! لڑکا دودھ بنا رہا ہے"

جیدا نے آگے بڑھ کر اپنی انگلی بچے کے ہونٹوں پر رکھ دی تو بچہ پھول کی پتیوں جیسے ہونٹ کھول کر انگلی چوسنے لگا اور اس کا رونا بند ہو گیا۔ ناز کو ندامت ہوئی کہ اُسے چوسنی کا خیال کیوں نہ آیا۔ چوسنی بھی تو اُس نے منگوالی تھی لیکن بچے نے تو اس کے ہوش ہی گم کر دیئے تھے۔

"ہٹو پرے!" — ناز نے روٹھنے کے انداز سے کہا — "ہٹاؤ اس گندی انگلی کو"

لیکن جیدا کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ ننھا سا بچہ اُس کے جسم اور روح کے دکھ چوس رہا ہو۔ اس کے روئیں روئیں کو قرار آ رہا تھا۔

ناز نے جیدا کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے کے بدلے ہوئے تاثرات میں اس طرح کھو گئی جس طرح جیدا بچے کی ننھی سی ذات میں جذب ہو رہا تھا۔

جب لڑکا دودھ کی بوتل لیے کمرے میں آیا تو جیدا نے لڑکے کو گھور کر دیکھا جیسے کہہ رہا ہو — "کمبخت اتنی جلدی کیوں دودھ لے آئے!"

بچہ دودھ پی کے سو گیا۔ جیدا نے اپنی ڈائری کی ورق گردانی کی۔ تھوڑی دیر خلاؤں میں گھورا۔ کچھ لکھا اور ناز کے پلنگ کے ساتھ دوسرے پلنگ پر سو گیا۔

نصف شب سے ذرا بعد جیدا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کروٹ لی مگر نیند نہ آئی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے پھر کروٹ لی تو اُسے محسوس ہُوا کہ وہ سو نہ سکے گا۔ اس کا ذہن خالی تھا مگر اس نے محسوس کیا کہ وہ کچھ سوچنا چاہتا ہے۔ بھولا بھٹکا ایک خیال سانپ کی طرح ذہن میں رینگنے لگا اور جیدا اس کا تعاقب کرنے لگا۔ یہ احساس اُس کے لیے اجنبی سا تھا۔ بہت چاہا کہ اسے جھٹک دے مگر جھٹک نہ سکا اور اُس نے اپنے آپ کو اسی احساس یا خیال کے حوالے کر دیا۔

وہ ایک چوری کرنے پر تُل گیا ــــ ذراسی چوری لیکن ڈاکے ڈالنے والا خونی ڈکیت ذراسی چوری کرتے جھجک رہا تھا، ڈر رہا تھا۔ وہ چوری اس انداز سے کرنا چاہتا تھا کہ خود بھی اپنے آپ کو چوری کرتے دیکھ نہ سکے۔

اس نے اندھیرے میں ٹٹول کر تپائی سے ماچس اُٹھائی، جلائی اور جلتی ہوئی دیاسلائی ناز کے پلنگ کی طرف کی۔ زرد لَو میں اسے ناز اور بچہ گہری نیند سوتے ہوئے نظر آتے۔ ناز بھی اسے بچّے کی طرح معصوم اور بھولی بھالی دکھائی دے رہی تھی۔ بچہ اس کے سینے سے لگا اطمینان اور سکون کا دلفریب مرقع بنا ہُوا تھا۔ جیدا دونوں کو دیکھتا رہا، دیکھتا رہا اور اُس نے آہستہ آہستہ ہاتھ آگے بڑھایا۔ دیاسلائی بجھ گئی اور اندھیرے میں وہ خیال نکھر کے سامنے آگیا جو تھوڑی ہی دیر پہلے اس کے ذہن میں دھندلے سے سائے کی طرح رینگ رہا تھا۔

بہت دیر بعد بچہ بھوک سے رویا تو ناز نے اٹھ کر بتی جلائی۔ دیکھا کہ جیدا ساتھ والے پلنگ پر گہری نیند سو رہا تھا۔ اُس کا بازو ناز کے پلنگ پر تھا اور اس کی انگلی بچے نے مٹھی میں پکڑ رکھی تھی۔ ناز نے بچے کے ہاتھ سے جیدا کی انگلی چھڑائے بغیر دودھ کی بوتل بچے کے منہ سے لگادی۔ جیدا گہری نیند سو رہا تھا۔

دوسری صبح جب جیدا گھر سے نکلا اور ایک اڈے پر جاکر چرس کے دو کش لگاتے تو وہ اپنے اصلی روپ میں آگیا ــــ جیدا جیب کترا، استاد غنڈہ۔

آج تو اُسے خاص طور پر اصلی روپ میں رہنا تھا کیونکہ اُسے ملکی سیاست کے ناٹک میں اہم پارٹ ادا کرنا تھا۔ اُدھر آرام باغ میں ایک عظیم الشان جلسے کے انتظامات مکمل ہو رہے تھے اِدھر جیدا اپنے آدمیوں کو جمع کر رہا تھا۔ اُس نے سب سے پہلے اپنے دو جاسوس یہ معلومات فراہم کرنے کو بھیجے کہ جلسہ کرنے والی پارٹی کے ساتھ کون کون سے اور کتنے غنڈے ہیں اور کراتے کے نعرہ باز کون کون سے ہیں۔

شام تین بجے تک جیدا اپنے انتظامات مکمل کر چکا تھا اور آرام باغ انسانوں سے بھرتا جا رہا تھا۔ یہ وہ انسان تھے جو فٹ پاتھوں پر بھاگ رہے ہوتے ہیں، یا بسوں اور ٹراموں میں ٹھونسے ہُوتے ہوتے ہیں اور ان کی دھکم پیل اور افراتفری سے معلوم ہوتا ہے جیسے وہ بہت جلدی میں ہیں اور انہیں سانس لینے کی بھی فرصت نہیں لیکن جہاں کسی حکیم کا مجمع دیکھتے ہیں یا مداری کا تماشہ یا دو آدمیوں کو اونچی اونچی باتیں کرتے دیکھتے ہیں تو وہیں جم کے رہ جاتے ہیں اور کہیں جلسہ ہو تو یہ لوگ جلسہ گاہ میں ڈھیر ہو کر "فدایانِ اسلام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر" بن جاتے ہیں۔

چار بجے سے پہلے یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں جلسہ گاہ میں جمع ہو گئے تھے۔ کچھ اس خیال سے کہ وقت ان سڑکوں پر بھاگتا ہوا آگے نکل جاتے اور وہ جلسہ گاہ میں ہی بیٹھے رہیں اور زیادہ تر اس لیے کہ شاید ان کی سسکتی ہُوئی امیدوں میں کسی لیڈر کی تقریر تھوڑی سی جان ڈال دے۔ جینے کا بہانہ تھا۔ فریب خوردہ ہجوم ایک اور فریب کی تلاش میں جلسہ گاہ میں شور و غل بپا کیے ہُوتے تھا۔

تلاوتِ قرآن ختم ہُوئی تو پارٹی کا لیڈر تقریر کرنے اٹھا۔ سٹیج سے "زندہ باد" کے نعرے بلند ہُوتے۔ جوں ہی تقریر شروع ہوئی حاضرین میں سے "مردہ باد" کا نعرہ بلند ہُوا۔ تقریر جاری رہی "زندہ باد" اور "مردہ باد" کے نعروں کا تبادلہ ہونے لگا۔ سٹیج کے قریب بیٹھے ہُوتے چند ایک آدمی اٹھے اور حاضرین پر نگاہ ڈالی۔ ان کی آنکھوں میں چیلنج تھا۔ یہ جلسہ کرنے والی پارٹی کے محافظ تھے۔ انہوں نے مل کر "زندہ باد" کا نعرہ یوں لگایا جیسے "مردہ باد"

کا نعرہ لگانے والوں کو للکارا ہو۔

حاضرین کی آخری صف سے چالیس پچاس آدمی اٹھ کھڑے ہُوتے اور انہوں نے یہ واویلا بپا کرتے ہوتے ــــ "پیچھے پولیس لاٹھی چارج کر رہی ہے" ــــ آگے بیٹھے لوگوں کو دھکے دینے شروع کر دیتے۔ آگے والے گھبرا کے اُٹھے تو آگے ہی دھکیلے جانے لگے۔ پھر ان سے آگے بیٹھے ہوتے لوگ اٹھے اور ذرا سی دیر میں تمام ہجوم دھکیلا ہُوا سیلاب کی موجیں بن کر سٹیج کو بھی روندنے لگا۔ ایک ہڑبونگ تھا یا قیامت تھی کہ آسمان کے پردے پھٹنے لگے۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکیل اور روند رہے تھے اور جلسے کے منتظمین میدان چھوڑ گئے تھے۔ مقرر بھاگ کے کار میں جا بیٹھا اور میدان جیدا کے ہاتھ رہا۔

جیدا اپنے مخصوص بہروپ میں تھا ــــ سیاہ نقلی داڑھی، آنکھوں پر چاندی کے فریم والی عینک، تنگ پاجامہ اور قمیض اور چادر اوڑھے ہُوتے۔

رات جب شکست خوردہ لیڈر سیکرٹری کو اخباروں کے لیے یہ بیان لکھوا رہا تھا کہ اُس کی تقریر کے دوران ہلڑ بازی کی ذمہ دار برسرِ اقتدار پارٹی ہے اور یہ عوام نہیں تھے بلکہ اس پارٹی کے غنڈے تھے تو اُس وقت اُس کی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں کراچی کے چھ استاد غنڈے بیٹھے اس کی ہدایات کا انتظار کر رہے تھے۔

رات نو بج رہے تھے جب جیدا سابق سفیر کی کوٹھی سے پانچ ہزار روپے وصول کر کے نکلا۔ منّا اور ٹیپو سڑک پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ جیدا نے تمام رقم ٹیپو کو دے کر کہا ــــ "ایک ہزار اپنی بیوی کو دے آنا اور باقی چار ہزار اپنے چھوکروں میں بانٹ دینا۔ دیکھنا کوئی رہ نہ جاتے کسی کو ناراض نہ کرنا۔ ان سب کی ہمیں بہت ضرورت ہے۔ تھوڑے دنوں بعد کارپوریشن کے الیکشن شروع ہونے والے ہیں۔ دوسری پارٹیوں کے آدمیوں کو بھی کھینچنے کی کوشش کرو۔"

"اُدھر کا کیا ارادہ ہے؟" ــــ منّے نے کہا ــــ "چھوکرا تیار ہے، کہتا ہے کسی رات آجاؤ۔"

جیدا کے ماتھے پر شکن گہرے ہو گئے۔ ذرا سوچ کر بولا ــــ "آج ہی.... گاڑی کا بندوبست کرلو۔ رات دو بجے میں لال کوٹھی کے سٹاپ پر ملوں گا.... اور.... تم دونوں آجانا۔ ہم تینوں ہوں گے۔ چھوکرے کو اطلاع کر دینا۔"

حاجی عمر دین چراغ دین نے ایک غیر ملکی فرم کے اشتراک سے معماری کی کمپنی کھولی تھی اور خوب کما رہے تھے۔ جیدا کا ایک لکھا پڑھا چھوکرا ان کی کوٹھی میں ملازم تھا اور کوٹھی کا چوکیدار بھی جیدا کا ہی آدمی تھا۔ ہاؤسنگ سوسائٹی کی یہ کوٹھی محل سے کم نہ تھی۔ ہزاروں روپے سیف میں رکھے رہتے تھے۔ چند روز ہوتے چھوکرے نے بتایا تھا کہ ان دنوں سیف میں پندرہ بیس ہزار روپیہ پڑا رہتا ہے اور ستّر اسّی ہزار کی مالیت کے زیورات بھی ہیں۔

آج رات دو بجے کا پروگرام طے ہو گیا۔ منّا اور ٹیپو چھوکرے کو اطلاع دینے اور گاڑی کا انتظام کرنے چلے گئے اور جیدا ٹہلتے ٹہلتے فریئر گارڈن جا پہنچا۔

ابھی رات کے نو ہی بجے تھے۔ جیدا باغ میں گھاس پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ رات دو بجے تک وقت کیسے گزارا جاتے۔ بیسیوں جگہیں تھیں جہاں وہ وقت گزار سکتا تھا۔ جوئے بازی کے کسی اڈے پر چلا جاتا۔ رات کے وقت تو ہر اڈے پر خوب رونق ہوتی تھی لیکن اس کی طبیعت شراب اور جوتے پر آمادہ

نہ ہوتی۔ اسے گلنار کا خیال آیا۔ سوچا کیوں نہ اسی کو ہاکس بے لے جائے لیکن گلنار کا خیال آتے ہی اسے ناز یاد آگئی پھر بچہ بھی یاد آگیا۔ اس نے عزم کر لیا تھا کہ گھر ہی چلا جائے لیکن اُس نے بھونچال کا سا جھٹکا محسوس کیا اور اس کی داخلی دنیا دو حصوں میں کٹ گئی۔

ایک طرف گلنار کی پائل کی جھنکار تھی۔ دوسری طرف ناز کے گلابی پیروں کی پابجولاں سی چال۔ اُدھر رقص کی ادائیں تھیں جو طبل و سارنگ کے مترنم ہنگامے میں گناہوں کی دعوت دیتی تھیں، اِدھر ناز کی بیساختہ مسکراہٹ تھی جس میں تشنہ سی التجا تھی جیسے کہہ رہی ہو —"جیدا! گھر آجایا کرو نا! میں راہ دیکھا کرتی ہوں!"— اُدھر عریاں جسم کی نمائش تھی جو جسموں کو گرماتی تھی اِدھر مستور حسن کا سحر تھا جو روح پر وجد طاری کرتا تھا۔ اُدھر سارنگی کے بکاؤ نغمے تھے اِدھر ناز کی پتلی پتلی سی دل کش انگلیاں ستار پر یوں چلتی تھیں جیسے اُمنگیں اور ارمان رومانوں کی قوس قزح پر خراماں خراماں چلے جا رہے ہوں۔

جیدا کے ذہن میں سارنگی بجنے لگی جو بچے کی "اغوں اغوں" میں بدل گئی گھنگھروؤں کی جھنکار میں ہیا لیاں اور ملپٹیں بجنے لگیں۔ جیدا اٹھ کھڑا ہوا اور گھر کا رخ کیا مگر رک گیا۔ لاشعور کے اندھیرے سے ایک خیال ابھر آیا — گلنار کی دنیا میں میری بادشاہی ہے لیکن ناز کی بسائی ہوئی دنیا میں شاید وہ بات نہیں۔

ناز، بچے اور گھر کے خیال نے جیسے اُسے ڈنگ مار دیا ہو۔ شکست کا تلخ سا احساس بیدار ہو گیا جیسے اسے ناز کے سامنے پابہ زنجیر لے جایا جا رہا ہو۔ اُس کی رگ رگ بیدار ہو گئی۔ اسے یاد آگیا کہ وہ کراچی کا نامی ڈکیت اور ممبئی کا گھاگھ استاد ہے اور ناز ننھی سی چڑیا ہے جسے وہ کسی بھی وقت پنجرے سے نکال کر مٹھی میں دبا کے مار سکتا ہے۔

جیدا کو اپنے آپ پر غصہ آنے لگا اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا چل پڑا۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ جیدا خیالوں کے دوراہے پر آرکا ہو۔ وہ تو ایک ثانیے میں فیصلہ کر لیا کرتا تھا جی میں آتے تو جوتے پر جا بیٹھے۔ طبیعت اکتاتی تو اپنی کسی طوائف یار قاصہ کے ہاں پہنچ گئے لیکن آج رات وہ اتنا سا فیصلہ نہ کر سکا کہ رات کی چند گھڑیاں کہاں گزارے۔ وہ جرائم کی دنیا کا بادشاہ تھا اور ملک کی سیاسی دنیا میں بھی اب عملاً اُسی کی بادشاہی تھی۔ آج وہ حزب مخالف کی پارٹی کا جلسہ تباہ نہ کرتا تو حکمران پارٹی کی کمر ٹوٹ جاتی۔

جیدا کے دل و دماغ پر فتح کا نشہ طاری ہونے لگا۔ حکمران پارٹی کے لیڈر جو وزارتوں کے امیدوار تھے، جیدا اور اس کے ساتھیوں کے کس قدر محتاج تھے۔

اسے یاد آگیا کہ وہ آج رات ڈاکہ ڈالنے جا رہا ہے۔ ڈاکے کے خیال نے اسے شراب کی نصف بوتل جتنا سرور دیا اور وہ جھوم جھوم کے چلنے لگا۔ ذہن لاشعور میں تھوڑی ہی دیر پہلے جو جھوپڑ پنگنے لگے تھے سب مر گئے خلش رہی نہ بے کلی۔

وہ چلتا ہی چلا گیا۔ اس کا رُواں رُواں مسرور اور مطمئن ہو گیا تھا۔ اس کا دل کسی تفریح کو مچلنے لگا۔ وہ رک گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی ٹیکسی یا رکشا نظر نہ آیا۔ سڑک پر بسیں ایک دوسری سے آگے نکل جانے کو بھاگی جا رہی تھیں۔ رات کے نو بج چکے تھے۔ ٹریفک پولیس کی ڈیوٹی ختم ہو چکی تھی اور سڑکوں کا قانون ڈرائیوروں کے ہاتھ میں تھا۔ جیدا نے بسوں میں ٹھنسے ہوئے انسانوں کے انبوہ کو دیکھا تو اسے ہنسی بھی آئی، ترس بھی —

"فریب خوردہ انسان" — اس نے سوچا —"اس مُردہ مخلوق کی قسمت میں اب زندہ باد کے نعرے ہی رہ گئے ہیں۔"

اسے ایک ٹیکسی آتی دکھائی دی اور خیالوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ اس نے ٹیکسی روک لی ٹیکسی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور نے پوچھا "کہاں؟" — وہ بوکھلا گیا۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہ تھا۔ بغیر سوچے بولا —"حبیب لائن۔"

بوڑھا موسیقار آج پھر سرود پہ کسی راگ میں الجھا ہوا تھا۔ جیدا کمرے میں داخل ہوا تو بوڑھے نے سرود الگ رکھ دی اور قہقہہ لگا کر بازو پھیلا دیئے۔ جیدا اس کے پاس بیٹھ گیا تو بوڑھے نے اسے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر اُس کا ماتھا چوم لیا۔ اُس کے بیساختہ اور جاندار قہقہے میں جو والہانہ پن، مسرت اور اپنائیت تھی وہ جیدا کی روح تک اتر گئی۔ جیدا نے اپنے آپ سے کہا —"اچھا ہوا کہ میں گلنار کے ہاں نہ چلا گیا۔"

"کچھ کھاؤ گے بیٹا؟" — بوڑھے نے دوستانہ بے تکلفی سے پوچھا۔

"اول ہوں!" — جیدا نے سر ہلا کے کہا —"میں تو ستار سننے آیا ہوں۔"

"کچھ پی لو۔"

"کیا پلاؤ گے بڑے میاں؟" — جیدا نے شرارت آمیز مسکراہٹ سے پوچھا۔

"اس وقت شاید ڈرائی جن کی ایک آدھ بوتل رکھی ہوگی" — بوڑھے نے متانت سے کہا۔

"ڈرائی جن؟" — جیدا نے حیران ہو کے پوچھا —"تم پیتے بھی ہو بڑے میاں؟"

"نہ پیوں تو طبیعت جمتی نہیں" — بوڑھے نے کہا —"بس اتنی سی پیتا ہوں کہ نشہ نہ ہو، سرور آجائے۔"

بوڑھا بوتل اور گلاس لے آیا۔ شراب نے ستار نواز اور جیدا کی اجنبیت دور کر دی۔

"اُس روز تم روٹھ کے چلے گئے تھے!" — بوڑھے نے پوچھا —"کیوں؟"

"اُس روز کی بات کچھ اور تھی" — جیدا نے مسرور سے لہجے میں کہا —"آج جو جی میں آئے کہہ لو۔"

"میں نے پوچھا تھا تم کرتے کیا ہو اور تم نے کہا تھا جیبیں کاٹتا ہوں۔"

"صرف جیبیں نہیں" — جیدا نے مسکرا کر کہا —"تالے بھی توڑتا ہوں، ڈاکے بھی ڈالتا ہوں۔ یہ میرا پیشہ ہے بڑے میاں! میں غنڈوں کا سردار ہوں۔ تمہارے پاس نیپیر روڈ کی جو عورتیں گانا بجانا سیکھنے آتی ہیں ان سے پوچھنا وہ تمہیں میرے متعلق بہت کچھ بتائیں گی۔ میرا نام جیدا جیب کترا ہے" — اس کا لہجہ مسرت سے بھرپور تھا —"پہلے روز میں یہاں غنڈے کے روپ میں ہی آیا تھا۔ پتہ چلا تھا تمہارے ہاں رنڈیاں آتی ہیں۔ میں سمجھا شاید یہاں بھی دھندا چلتا ہے۔"

بوڑھا حیران ہوا نہ اُسے غصہ آیا۔ وہ کھل کر ہنسا اور بولا —"آج کس روپ میں آئے ہو؟"

"بیٹے کے روپ میں" — جیدا نے ہنستے ہوئے کہا —"لیکن بڑے میاں! وعظ نہ شروع کر دینا۔ یوں نہ کہہ بیٹھنا کہ بیٹا! چوری چکاری تو بری بات ہے۔"

"میں کیوں کہوں گا بیٹا!" — بوڑھے نے اُنس بھرے لہجے میں کہا —"اتنا ضرور کہوں گا کہ آتے رہا کرو۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں۔ عمر یوں ہی اکیلے گزار دی ہے۔ جی چاہتا ہے کوئی آتا ہی رہا کرے۔ گھر میں رونق سی لگی رہتی ہے۔ تنہائی میں دل ڈوبنے لگتا ہے۔"

جیدا کو تو یقین ہو ہی چکا تھا کہ ناچنے گانے والیوں کے ساتھ بڈھے کا تعلق اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ وہ اس سے گانا بجانا سیکھنے آتی ہیں اور یہ بھی کہ وہ انہیں بچوں کی طرح عزیز سمجھتا ہے لیکن اس نے آج پھر محسوس کیا کہ بوڑھا سراپا پیار اور ترنم ہے۔ اس کی آواز میں بھی پیار بھری نغمگی ہے اور وہ یا تو خود بھٹکا ہوا ہے یا بھٹکے ہوؤں کی پناہ گاہ ہے۔

بوڑھا موسیقار کچھ بھی تھا لیکن جیدا کا کردار جن خامیوں اور محرومیوں سے عبارت تھا وہ ایسے زخم بن گئی تھیں جن پر بڈھے کی پُرخلوص باتیں اور انسیّت مرہم کا اثر رکھتی تھی اور جیدا کی لاشعوری خلش اور بے چینی سکون پذیر ہونے لگتی تھی۔ آج رات تو بوڑھا اُس کے دل کی تہوں میں اتر گیا تھا اور جیدا کو نیند آنے لگی تھی لیکن بوڑھے نے وقت پوچھ لیا اور تکیے کے نیچے سے گھڑی نکال کر دیکھی۔ بولا ــــ "ایک بج رہا ہے" اور جیدا جاگ اُٹھا۔

بوڑھے کا سحر ڈھل گیا اور جیدا کا زہر اُبھر آیا۔

"ایک بج گیا ہے؟" ــــ جیدا نے حیرت سے پوچھا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ بولا ــــ "سو جاؤ بڑے میاں! سو جاؤ۔ میں نے تمہیں اتنی دیر جگائے رکھا، بہت برا کیا" ــــ اور وہ باہر کو چل پڑا۔

"کل آؤ گے بیٹا؟"

"اگر آسکا تو!"

دو بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی کی شاہانہ بستی پر سکوت طاری تھا۔ حاجی عمر دین چراغدین کی کوٹھی میں گھپ اندھیرا تھا۔ گھر والے گہری نیند سوتے ہُوتے تھے۔ کوٹھی کا چوکیدار پھاٹک میں کھڑا بے تابی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ تمام ملازم اپنے کوارٹروں میں سو رہے تھے۔ صرف ایک ملازم اپنے کوارٹر میں نہیں تھا۔ وہ بالائی منزل کے برآمدے میں کھڑا تھا۔ کوٹھی کے پچھواڑے ایک ٹیکسی کھڑی تھی جس کی نمبر پلیٹیں غائب تھیں۔ مُنّا، ٹیپو اور جیدا ٹیکسی میں بیٹھے تھے۔

بالائی منزل کے برآمدے کی بتی جلی اور بجھ گئی۔ چوکیدار نے منہ سے وسل بجائی تو ٹیریر نسل کا خونخوار کُتا جو کوٹھی کی رکھوالی کی خاطر اِدھر اُدھر گھوم پھر رہا تھا، بھاگ کے چوکیدار کے پاس آیا۔ چوکیدار کے ہاتھ میں بھینس کا سینگ تھا جس میں اُس نے گوشت بھر رکھا تھا۔ اس نے سینگ کُتے کے آگے کیا۔ کُتا سینگ پر لپکا تو چوکیدار پھاٹک سے باہر نکل گیا۔ کُتا بھی گوشت کی بُو پر دُم ہلاتا اس کے پیچھے چل پڑا۔ چوکیدار نے سینگ دُور پرے پھینک دیا اور کُتا بھاگ کر سینگ پر ٹوٹ پڑا۔

چوکیدار اُلّو کی طرح بولا۔ اوپر کے برآمدے کی بتی ایک بار پھر جلی اور بجھ گئی۔ پانچ سات منٹ بعد کوٹھی کے ایک کمرے کی بتی جلی اور گھبرائی ہُوئی، خوفزدہ آواز سنائی دی ــــ "کون ہو؟" ــــ اور معاً بعد گھٹی ہُوئی آواز ــــ "چور چور" ــــ اُبھری اور کمرے میں ہی گھٹ گئی۔

ملازم نے راہ صاف کر رکھی تھی۔ جیدا اور اس کے ساتھیوں کو سولہ سترہ ہزار روپے نقد اور ہزارہا کی مالیت کے زیورات سیف سے نکال کر ایک اٹیچی کیس میں ڈالتے کُل دس منٹ لگے۔

یکایک کوٹھی سے شور اُٹھا۔ ملازم جاگ اٹھے۔ حاجی چراغ دین نے دونالی بندوق نکال کر داغ دی۔ حاجی عمر دین "ٹائیگر، ٹائیگر" پکارنے لگا لیکن ٹائیگر کوٹھی سے دور سینگ سے گوشت نکالنے میں مصروف تھا۔ جیدا، منّا اور ٹیپو ٹیکسی میں بیٹھے برگینزا ہوٹل سے بھی آگے نکل گئے تھے۔

ابھی رات کے تین نہیں بجے تھے جب جیدا اپنے گھر میں داخل ہُوا۔ منّا اور ٹیپو اٹیچی کیس اٹھائے مکان کے ایک بند اور ویران کمرے میں چلے گئے۔ جیدا دبے پاؤں ناز کے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے اندھیرے میں ہی اپنے پلنگ پر لیٹ جانا چاہا لیکن اس کا ہاتھ غیر شعوری طور پر جیب میں چلا گیا اور دوسرے لمحے اس کے ہاتھ میں جلتی ہوئی دیا سلائی تھی۔ اس نے دیکھا ناز اور بچہ گہری نیند سوتے ہُوتے تھے۔

جیدا دیا سلائی بجھنے تک دونوں کو دیکھتا رہا اور اس ذرا سے عرصے میں اس کی ہستی کا ڈاکو اور چور اچکا گہری نیند سو گیا۔

اُس نے جلدی سے ایک اور دیا سلائی جلائی جیسے وہ کوئی خاص چیز دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے دیکھا ناز کی پیشانی پر پسینے کی نمی تھی۔ جیدا کو خیال آیا کہ مکان میں بجلی نہیں ورنہ بجلی کا پنکھا لے آتا لیکن وہ وہاں بجلی لگوانے کی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ یہ مکان جو بظاہر زمین پر تھا جرائم پیشہ لوگوں کی ملکیّت کی وجہ سے زمین دوز تھا۔ وہاں بجلی لگوانے کا مطلب تھا کہ میٹر پڑھنے والے مہینے میں کئی بار آیا کریں گے اور بجلی والے مکان کا نمبر بھی رجسٹروں میں لکھ لیں گے۔ جیدا مکان کو سرکاری کاغذوں میں لانے سے گریز کرتا تھا۔

وہ بے اختیار ہو کے آگے جھکا۔ وہ ناز کے دوپٹے سے اس کا پسینہ پونچھنے کو آگے جھکا تھا لیکن دیا سلائی کی لَو اُس کی انگلیوں تک پہنچ گئی اور وہ چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔ پلنگ پر لیٹا اور سو گیا۔

جیدا اگلے دن دوپہر کو جاگا۔ وہ شاید نہ ہی جاگتا لیکن بچہ بُری طرح رو رہا تھا اور ناز کمرے میں نہیں تھی۔ جیدا یوں اچھل کے اٹھا جیسے بچہ کسی خطرے میں ہو۔ چوسنی بچے کے قریب پڑی تھی۔ جیدا نے اٹھا کے اُس کے منہ میں دے دی اور بچہ چپ ہو گیا۔ جیدا تیزی سے باورچی خانے تک گیا۔ ناز بوتل میں دودھ ڈال رہی تھی۔

"جلدی کرو نا!" ــــ جیدا نے بے تابی سے کہا ــــ "اتنی دیر سے رو رہا ہے۔ بھوکا تو نہ رکھا کرو اسے!" ــــ لیکن وہ اپنی ہی آواز پر جھینپ گیا اور جھینپ کو چھپانے کی کوشش میں قدرے رعب دار آواز میں بولا ــــ "سونے بھی نہیں دیا، چیخ چیخ کے جگا دیا" ــــ اور وہ باورچی خانے سے نکل آیا۔

اس نے چھتیس سینتیس برس کی عمر میں پہلی بار محسوس کیا کہ وہ ڈاکو اور چور اچکا ہی نہیں کچھ اور بھی ہے اور اسے ایک حد تک افسوس سا بھی ہُوا کہ وہ ڈاکو اور چور اچکا ہے۔ یوں تو وہ چند دنوں سے اپنے اندر ایک ہلچل سی محسوس کرنے لگا تھا لیکن کبھی توجہ نہ دی تھی۔ آج یہ ہلچل ایک انکشاف بن کے سامنے آگئی۔

آج تک وہ اپنے آپ کو ایک ہیبت ناک انسان سمجھتا رہا تھا جس سے لوگ ڈرتے تھے اور جس سے کسی کا گھر اور کوئی انسان محفوظ نہیں تھا۔ اس احساس سے اس پر نشہ طاری ہو جایا کرتا تھا مگر آج اسے یوں لگا جیسے کوئی اور ہیبت ناک قوت بھی ہے جو اس کے گھر میں پرورش پاتے بچّے پر جھپٹنے کو پر تول رہی ہے اور بچہ محفوظ نہیں۔ جیدا اندر ہی اندر یوں چوکنا ہو گیا جیسے وہ نہ ہُوا تو بچہ ایک دن بھی زندہ نہ رہ سکے گا۔ ایسے میں اسے اپنا باپ یاد آگیا۔ اس نے آنکھیں اور پیشانی سکیڑ کر باپ کے خدوخال کو تصوّر میں آراستہ کرنا چاہا لیکن اسے اس کا ایک بھی نقش، چہرے کا ایک بھی خط یاد نہ آیا۔ اس نے ذہن پر اور زیادہ زور دیا تو اس کے باپ کے خدوخال ابھرنے لگے لیکن خدوخال نکھرے تو یہ جیدا کے اپنے چہرے کے نقشے، ہر ایک خط اُس کا اپنا تھا۔ اس کے سینے میں باپ بیدار ہو گیا اور بچہ اس کے اعصاب پر چھا گیا۔

برسرِاقتدار پارٹی نے جیدا کے گروہ سے حزبِ اختلاف کا اتنا بڑا جلسہ تباہ کرا کے سیاسی میدان میں بہت بڑی کامیابی حاصل کر لی۔ جس سابق سفیر نے جیدا کے ذریعے یہ کامیابی حاصل کی تھی اُسے صدرِ مملکت نے ایک وزارت بطور انعام دے دی اور جیدا کو انعام کے طور پر دن دہاڑے تالے توڑنے، راتوں کو لُوٹ مار اور جو جی میں آئے کرنے کی کھلی چھٹی مل گئی۔ پولیس برسرِاقتدار پارٹی کے حکم کی پابند تھی۔ صرف کراچی میں نہیں سارے ملک میں جرائم کی ایسی بھرمار ہو گئی جیسے ملک سے قانون اُٹھ گیا ہو۔

جن کے گھر لُٹتے تھے اور جن کی جیبیں کٹتی تھیں وہ تھانوں کو دوڑے جاتے اور سر جھکاتے ہوئے واپس آ جاتے تھے۔ تھانیدار ان کی رپورٹیں درج کرنے کی بجائے ان سے ایسی جرح کرتے تھے جیسے ان لوگوں نے خود ہی اپنے گھروں میں چوری کی ہو۔ کوئی رپورٹ درج نہیں ہوتی تھی، کوئی پرچہ چاک نہیں ہوتا تھا۔ راہ جاتے لوگوں کے قتل تک کے کیس گول ہو جاتے تھے۔

حزبِ اختلاف کے جلسے کی ناکامی اس وجہ سے بہت بڑی شکست تھی کہ کارپوریشن کے انتخابات ہونے والے تھے۔ کہا تو یہ جا رہا تھا کہ کارپوریشن کے انتخابات غیر سیاسی ہوں گے اور سیاسی پارٹیوں کا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو گا لیکن یہ معرکہ سیاسی پارٹیوں کا ہی تھا۔ عام انتخابات کا تو کوئی ذکر ہی نہیں کرتا تھا، نہ صدرِ مملکت عام انتخابات کے حق میں تھا۔ چنانچہ پارٹیاں بلدیاتی انتخابات کے ذریعے عنانِ حکومت سنبھالنے کے جتن کر رہی تھیں۔

جیدا کے گروہ نے حزبِ اختلاف کا جلسہ درہم برہم کیا تو اب حزبِ اختلاف کی سب سے بڑی پارٹی کے لیڈر صرف کراچی کے نہیں بلکہ پاکستان بھر کے نامی گرامی غنڈے میدان میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

ملک کی سیاست جو دراصل اقتدار کی جنگ تھی بڑی تیزی سے رنگ بدل رہی تھی اور خونریز قسم کے فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو رہی تھی۔ میدان میں ہر اوچھا ہتھیار استعمال ہو رہا تھا۔ پہلے تو جلسوں میں نعرہ باز کرائے پر بلوائے جاتے تھے اب حاضرین بھی معاوضے پر آنے لگے۔ بیروزگاروں اور آوارہ گردوں کو ذریعہ معاش مل گیا اور پیشہ وروں کے وارے نیارے ہو گئے۔

چند مہینوں بعد کارپوریشن کا الیکشن لڑا گیا جو صحیح معنوں میں لڑا گیا۔ پولنگ سٹیشنوں پر انہی کا بول بالا تھا جن کے پاس پستول اور چاقو تھے۔ پرچیاں روپوں سے بھی اور دھمکیوں سے بھی لی گئیں اور بیشتر ووٹر گھروں میں دبکے بیٹھے رہے لیکن ان کی پرچیاں بکسوں میں پہنچ گئیں۔ کراچی کے عوام اس مسمریزم پر بہت سٹپٹائے لیکن کچھ نہ کر سکے۔

وقت عوام کی تمناؤں اور آرزوؤں کو کچلتا تیزی سے گزرتا چلا گیا۔ شہر میں جرائم اور زیادہ بڑھ گئے۔ بلدیاتی انتخابات میں جو لوگ کامیاب ہوئے تھے وہ جرائم میں اضافے کے ذریعے پیدا کر رہے تھے۔ جرائم کا انسداد ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ لڑائی مار کٹائی اور غنڈہ گردی کے ذریعے کامیاب ہوئے تھے۔ اب کارپوریشن کے اجلاسوں میں بھی غنڈہ گردی جاری رکھے ہوئے تھے۔

چھ مہینے گذر گئے۔

ان چھ مہینوں کے دوران جیدا تین چار مرتبہ بوڑھے موسیقار کے ہاں گیا۔ حسبِ معمول ستار سنی، باتیں کیں، باتیں سنیں اور ایک رات وہ وہیں سو گیا لیکن پو پھٹتے ہی ہڑبڑا کر اٹھا اور بُڈھے کو سوتا چھوڑ کر یوں اپنے گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہُوا جیسے اُس سے کسی نے کہہ دیا ہو کہ تیرے مکان کو آگ لگ گئی ہے۔ اتنی سویرے اسے ٹیکسی ملی نہ کوئی اور سواری۔ وہ تیز قدم چلتا گیا اور صبح کا اُجالا نکھرنے سے ذرا پہلے گھر پہنچ گیا۔ لڑکے نے دروازہ کھولا تو وہ اسی تیزی سے اپنے کمرے میں گیا۔ ناز اور بچہ سوتے ہوئے تھے۔

جیدا رک گیا اور اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ نیند میں چلتا رہا ہے اور آنکھ کھل گئی ہے۔ اُسے کوفت سی ہوئی کہ وہ کیوں بھاگ آیا تھا۔ کس کی خاطر اس نے اتنا طویل راستہ پیدل طے کیا تھا۔... ناز کی خاطر؟ بچے کی خاطر؟..... وہ بے چین سا ہونے لگا اور سر جھکاتے پلنگ تک گیا۔ لیٹا اور سو گیا۔

بچہ اب بیٹھتا بھی تھا، ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا بھی تھا اور سہارا لے کے کھڑا بھی ہو جاتا تھا۔ گھر میں اب کوئی چیز اس کی دسترس سے محفوظ نہیں تھی۔ رینگتے سرکتے صحن اور برآمدے میں گھوم پھر آتا تھا۔ ناز ستار لے کے بیٹھتی تو وہ ستار پر جھپٹے مارنے لگتا تھا۔ وہ ستار کہیں اونچی جگہ رکھتی تو وہ چیخ چیخ کر بُرا حال کر لیتا تھا۔ دو بار اُس نے تار توڑے تھے اور ایک بار تار سے اپنی انگلی کاٹ لی تھی۔

جیدا شاید شام تک نہ جاگتا لیکن وہ چونک کے جاگ اُٹھا۔ دیکھا، بچہ اس کے منہ پر ننھے ننھے تھپڑ مار رہا تھا اور چیخ چیخ کے ہنس رہا تھا۔ ناز کمرے میں نہیں تھی۔ جیدا نے لپک کر بچے کو اٹھایا اور اپنے سینے پر لٹا لیا لیکن بچہ لیٹنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اُس نے جیدا کے سینے پر کودنا شروع کر دیا۔ ننھے کی بندروں جیسی حرکتوں پر جیدا پہلے مسکرایا پھر کھل کر ہنسا لیکن اپنی ہی ہنسی کی آواز پر چونک اٹھا۔ پھر یوں ادھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے وہ خود نہیں کوئی اور ہنسا تھا۔ اس کی نگاہیں ہنسی کی بھٹکتی گونج کا تعاقب کر رہی تھیں۔

وہ جھنجھلایا، لیٹے لیٹے بچے کو فرش پر بٹھا کر اُٹھا اور باہر کو چل پڑا۔ اُس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ اس سے پہلے اُس کا دل کبھی یوں نہیں دھڑکا تھا۔ قتل اور ڈاکے کے وقت بھی اُس کا دل یوں نہیں دھڑکا کرتا تھا۔ اُس نے تو کبھی محسوس ہی نہیں کیا تھا کہ اس کے سینے میں دل ہے جو دھڑکتا ہے۔

"ناشتہ نہیں کرو گے؟"

اُس نے گھوم کے دیکھا۔ ناز ہاتھ میں ٹرے اٹھائے برآمدے میں کھڑی تھی۔

"نہیں!" — جیدا نے کہا — "میں باہر جا رہا ہوں" — اور وہ دروازے کی طرف چل پڑا۔

اُسے بچے کی چیخ سنائی دی۔ اس نے گھوم کے دیکھا، بچہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل اس کی طرف بھاگا آ رہا تھا اور رو رہا تھا۔ جیدا لوٹ آیا اور لپک کر بچے کو اٹھا لیا۔ بچہ چپ ہو گیا اور ایک ہاتھ سے اس کا ایک کان اور دوسرے ہاتھ سے اُس کی ناک پکڑ لی۔ جیدا کے سارے وجود میں مسرت اور پیار کی لہر دوڑ گئی۔

اتنے میں ٹیپو کمرے میں آیا۔ بولا — "اُستاد! وقت ہو رہا ہے۔ اُدھر چلنا ہے۔"

جیدا کو یاد آ گیا کہ انہیں ایک خاص پروگرام پر جانا تھا جہاں اس کی موجودگی لازمی تھی لیکن بچہ اس کی گود میں بیٹھا تھا اور وہ چمچ سے بچے کو چائے پلا رہا تھا۔ ٹیپو نے جب اُسے کہا کہ وقت ہو رہا ہے تو جیدا کو صدمہ سا ہُوا جیسے اُسے حسین خواب سے جگا دیا گیا ہو۔

"مجھے ضرور لے چلو گے؟" — جیدا نے ایسی آواز میں کہا جس میں بے لبسی اور مایوسی تھی — "تم ہی چلے

جاؤ، تمہیں معلوم ہی ہے کیا کرنا ہے۔"

ٹیپو کے ماتھے کے شکن گہرے ہو گئے اور اُس کی آنکھیں سُکڑ گئیں۔ اُس نے جیدا کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جس میں احتجاج بھی تھا، شکوہ بھی۔ اس کی سکڑی ہُوئی نگاہیں اور ماتھے کے شکن بزبانِ خاموشی کہہ رہے تھے "تم نے کبھی یوں تو نہیں کہا تھا استاد!" یا شاید وہ اپنے استاد سے کہنا چاہتا تھا کہ تم کبھی یوں بے بس اور مایوس تو نہیں ہُوتے تھے۔

ٹیپو کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ ناز ٹیپو کے تیور بھانپ گئی۔

"چلے جاؤ نا!" — ناز نے سنجیدگی سے کہا — "یا تو چھوڑ دو اس دھندے کو اور شریفوں کی زندگی بسر کرو۔ ممکن نہیں تو دوستوں سے یوں تو نہ بگاڑو۔ وہ بلانے آیا اور تم نے ٹال دیا۔"

جیدا نے ناز کو دیکھا۔ اُس کے چہرے پر حسین سی متانت تھی۔ اُسے یوں لگا جیسے اس کا ہر فیصلہ ناز ہی کیا کرتی ہے اور وہی اس کے لیے سوچا کرتی ہے۔ ایسے میں اُسے ناز کے حُسن میں تقدّس کی سی جھلک نظر آتی اس نے بچے کو پلنگ پر بٹھایا۔ چائے کی پیالی پی اور بغیر بات کیے باہر نکل گیا۔

مُنّا اور ٹیپو ابھی دور نہیں گئے تھے۔ جیدا نے انہیں جا لیا اور ٹیپو کے کندھے پر بھرپور تھپڑ مار کر بولا — "کیوں ٹھیے! منہ لبسورے چلے آئے تھے؟ میں تو ذرا مذاق کے موڈ میں تھا۔"

"استاد!" — ٹیپو نے غصیلی سی سنجیدگی سے کہا — "اس چھوکری کو چلتا کرو ورنہ کراچی میں پٹ جاؤ گے۔ تمہارے بالکے تمہارے سر چڑھ کے کُودیں گے۔"

جیدا نے کھل کر قہقہہ لگایا اور بولا — "تم پاگل ہو ٹیپو!"

اب کے وہ اپنے قہقہے پر نہ چونکا۔ یہ اُس کی اپنی دنیا کا قہقہہ تھا جس میں جرم کا خمار تھا، گناہ کی لذت تھی اور جس میں انسانی جذبات کا ذرہ بھر دخل نہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر پہلے کمرے میں وہ اپنی جس ہنسی پر ٹھٹھک گیا تھا، وہ دوسری دنیا کی ہنسی تھی — اس دنیا کی ہنسی جس میں اس کی روح تشنہ اور دل پیاسا ہوتا تھا۔

جیدا کی سرگرمیوں میں سیاسی جرائم روز بروز بڑھ رہے تھے۔ اخلاقی جرائم کی رفتار تو پہلے ہی بہت تیز تھی۔ اُس کا گروہ اور ہر وہ گروہ جسے پشت پناہی حاصل تھی دن دہاڑے ڈاکے ڈال رہا تھا۔ چلتی بسوں میں جیبیں کٹ رہی تھیں۔ گرفتاریاں بھی ہوتی تھیں اور عدالتوں میں مقدموں کے انبار لگتے جا رہے تھے۔ جیدا کو ادھر بھی توجہ دینی ہوتی تھی۔ سیاسی اکھاڑے کی بھاگ دوڑ الگ تھی۔ حریف پارٹیوں کی بھی جاسوسی کرنی ہوتی تھی۔ چنانچہ اُس نے رات کے پروگرام مُنّے اور ٹیپو کے سپرد کر دیے تھے۔

وہ دونوں بھی کم استاد نہیں تھے۔ بچپن کے جرائم پیشہ تھے۔ ٹیپو نے سولہ سترہ برس کی عمر میں حیدر آباد کے گرد و نواح میں ایک سال تن تنہا رہزنی کی تھی اور مُنّے کو تو بمبئی کے استادوں نے پالا پوسا تھا۔ جیدا کو ان پر مکمل بھروسہ تھا۔

سیاسی اور اخلاقی جرائم میں وقت اُڑا جا رہا تھا۔ نت نئی سیاسی پارٹیاں جنم لے رہی تھیں۔ نئے محاذ قائم ہو رہے تھے۔ نئے نئے حربے استعمال ہو رہے تھے۔ پرانی شراب نئی بوتلوں میں پیش کی جا رہی تھی۔ عوام کی آنکھوں میں نئی سے نئی دھول جھونکی جا رہی تھی اور جلسوں، ہنگاموں، بیانوں اور کراتے کے نعروں کے غل غپاڑہ میں عوام کی سسکیاں اور فریادیں دب کے رہ گئیں۔

جیدا کا دن تو بھاگ دوڑ میں گزر جاتا تھا لیکن شام ہوتے ہی وہ ایسی بے کلی محسوس کرنے لگتا جو اُس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ ایک شام وہ تھکا ماندہ بوڑھے موسیقار کے ہاں چلا گیا۔ سرود پر تین نغمے سنے اور وہیں لیٹ گیا۔ آنکھ کھلی تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ وہ یوں تڑپ کے اُٹھ بیٹھا جیسے کسی پارسا سے بھولے بھٹکے یا نیم غشی کی کیفیت میں کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو۔ وہ بوڑھے سے بات کیے بغیر باہر نکل گیا اور اپنے زمین دوز گرداب میں بہ گیا۔

دن گزر گیا اور شام کو اُس نے وہی بے قراری محسوس کی جو کل کی تھی۔ چرس بھرے تین سگریٹ پی ڈالے مگر بے قراری بڑھتی ہی گئی۔ ایک اڈے پر جا کے دو بازی فلاش کھیلی، آدھی بوتل وسکی پی لی مگر ذہنی کیفیت پر ذرّہ بھر اثر نہ ہُوا۔

رات کا دوسرا پہر تھا۔ جیدا اڈے سے نکلا۔ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ رات بھر سو نہ سکے گا۔ وہ بالی کے ہاں رات گزارنے کی خاطر نیپیر روڈ کی طرف چل پڑا۔ چند ہی قدم چلا تھا کہ اس کے قریب ایک ٹیکسی آ رکی۔

"اُستاد!" — ٹیکسی سے آواز آئی — "کہاں ٹانگیں گھسیٹ رہے ہو، بیٹھو، پہنچا دوں۔"

"کون ہو بھئی؟" — جیدا نے جھک کر ڈرائیور کو دیکھا اور بولا — "اوہ تم ہو.... چلو بھئی۔"

ٹیکسی چلتی رہی۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ باتیں کرتا رہا اور نیپیر روڈ بالی کے پاس جانے کی بجائے اپنے گھر پہنچ گیا۔ اندھیرے میں ہی پلنگ پر بیٹھا، لیٹ بھی گیا لیکن دل اور زیادہ بے چین ہو گیا۔ ذرا دیر کروٹیں بدلیں آخر اُٹھ کے لالٹین جلائی۔ دیکھا ناز اور بچہ سوتے ہُوتے تھے۔ جیدا کے رگ و ریشے میں ٹھنڈا سا سکون سرایت کرنے لگا جیسے بخار کی تپش خوشگوار تکان بن گئی ہو۔ وہ دونوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

دو بلّیاں دیوار سے کُود کر صحن میں آ گئیں اور مکان کا ماحول بلّیوں کی لڑائی کی پُرہول آوازوں سے لرز اٹھا۔ جیدا چونک کر باہر کو دوڑا جیسے بلّیاں بچے پر جھپٹنے کو آ رہی ہوں۔ بلّیاں کمرے سے دور صحن میں لڑ رہی تھیں جو پہلے بھی یہاں آ کے لڑا کرتی تھیں لیکن جیدا نے آج پہلی بار محسوس کیا کہ بلّیوں کی آواز کس قدر ڈراونی ہوتی ہے اور اس سے بچے ڈر جاتے ہوں گے۔

وہ صحن میں ان کی طرف دوڑا تو بلیاں دیوار پر چڑھ کر اندھیرے میں گم ہو گئیں۔ جیدا کمرے میں واپس آیا تو اُس پر فاتحانہ سی کیفیت طاری تھی جیسے کسی دشمن کو قتل کر آیا ہو۔ وہ مسرور تھا۔ اُس کی کوئی ایسی حس سکون پذیر ہو گئی تھی جس کی موجودگی کا اسے علم تک نہ تھا۔ اس نے لالٹین کی بتی مدہم کر دی، لیٹا اور لیٹتے ہی سو گیا۔

سورج بہت چڑھ آیا تھا جب اُس کی آنکھ کھلی۔ دیکھا بچہ صحن میں کھیل رہا تھا۔ مُنّا اور ٹیپو صبح سویرے سے اُس کے منتظر تھے۔ ان کے مخبر نے اطلاع دی تھی کہ کم و بیش چالیس ہزار روپیہ ایک کار میں حیدر آباد جا رہا ہے۔ ان کا ارادہ تھا کہ حیدر آباد سے چند میل اِس طرف رہزنی کی جائے۔

جیدا کو دیکھ کر مُنّا باہر آیا اور اسے تمام تر تفصیلات بتائیں اور یہ بھی کہ انہیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیئے ورنہ کار نکل جائے گی۔ جیدا کے چہرے پر رونق آ گئی۔

"تم دونوں تیار ہو جاؤ" — اس نے کہا — "میں چلوں گا۔"

مُنّا بھاگ کر اندر چلا گیا۔ جیدا کمرے کی طرف چلا تو بچے نے دیکھ لیا اور "بُو بُو" کرتا اس کی طرف بھاگا۔ جیدا نے اسے ٹال دینا چاہا لیکن بچہ اُس کی ٹانگوں سے لپٹ چکا تھا۔ جیدا نے اسے گودی نہ اٹھایا۔ بچے نے

اس کی انگلی تھام لی اور صحن کی طرف کھینچنے لگا۔ وہ اب جھومتا ڈولتا چل بھی لیتا تھا۔ جیدا کو بچے نے صحن کے وسط میں بٹھا لیا جہاں تین چمچ پڑے تھے۔ بچے کے پاس کھلونا تو کوئی تھا نہیں۔ وہ باورچی خانے سے چمچ اٹھا لایا تھا اور ان سے مٹی کھود رہا تھا۔

بچے نے ایک چمچ جیدا کے ہاتھ میں دے دیا اور ضد کرنے لگا کہ "تو" بھی مٹی کھودے۔ جیدا بچے کے ساتھ بچہ بن چکا تھا۔

"چلو استاد!" — ٹیپو کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"جلدی اٹھو استاد!" — مُنّے نے کہا۔

جیدا نے دونوں کو یوں دیکھا جیسے پھانسی کا قیدی آخری صبح اُن وارڈروں کو دیکھ رہا ہو جو اسے پھانسی کے تختے کی طرف لے جانے آتے ہوں۔

"ٹیپو!" — جیدا نے کہا — "میرا خیال ہے جانے دو۔"

"استاد؟" — ٹیپو نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا — "کیا کہا؟ .... جانے دو؟"

"اتنی دور جانا اچھا نہیں" — جیدا بول رہا تھا لیکن زبان جیسے ہکلا رہی تھی۔ اکھڑی اکھڑی سی آواز میں بولا — "ہو سکتا ہے کار والوں کے پاس پستول یا بندوق ہو .... دیکھو نا! اتنی دور ....."

لیکن وہ فقرہ پورا نہ کر سکا کیونکہ مُنّا اور ٹیپو اُس کی بات ادھوری چھوڑ کر جا چکے تھے۔

مُنّا اور ٹیپو تو اپنے کمرے میں چلے گئے لیکن جیدا ان کے ردِ عمل کو نظر انداز نہ کر سکا۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اُسے اپنا سلوک اچھا نہ لگا۔ اس نے شکار کی خبر پا کر کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کوئی بندوق اور پستول لیے سامنے آ جائے گا۔ وہ تو ہر لمحہ مرنے مارنے پر تُلا رہتا تھا مگر آج اس نے ساتھیوں کو بندوق اور پستول سے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔

جیدا اپنے کہے ہوئے الفاظ پر پٹپٹا اٹھا۔ وہ اٹھا اور بچے کو یکسر نظر انداز کر کے کمرے میں چلا گیا اور لیٹ گیا۔ ناز نے چائے لا کے رکھی اور اُس نے جانے کیا کہا لیکن جیدا نے نہ چائے کو دیکھا نہ ناز کو نہ اس کی بات سُنی۔ وہ تلخ سی سوچ میں کھویا ہُوا تھا اور اپنے آپ میں بزدلی خفت اور جھینپ محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے کوشش کی کہ ایک ہی چھلانگ میں اس ذہنی کش مکش سے نکل آتے اور اپنی دنیا میں جا پہنچے لیکن اس کی اپنی ہی ذات میں کوئی عظیم قوت جاگ اٹھی تھی جو اسے پا بجولاں کیے ہوئے تھی۔

جیدا آزاد ہونے کو ہاتھ پاؤں مارنے لگا لیکن خیال الجھتے ہی گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی داخلی دنیا میں ہنگامہ بپا ہو گیا — وہ جھنجھلا کر اٹھ بیٹھا۔

ذرا سی دیر کمرے میں ٹہلا، بے خیالی میں ٹھنڈی چائے کی ایک پیالی پی اور میز پر جا بیٹھا۔ دراز کھولی اور ڈائری نکال کر ورق الٹنے لگا اور برسوں پہلے لکھے ہوئے ایک صفحے پر رک گیا۔ ایک ایک لفظ سے خون ٹپک رہا تھا۔ نہایت خوفناک واردات لکھ رکھی تھی۔ جیدا پڑھنے لگا اور برسوں پرانی وہ واردات اُس کے تصوّروں میں ابھر آئی۔ جیدا تصوّروں کی دنیا میں دور تک نکل گیا۔ اس کے جسم نے جھرجھری لی اور وہ یوں اچک کے اُٹھ بیٹھا جیسے زنجیریں ٹوٹ گئی ہوں۔ ڈائری کے ایک ہی ورق نے پیار، محبّت کی زنجیریں توڑ دیں اور وہ اپنی دنیا میں پہنچ گیا۔

دوسرے لمحے وہ مُنّے اور ٹیپو کے کمرے میں کھڑا تھا — ناز اپنے کمرے میں کھڑی رہی — کھوئی کھوئی سی!

"سنو بھئی" — جیدا نے کہا — "میں نے حیدرآباد جانے سے تمہیں روکا تھا۔ تم شاید غلط سمجھ بیٹھے ہو۔

آج بہت ضروری کام ہے" — دونوں متوجہ ہُوتے۔ جیدا نے کہا — "وہ جو نیا لیڈر ہے نا! .... کیا نام ہے اُس کا .... آغا .... وہ چھوٹی چھوٹی داڑھی والا .... آج اُس کا ستیاناس کر دو۔ تمام چھوکروں سے کہہ دو۔ آج ہی ایرانی ہوٹلوں میں جا بیٹھیں۔ بس سٹاپوں پر جم کے کھڑے ہو جائیں۔ مسجدوں میں پہنچیں اور جگہ جگہ مومنوں کی صورت بنا کر خبر پھیلا دیں کہ آغا نے ایک لڑکی کو اپنی کوٹھی میں ملازمت دینے کے بہانے بے آبرو کیا ہے۔ لڑکی نے شور مچا دیا تو آغا نے اُسے قتل کروا دیا ہے اور لاش کا کچھ پتہ نہیں .... باقی تم جانتے ہی ہو کہ افواہ کس طرح پھیلائی جاتی ہے۔ پیسے لیتے جاؤ۔ یہ چھ ہزار کا سودا ہے۔ میں کل پارٹی سے پیسے وصول کر لوں گا۔"

صرف مُنّا اور ٹیپو ہی نہیں، ان کا سارا گروہ کسی کے خلاف جھوٹی خبریں گھڑ کر نفرت پھیلانے میں ماہر تھا۔ کراچی میں ایک نئی سیاسی پارٹی بنی تھی جس کا بانی اور لیڈر کوئی آغا تھا۔ نئے لیڈروں کو میدان سے بھگانے کا بہترین ذریعہ یہ تھا کہ ان کے خلاف کوئی سکینڈل گھڑ وا کر اس کی تشہیر کرو۔ دوسرا ذریعہ بلیک میلنگ کا تھا۔ یہ کام پڑھی لکھی اور بڑی ہوشیار طوائفوں سے کرایا جاتا تھا۔

تیسرا ذریعہ پولیس تھی۔ پولیس حکومت کی تھی اور حکومت جس پارٹی کی تھی وہ حزبِ اختلاف کے جس لیڈر کو چاہے کسی نہ کسی جرم میں گرفتار کرا دیتی تھی۔ پولیس اس کے خلاف مقدمہ تیار کرتی تھی اور جیدا اور اس کے گروہ کے آدمی استغاثہ کے گواہ ہوتے تھے۔ عدالت میں جیدا کسی رفاہی ادارے کا صدر اور اس کے باقی معزز اور مظلوم شہری ہوتے تھے۔

اب ایک لیڈر کو عوام کی نظروں میں گرانے کی ضرورت محسوس ہُوئی تو جیدا کی خدمات حاصل کی گئیں۔ جیدا نے مُنّے اور ٹیپو کو ہدایات جاری کر دیں۔ وہ دونوں جو ابھی ابھی اپنے استاد سے مایوس ہو گئے تھے اس مہم پر روانہ ہو گئے۔ انہیں خوشی اس پر ہوئی کہ ان کا استاد اپنی دنیا میں واپس آ گیا تھا۔

جیدا ناز کے کمرے میں نہ گیا۔ وہ بچے کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اُسے بچے کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا جیسے بچے سے بھاگ نکلا ہو۔

میری ویدر ٹاور تلے بسوں کی قطار کھڑی مسافروں کے ہجوم کو نگل رہی تھی اور ایک طرف پندرہ بیس آدمی کسی کونے میں لیے کھڑے تھے۔ جیدا نے آگے بڑھ کے دیکھا۔ مُنّا چہرے پر غربت، پارسائی اور مظلومیت کے تاثرات پیدا کیے لوگوں کو ایک سیاسی لیڈر کے خلاف سکینڈل سنا رہا تھا۔ جیدا نے دیکھا کہ سننے والوں کا مجمع بڑھتا جا رہا تھا اور ان کے چہروں پر غم و غصے کے تاثرات نمایاں ہو رہے تھے۔ مُنّا اس لیڈر اور اُس کی پارٹی کے خلاف جو نفرت پھیلا رہا تھا وہ سننے والوں کے دلوں میں اُتر کر آنکھوں میں ظاہر ہونے لگی تھی۔

مُنّے نے جگہ نہایت موزوں ڈھونڈی تھی۔ ٹاور وہ مقام ہے جہاں کراچی کی تمام بسیں آتی ہیں اور کراچی کے کونوں کھدروں کے مسافر یہاں سے بسوں میں سوار ہوتے ہیں۔ آج ان بسوں کے مسافر محلّے والوں کو سنانے کے لیے انتہائی سنسنی خیز اور دردبھری خبر ساتھ لیے جا رہے تھے۔ ٹاور سے جو بس نکلتی تھی غم و غصّہ اور اس سیاسی لیڈر کے خلاف نفرت و حقارت کے شعلے لے کے نکلتی تھی۔

جیدا ٹاور سے پیدل ہی چل پڑا اور ٹرام پٹے کے سٹاپ پر پہنچ گیا۔ وہاں اس کے گروہ کا ایک اور آدمی مُنّے سے بھی زیادہ دردناک لہجے میں یہی سکینڈل ایک محفل میں بیٹھا سنا رہا تھا اور سٹاپ پر کھڑے مسافر نفرت سے دانت پیس رہے تھے۔

جیدا ماہرِ نفسیات نہیں تھا۔ وہ تو خود نفسیاتی مریض تھا لیکن وہ اپنے ملک کے لوگوں کی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ لوگ فریب خوردہ ہیں اور فریب پر فریب کھاتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ ایک ایسی کشتی کے مسافر ہیں جس کے ملاح کشتی میں سوراخ کر رہے ہیں۔ ہر ملاح دوسروں سے مختلف سمت کو چپّو مار رہا ہے اور کشتی ڈول رہی ہے۔

جیدا جانتا تھا کہ مہنگائی، بے انصافی، رشوت خوری اور جرائم پیشہ لوگوں کی دہشت کے مارے ہوئے لوگ ایسی افواہوں کو فوراً مان لیتے ہیں جو کسی لیڈر کو رسوا کرنے کے لیے پھیلائی جاتی ہیں۔ ان افواہوں میں عوام کی تسکین کا سامان ہے اور وہ ان افواہوں کو اور زیادہ دل پسند بنا کر آگے پھیلاتے ہیں۔

جیدا خراماں خراماں صدر تک پہنچ گیا اور ریگل کے سٹاپ پر جا رکا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ ایک آدمی نے اسے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "بھائی صاحب! سُنا آپ نے بھی؟"

"کیا؟"

اس آدمی نے جیدا کو وہی سکینڈل سنا دیا جس کا خالق جیدا ہی تھا۔

"آخر اس ملک کا حشر کیا ہوگا بھائی صاحب!" — اس آدمی نے احتجاج سے بھرپور آواز میں کہا — "خدا کا قہر نازل نہ ہوگا اس مُلک پر؟ اللہ بیڑہ غرق کرے اس لیڈر کا بھائی صاحب! غریبوں کی بہو بیٹیوں کی عزت بھی محفوظ نہیں اس مُلک میں!"

جیدا نے سکینڈل میں رنگ آمیزی شروع کی تو اس آدمی کے آنسو نکل آئے اور تھوڑی دیر بعد جیدا کے گرد ایک ہجوم جمع ہو گیا جو دیکھتے ہی دیکھتے احتجاج اور غم و غصے کا سمندر بن گیا۔ جیدا کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اس سمندر میں طوفان بپا کر رہے تھے اور اُس کے چہرے پر وہی رونق آ رہی تھی اور رگوں میں وہی لذّت سرایت کر رہی تھی جو وہ ڈاکہ ڈالتے، جیب کاٹتے یا تالا توڑتے محسوس کیا کرتا تھا۔

دوپہر تک لیبں غم و غصے کے گرجتے بادل کراچی کے کونے کونے میں اُمگل آئیں۔

جیدا لوہری بازار سے گزر رہا تھا۔ اُس نے ایک ریڑھے کے گرد چند آدمی کھڑے دیکھے جن میں سے ایک نے ریڑھے والے سے کچھ خریدا۔ نوٹوں کا بنڈل پتلون کی جیب سے نکال کر دس کا ایک نوٹ ریڑھے والے کو دیا اور باقی نوٹ جیب میں ڈال لیے۔

جیدا نوٹوں کو دیکھ کر آگے بڑھا۔ پتلون جیسی آسان ترین جیب میں دس دس کے اتنے نوٹ جیدا کو اپنی طرف کیوں نہ کھینچتے؟ جب وہ اس آدمی کے عقب میں ساتھ لگ کے کھڑا ہُوا تو اُس نے دیکھا کہ ریڑھے پر طرح طرح کے کھلونے سجے ہوتے تھے اور وہ آدمی کھلونے خرید رہا تھا۔

جیدا نے ہاتھ اُس کی جیب کی طرف بڑھایا تو اس آدمی نے ایک جھنجھنا اٹھا کے بجایا اور ریڑھے والے سے کہا — "یہ بھی دے دو۔"

جھنجھنے کا معصوم سا چھنا کا جیدا کے ذہن میں بجلی کی طرح کڑکا اور اس کے ساتھ ذہن میں ایسی چمک جیسے

اُس کی آنکھیں خیرہ ہو گئی ہوں۔ اُس نے شکار کی طرف بڑھایا ہُوا ہاتھ ریڑھے کی طرف بڑھا کر ایک جھنجھنا اُٹھا لیا اور بولا — "ایک مجھے دے دو اور وہ چابی والی موٹر بھی۔"

جب اس کا شکار وہاں سے چلنے لگا تو جیدا نے اسے روک کر کہا — "مسٹر! جس جیب میں آپ نے نوٹ رکھے ہوتے ہیں وہاں سے کسی بھی وقت اُڑ جائیں گے۔ ذرا سنبھال کے رکھو، یہ کراچی ہے۔"

اس آدمی نے چونک کر نوٹ پتلون کی جیب سے نکال کر کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیے اور چلا گیا۔

جیدا کے ہاتھ میں جھنجھنا تھا۔ اُس نے اسے ہلایا تو اس کے چھناکے نے اُسے دور کہیں ماضی میں پھینک دیا۔ اس نے آنکھیں یوں سکیڑ لیں جیسے شام کے دھندلکے میں دور کسی چیز کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو — اُسے یاد آنے لگا کہ ایسی آواز اُس نے برسوں پہلے بھی کہیں سنی تھی اور جھنجھنا اس کے اپنے ہاتھوں نے بجایا تھا۔ شاید کوئی اس کے لیے جھنجھنا لایا تھا۔

وہ جھنجھلا اٹھا اور چل پڑا مگر اسے محسوس ہونے لگا کہ اُس کی چال میں تبدیلی سی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ تو جیسے اپنی چال ڈھال ہی بھول چلا تھا۔

جیدا گھر آیا تو ناز بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ جیدا نے جھنجھنا اور موٹر ناز کی طرف بڑھائی تو وہ خود ہی جیسے چونک اٹھا ہو۔ اُسے اپنے آپ پر غصّہ سا آنے لگا اور وہ سٹپٹا اٹھا۔ کچھ اس لیے کہ وہ جن زنجیروں سے بھاگنا چاہتا تھا انہیں اپنے ہاتھوں اپنے گرد لپیٹتا جا رہا تھا اور زیادہ تر اس لیے کہ وہ جذبات کے جھمیلوں میں اُلجھ کر ہاتھ آیا شکار ہاتھ سے نکال آیا تھا۔

اُس نے کھلونے ناز کی طرف پھینک دیے۔ ناز کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ پھیل گئی جو جیدا نے اس کے ہونٹوں پر پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

ناز نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کی آنکھوں میں بھی اس قسم کی مسکراہٹ تھی۔ جیدا نے اپنے آپ میں لطیف سا لرزہ محسوس کیا۔ وہ ان نظروں کا سامنا نہ کر سکا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

جیدا کرسی پر بیٹھا، ٹانگیں میز پر رکھیں اور پیشانی پر یوں ہاتھ پھیرنے لگا جیسے دماغ میں کوئی بھونڈا سا خیال اٹک گیا ہو جس کی چبھن سے دل بیٹھا جا رہا ہو۔

ناز کو اس مکان میں آئے سال بھر سے زیادہ عرصہ بیت چلا تھا۔ اس عرصے میں جیدا نے ناز سے بے تکلف ہونے یا کھل کر بات کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ اُس نے جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ حسین اور دل کش ہی سہی وہ ناز کے جسم کو چھوئے گا بھی نہیں۔ وہ ناز کو ذرہ برابر اہمیّت نہیں دینا چاہتا تھا لیکن ناز جب اُسے نظر بھر کر یا تشنہ سی نگاہوں سے دیکھتی تھی تو جیدا اس کی نگاہوں کا سامنا کرنے سے گھبرانے لگتا تھا اور وہ شدت سے محسوس کرنے لگتا تھا کہ اس گھر میں یا اس کی اپنی زندگی میں ناز کی کچھ نہ کچھ اہمیّت ضرور ہے جس سے وہ انکار نہیں کر سکتا۔

ناز اس قید اور تنہائی کا جزو بن چکی تھی۔ وہ جرم و گناہ کی اس زمین دوز دنیا کا حسین اور پُراسرار ذرہ بن گئی تھی۔ اُس کے دل میں ایک خدشہ گھر کر گیا تھا کہ وہ جب بھی اس قید سے نکلی تو اس کی ذات ہی فنا ہو جائے گی اور اس کی انفرادیت ہی ختم ہو جائے گی۔ یہ ایک گریز تھا اور لاشعوری فرار۔ وہ دنیا کی گہما گہمی میں لوٹ جانے سے گھبرا رہی تھی۔ وہ مظلوم کم اور مجرم زیادہ تھی۔ گناہگار کو پناہ ملی تو گناہوں کی بستی میں ملی اور اُس نے اس بستی سے سمجھوتہ کر لیا۔

اُسے صرف ایک دکھ تھا کہ جیدا اس کے ساتھ کھل کر بات نہیں کرتا تھا نہ اُس کے پاس بیٹھتا تھا۔ دل بہلانے کو اس کے پاس ستار بھی تھی اور بچہ بھی لیکن ستار اُس نے جیدا کی خاطر سیکھی تھی اور بچے کو بھی اسی کی خاطر گود لیا تھا۔ اس کے باوجود جیدا اس سے دور ہی رہتا تھا۔

مہذّب دنیا کے تمدّن نے اسے جو جھٹکے دیے تھے اور آخر میں اسلم نے اسے جس طرح آسمان سے پٹخا تھا اس کے سب بل نکل گئے تھے اور وہ جیدا کے قدموں میں گر پڑی تھی۔ اس نے جیدا سے اسلم کے متعلق کبھی بات نہیں کی تھی نہ جیدا نے کبھی اس کا نام لیا تھا۔ ناز اسلم کو بھول ہی جانا چاہتی تھی، لیکن اُسے معلوم نہ تھا کہ چھ مہینے ہوتے اسلم اس دنیا سے اٹھ گیا ہے۔ اسلم خودکشی کر چکا تھا۔

جیدا کے بلیک میلروں نے تین بار اسلم کو بلیک میل کیا تھا اور ناز کا اغوا بھوت کی طرح اس کے دل و دماغ پر سوار ہو گیا تھا۔ اُس نے جانے کیسے کیسے جتنوں سے ڈیڑھ ہزار روپیہ جیدا کے بلیک میلروں کو دیا اور ان کے قدموں میں سر رکھ کے رویا تھا کہ ناز کو عدالت میں پیش نہ ہونے دیں۔ آخری بار وہ چند دنوں کے لیے کراچی آیا تھا تو جیدا کے آدمیوں نے اُسے دیکھ لیا اور رات کے وقت اس کے ہاں جا دھمکے تھے۔ وہ ایک فلیٹ کی تیسری منزل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ جیدا کے آدمیوں نے اسے کہا کہ ہم ناز کو کورٹ میں پیش کرنے والے ہیں اور وہ بیان دے گی کہ مجھے اسلم نے زبردستی اغوا کیا اور بیچ ڈالا تھا اور ہم تمہارے خلاف ٹھوس شہادت اور ثبوت پیش کریں گے۔

اسلم تہذیب یافتہ جرائم پیشہ تھا۔ اُسے زمیں دوز دنیا کے باسیوں سے کبھی پالا نہیں پڑا تھا۔ البتہ اس حقیقت سے خوب واقف تھا کہ جیدا جیسے استاد تھانیداروں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں اور وہ پولیس کو اپنے ڈھب پر چلانا جانتے ہیں۔

اسلم نے یہ دھمکی سُنی تو کھڑکی کھولی اور سر کے بل تیسری منزل سے کود گیا۔ جیدا کے آدمی بھاگ آئے ورنہ قتل میں پکڑے جاتے۔

آج جیدا میز پر ٹانگیں پھیلاتے سوچ رہا تھا کہ وہ کیسی منحوس گھڑی تھی جب اس نے ناز کو اسلم سے خریدا تھا۔ خرید ہی لیا تھا تو آگے چلا دیتا۔

آگے چلانے کا خیال آیا تو اس کی سوچ کا رخ بدلنے لگا۔ اُس نے سوچا ناز کو تو اب بھی چلایا جا سکتا ہے فسٹ کلاس چیز ہے۔ تین ساڑھے تین ہزار کا گاہک آسانی سے مل سکتا ہے۔ اُس نے سر کو جھٹک کر فیصلہ کر لیا کہ ناز کو بیچ دے گا۔ اس فیصلے سے اس کی ذہنی خلفشار یکبار گی تھم گئی جیسے وہ زنجیریں ٹوٹ گئی ہوں جن میں وہ گرفتار تھا۔ دل پر جو بوجھ آ پڑا تھا اتر گیا اور وہ اپنے اصلی روپ میں آ گیا — ڈاکو، بردہ فروش جیدا جیب کترا!

دوسرے کمرے سے جھنجھنے کے چھناکے اور بچے کے قہقہے سنائی دینے لگے۔ معصوم سی یہ آوازیں جیدا کے دماغ میں ہتھوڑوں کی ضربوں کی طرح پڑنے لگیں جیسے اُس کا اپنا ضمیر اسے ہتھوڑوں سے پیٹ رہا ہو۔ جیدا دبک کے بیٹھ گیا اور اس کی ہستی میں ابھی ابھی جو بردہ فروش جاگ اٹھا تھا اُس کی ہستی کے ویرانے میں ہی کہیں چھپ گیا۔

دو چار لمحوں بعد بچہ موٹر اٹھائے اس کے پاس آ گیا۔ پیچھے پیچھے ناز تھی۔ بچے نے موٹر جیدا کے ہاتھ میں دے دی۔ جیدا نے بے خیالی سی میں موٹر کو چابی دے کر فرش پر چھوڑ دیا اور کمرہ موٹر کی آواز اور بچے کی تالیوں اور قہقہوں سے گونجنے لگا۔ جیدا کرسی سے اٹھا اور فرش پر بیٹھ گیا اور بچے کے معصوم قہقہوں میں تحلیل ہو گیا۔ اس نے بیتاب ہو کر بچے کو گود میں اٹھا لیا اور اُسے اس قدر زور سے بھینچا کہ بچہ بے اختیار ہنس پڑا اور گال جیدا کے گال سے لگا لیے۔

ناز پلنگ پر بیٹھی دونوں کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے بچے کی رگوں میں اس کا اپنا اور جیدا کا خون ہو۔ اس نے پیار بھرے لہجے میں کہہ دیا — "بچے کو باپ کے ساتھ کتنا پیار ہوتا ہے"!

جیدا اس طرح چونک اٹھا جیسے اُسے کانٹا چبھو دیا گیا ہو۔ وہ اپنے آپ میں آ گیا اور بچے کو ناز کے حوالے کر کے باہر چلا گیا۔

اُس کا سراپا کانپ رہا تھا۔ اُس نے ٹیپو اور منّے کے کمرے میں جا کر چرس کے کئی لمبے لمبے کش لیے لیکن بے قراری جیسے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ناز بچے کے ساتھ باہر صحن میں چلی گئی تھی۔

جیدا تنہائی سی محسوس کرنے لگا۔ اس نے کسی اڈے پر چلے جانے کا بھی ارادہ کیا۔ پھر شمی، گلنار اور بالی باری باری اس کے ذہن میں آئیں اور گزر گئیں — وہ کمرے میں واپس آ گیا۔ وہ اس گھر سے ذرا سی دیر کے لیے بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن فیصلہ نہ کر سکا کہ کہاں جائے۔ وہ جھنجھلا اُٹھا اور اس کے منہ سے نکل گیا — "ناز"۔ ناز آئی تو وہ جیسے بوکھلا گیا ہو۔

"کہو کیا بات ہے؟"

"ویسے ہی بلا لیا تھا" — جیدا نے اُکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ایسی کوئی بات تو نہیں تھی"۔

ناز نے اُس کی پیٹھ پیچھے کھڑے ہو کے ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیے۔

جیدا کرسی پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ ناز کو بلا تو لیا ہے، اب بات کیا کی جائے۔ ناز ہاتھ سرکا کر اس کے سینے تک لے گئی اور جھک کر اپنا گال جیدا کے گال کے ساتھ لگا دیا۔

جیدا نے سر گھمایا تو دونوں کی سانسیں ٹکرانے لگیں۔ جیدا نے پیچھے ہٹنے کی کوشش نہ کی اور اُس نے اپنے آپ کو ناز کے سرور کے سپرد کر دیا۔ اُسے یوں قرار آنے لگا جیسے ناز کے جسم کا لمس اُس کی بیکلی اور بے چینی چوس رہا ہو۔ ناز کی گرفت تنگ تر ہوتی چلی گئی اور جیدا پر بے خودی طاری ہونے لگی۔

"چرس کی بُو سے متلی آنے لگتی ہے" — ناز نے کہا۔

جیدا بیدار ہو گیا۔ وہ ایک ہی جھٹکے سے ناز کی گرفت سے نکل کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور باہر نکل گیا۔

ناز کو دکھ ہوا کہ جیدا کسی طوائف کے پاس چلا گیا ہے۔ اس نے آہ لی اور بڑے تلخ خیالوں میں کھو گئی — جیدا کس کا ہے؟ .... یہ بچہ کس کا ہے؟ .... جیدا سراپا گناہ۔ بچہ ایسے ہی گناہگار باپ اور ایک بن بیاہی مظلوم ماں کا بیٹا .... میں کیوں ان میں کھو گئی ہوں؟ — یہ خیال یہ سوال اسے پریشان کرنے لگے۔ اس نے خیالوں میں اپنے آپ کو جیدا سے اور بچے سے لاتعلق کر لیا مگر اُس پر ہَول سا طاری ہونے لگا — الگ تھلگ اس کی کوئی ذات نہیں تھی۔ اُسے ساتھ کی اور محبت کی ضرورت تھی۔ وہ عورت تھی۔ اُسے ماں بننا تھا — وہ خیالوں میں بھٹکنے لگی اور اُس نے غیر ارادی طور پر بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جیدا ناز کی دنیا سے بھاگ کر فٹ پاتھ پر تیز قدم چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنے آپ میں درد کی ٹیسیں محسوس کر رہا تھا جیسے ناز نے اُسے ڈس لیا ہو۔ اس درد میں ایک گونہ لذّت بھی تھی جس سے وہ زندگی میں پہلی بار روشناس

ہُوا تھا۔ سینے میں ایسا غبار اٹھ رہا تھا جو پہلے کبھی نہیں اٹھا تھا۔ یہ غبار زہر بنتا جا رہا تھا۔ جیدا اور تیز چلنے لگا۔ وہ بار بار سر کو جھٹکتا تھا جیسے ناز کا گال ابھی تک اُس کے گال کے ساتھ لگا ہُوا ہو۔

پُرلطف اور تلخ خیالوں کے ریلے میں بہتا ہُوا وہ بوڑھے موسیقار کے ہاں جا پہنچا اور چند لمحوں بعد وہ ستار کے ہلوروں میں بے خود ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد بوڑھے نے ستار اتار دی مگر جیدا ابھی تک بے خود ہی بیٹھا تھا۔

"تم کئی بار یہاں آئے" — بوڑھے نے کہا — "مگر ہر بار ایک آدھ الاپ سن کر چلے گئے۔"

"اسی لیے تو میں آتا ہوں۔"

"سو بار آؤ بیٹا! لیکن میں تمہارے آنے اور جانے کے انداز میں ابھی تک بیگانگی سی دیکھ رہا ہوں" — بوڑھے نے کہا — "کئی بار خیال آیا تم سے دو باتیں کروں، کچھ پوچھوں، کچھ سنوں مگر تم تو جیسے مجھ سے اپنا آپ چھپائے ہی رکھنا چاہتے ہو۔"

"ایسا تو نہیں بابا!" — جیدا نے کہا — "تم پہلے انسان ہو جس نے میری ذات میں جھانکنے کی کوشش کی ہے.... میری ہستی تو مرگھٹ ہے بابا! میں نے کبھی نہیں چاہا کوئی اس میں جھانکے" — اُس نے آہ لی اور کہا — "لیکن تمہارے پاس آ کر میں نے ہر بار چاہا ہے کہ تم مجھ سے پوچھو کہ میں کون ہوں اور میں تمہیں تیس برسوں پر پھیلی ہوئی داستان سنا دوں۔ معلوم نہیں میں نے ایسا کیوں چاہا؟ شاید اس لیے کہ تم پہلے انسان ہو جس نے مجھے بیٹا کہا ہے اور میں نے تمہاری مسکراہٹ میں باپ کو مسکراتے دیکھا ہے" — جیدا نے چپ ہو کے سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھیں یوں بے چین ہو گئیں جیسے گزرے ہُوئے وقت کی ریت سے لمحات کو چُن رہی ہوں۔

"کہو بیٹا!" — بابا نے پیار سے کہا — "اپنے بابا کو سب کچھ سنا دو۔ بعض دکھ کہہ لینے سے ہی کم ہو جاتے ہیں۔"

"تیس برسوں کی کہانی سنانے کے لیے تیس برس ہی چاہئیں بڑے میاں!" — جیدا نے کہا — "مختصر کر کے سنا دیتا ہوں" — اس نے طویل آہ لی اور بولا — "میرے روگ کا آغاز ایک جانکاہ منظر سے ہوتا ہے۔ اُس وقت میری عمر سات برس تھی۔ میری ماں بستر مرگ پر پڑی تھی۔ میں اُس کے پاس بیٹھا تھا۔ میرا باپ اُس پر جھکا اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ ماں نے مجھے اپنے سینے پر لٹا لیا پھر زور سے بھینچا، میرے سر کو چوما اور ایسے ہی میں اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی....

"باپ نے مجھے اٹھا لیا۔ وہ رو رہا تھا۔ باپ نے ماں کی پیشانی کا بوسہ لیا اور مجھے سینے سے لگا کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی ماں کو دیکھ رہا تھا کبھی باپ کو....

"شام کے وقت لوگ میری ماں کو اٹھا کے میرے سامنے مٹی میں دبا آئے۔ میں رویا اور روتا ہی رہا" — جیدا نے آہ لے کر کہا — "یوں لگتا ہے جیسے میں تیس برس سے رو رہا ہُوں.... ہم اُس وقت بمبئی میں تھے۔ دو برس تک باپ نے مجھے یوں پالا پوسا جیسے وہ میرے دل سے ماں کی یاد کو دھو دینا چاہتا ہو۔ وہ بہت حد تک کامیاب تھا۔ میں اُس کا اکلوتا بچہ تھا۔ اُس نے شاید میری ہی خاطر دوسری شادی نہ کی....

"پڑھنے کا مجھے بہت شوق تھا۔ اپنے ہم جماعتوں سے میں ہمیشہ آگے رہتا تھا۔ باپ کی تبدیلی ناگپور ہو گئی۔ معلوم نہیں اُس کی ملازمت کیسی تھی یا کیا مجبوری تھی کہ وہ مجھے ساتھ نہ لے جا سکا۔ مجھے میرے چچا کے حوالے کر دیا اور مکان کرائے پر دے کر چلا گیا.... چچا کے دو بچے تھے۔ ایک میرا ہم عمر اور دوسرا

دو سال بڑا۔ چچا کے ساتھ طے پایا تھا کہ ہمارے مکان کا کرایہ وصول کر لیا کرے اور اس میں سے میرے تمام اخراجات ادا ہوتے رہیں۔ کرایہ تیس روپے تھا۔ اُس دور کے تیس روپے آج کے تین سو کے برابر تھے....

"میں چچا کے بچوں کے ساتھ سکول جانے لگا۔ چچی ہر صبح اپنے بچوں کو دو دو پیسے دیا کرتی تھی لیکن مجھے کچھ نہ دیتی تھی۔ بچوں سے کہہ دیتی تھی کہ جو کچھ لو گے تھوڑا سا اسے بھی دے دینا اور جس انداز سے وہ یہ فقرہ کہا کرتی تھی، وہ مجھے کانٹے کی طرح چبھا کرتا تھا — اور یہ کانٹا میری ذات میں اترتا چلا گیا جس کی خلش مجھے آج بھی تڑپا رہی ہے۔ ایسے میں مجھے ماں باپ یاد آتے رہے اور میں کئی بار ماں کی قبر پر جا کے رویا۔ چچا زاد بھائی مجھے اپنا نہیں سمجھتے تھے۔ میں ان کے ساتھ رہ کے اپنے آپ کو تنہا سمجھتا تھا۔ اس گھر کے پیار میں میرا کوئی حصّہ نہ تھا....

"تفریح کے وقت وہ دو پیسے کے بسکٹ لے کے کھاتے تھے۔ شروع شروع میں وہ آدھا آدھا بسکٹ مجھے دیتے تھے مگر چند ہی روز بعد اُن کا یہ رویّہ بدل گیا۔ وہ کھاتے رہتے میں کھڑا ان کا منہ دیکھتا رہتا۔ ان سے مانگ کے کھانے پر میری طبیعت آمادہ نہ ہوتی تھی۔ میں ماں باپ کا اکلوتا بچہ تھا، اپنی دنیا کا شہزادہ۔ میں نے گھر میں من مانیاں کی تھیں۔ اب بھکاریوں کی طرح کھڑا بسکٹ کے ذرا سے ٹکڑے کو ترس رہا تھا....

"چچا اور چچی کا رویّہ بدتر تھا۔ وہ مجھ سے اس قدر بیگانہ تھے کہ میں ان سے بھی کچھ مانگنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا اور نہ میں یہ کہہ سکتا تھا کہ ہمارے مکان کے کرائے ہی سے مجھے دو پیسے دے دیا کرو۔ تفریح کے وقت بھوک لگتی تھی۔ آخر میں بھکاری بن ہی گیا اور چچا زاد بھائیوں سے بھیک مانگنے لگا" — جیدا نے بے چین ہو کے کہا — "لیکن بابا! میں بھکاری رہ نہ سکا۔ میں کوئی دو مہینے ان بچوں سے بھیک مانگتا رہا۔ باپ ایسا گیا کہ لوٹ کے نہ آیا اور چچا ہمارے مکان کا کرایہ وصول کرتا رہا....

"پھر چچا زاد بھائیوں نے مجھے بسکٹ کی جگہ دھکے دیئے۔ ایک روز انہوں نے مجھے مارا بھی۔ گھر میں میری پوزیشن نوکر کی سی رہ گئی تھی۔ میرے چھوٹے سے سینے میں بجلیاں کوندنے لگیں۔ میں مجبور ہو گیا تھا بڑے میاں! تلخیاں میری چھوٹی سی کائنات پر گھٹاؤں کی طرح چھانے لگیں۔ میں جل اٹھا۔ بچہ ہی تو تھا میں!

"ایک روز وہ دونوں تفریح کے وقت بسکٹ کھا رہے تھے۔ میں ان کے سامنے جا کھڑا ہُوا اور انہیں للکارا — 'مجھے بسکٹ دیتے ہو کہ نہیں!' — بڑے نے کہا — 'تیرے باپ کے ہیں بسکٹ؟ جا نہیں دیتے!' — میں تو تیار ہو کے گیا تھا۔ میں نے جھپٹا مار کر اُس کے ہاتھ سے بسکٹ چھین لیے اور زمین پر پھینک کر پاؤں تلے مسل ڈالے۔ پھر دوسرے سے بھی چھین لیے۔ دونوں میری طرف بڑھے تو میں نے جیب سے چھوٹا سا چاقو نکال لیا جو میں نے ایک ہم جماعت سے اسی مقصد کے لیے مانگا تھا....

"چاقو دیکھ کے دونوں رک گئے۔ میں نے پھر للکارا — 'آؤ ہمت ہے تو آگے بڑھو۔ دیکھتا ہوں میرے سامنے بیٹھ کر کس طرح کھاتے ہو' — اس کا نتیجہ ظاہر ہے بابا! گھر آیا تو چچی نے مجھے مار مار کر ادھ مُوا کر دیا۔ شام کو چچا آیا تو باقی کسر اُس نے پوری کر دی....

"پھر یہ روزمرہ کا معمول بن گیا کہ میں چچا زاد بھائیوں سے بسکٹ یا پیسے چھین کر پھینک دیتا تھا اور انہیں خوب پیٹا کرتا تھا اور گھر آ کر ان کے ماں باپ سے مار کھاتا تھا۔ ان کے سامنے تو میرا بس نہیں چلتا تھا۔ میں

ان کے بچوں سے انتقام لے لیا کرتا تھا۔ اس مار پٹائی میں اور پیسے چھین کر پھینک دینے میں مجھے لذّت سی محسوس ہونے لگی" ـــ جیدا نے قہر آلود آواز میں کہا ـــ "بابا! میں آج بھی وہی بچپنے والی حرکت کرتا ہوں۔ جس گھر یا جس جیب میں پیسے دیکھتا ہوں اُس پر ٹوٹ پڑتا ہوں۔ پیسے چھین لیتا ہوں اور پھینک دیتا ہوں اور جو میری راہ میں آتا ہے اُس کا خون کر دیتا ہوں....

"اُسی عمر میں ہی مجھ میں اس قدر اذیّت پرستی اور تشدد پسندی پیدا ہو گئی تھی کہ میں چچازاد بھائیوں کے علاوہ دوسرے بچوں کو بھی پیٹ دیا کرتا تھا۔ میں جس سے دست و گریباں ہوتا اُسے لہولہان کر کے دم لیتا تھا"

"تمہارا باپ لوٹ کے نہیں آیا؟" ـــ بوڑھے موسیقار نے پوچھا۔

"آیا تھا، دو برس بعد" ـــ جیدا نے تھوک نگل کے کہا ـــ "چچا اور چچی نے میرے خلاف خوب زہر اُگلا۔ انہوں نے میرے متعلق جو کچھ کہا سچ کہا مگر اپنے متعلق جو کچھ کہا جھوٹ تھا ـــ انہوں نے میرے باپ سے کہا کہ وہ مجھے ہر روز ایک آنہ دیتے ہیں اور یہ بھی کہ مجھے اپنے بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ مجھے زندگی میں پہلی بار معلوم ہُوا کہ جھوٹ بھی بولا جا سکتا ہے۔ مجھے جھوٹ سے نفرت تھی ـــ اس وقت بھی، اب بھی۔ چچا اور چچی نے جی بھر کے جھوٹ بولا مگر میں سچ کہنے کی بھی جرآت نہ کر سکا۔ میں اتنا بھی نہ بتا سکا کہ میں ماں کی قبر پر جا کر رویا کرتا ہوں اور اس مکان کے دروازے پر جا کے بھی رویا کرتا ہوں جہاں اب کرایہ دار رہتے ہیں"

"باپ نے تمہیں مارا ہوگا؟"

"نہیں" ـــ جیدا نے کہا ـــ "اُس نے مجھ سے پیار کیا اور کہا ـــ 'بیٹا تم تو اتنے پیارے بیٹے تھے پیارے بیٹے یوں نہیں کیا کرتے' ـــ میں اُسے کہنا چاہتا تھا کہ یہاں مجھے کوئی بیٹا نہیں کہتا۔ میں اس پیار بھری آواز کو ترس گیا ہوں مگر میں کہہ نہ سکا اور میں اس کے ساتھ لپٹ کے رویا اور ضد کی کہ مجھے وہ ساتھ لے جائے۔ باپ نے کہا کہ وہ دو روز بعد پھر آرہا ہے اور اُسے ساتھ لے جائے گا۔ وہ چلا گیا مگر یہ دو روز بہت طویل ہو گئے....

"چچا کا گھر اب میرے لیے جہنم بن گیا۔ میں نے آوارہ لڑکوں کے ساتھ دوستانہ گانٹھ لیا۔ ان کے ساتھ مل بیٹھنے اور ہنسنے کھیلنے میں مجھے بہت لطف آتا تھا۔ گھر میں تو میرے لیے سوائے ڈانٹ ڈپٹ اور گھُرکیوں کے کچھ نہ تھا۔ چچازاد بھائیوں کے ساتھ میرا رویّہ وہی رہا۔ پھر میں نے گھر میں چوری شروع کر دی۔ ایک بار چچا نے پکڑ لیا اور ستون کے ساتھ باندھ کر اس قدر پیٹا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ اس کا بدلہ میں نے دوسرے ہی دن اُس کے دونوں بچوں سے لے لیا....

"چھ ماہ بعد باپ پھر گھر آیا۔ اب تک میں بہت ہوشیار ہو چکا تھا۔ جونہی چچی نے میرے خلاف زہر اُگلنا شروع کیا میں نے اپنی شروع کر دی اور تفصیل سے بتایا کہ ان لوگوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ سردیوں کی راتیں انہوں نے مجھے نوکروں سے بدتر حالت میں رکھا۔ میں پنسلیں اور کاپیاں لڑکوں سے چُرا چُرا کر استعمال کر رہا ہوں اور یہ بھی کہ انہوں نے عید کے روز میرے لیے نئے کپڑے بھی نہ بنوائے....

"میرا باپ زار و قطار رویا لیکن وہ بے بس تھا۔ جانے مجھے کیوں ساتھ نہ لے جا سکتا تھا۔ مجھے بازار لے گیا۔ میرے نئے کپڑے خریدے۔ ہوٹل میں لے جا کے کھانا کھلایا۔ مٹھائیاں بھی کھلائیں اور مجھے ایک سکول ماسٹر کے گھر لے گیا....

"یہ سکول ماسٹر جانے غیر شادی تھا یا کیا تھا۔ اکیلا رہتا تھا۔ باپ نے مجھے اس کے حوالے کر دیا اور کہا کہ

آئندہ مکان کا کرایہ وہ وصول کر لیا کرے اور اس میں سے میرے اخراجات پورے کر لیا کرے۔ باپ نے اسے خاص طور پر کہا کہ مجھے ایک آنہ ہر روز باقاعدہ ملتا رہا کرے۔ دوسرے روز میرے باپ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ بیٹا اب تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی.... بابا!" ـــ جیدا نے دکھی ہوئی آہ لے کر کہا ـــ "وہ آخری انسان تھا جس نے مجھے بیٹا کہا تھا اور آج تم نے اسی پیار سے بیٹا کہا ہے....

"سکول ماسٹر نے مجھے پیار سے گھر رکھا۔ مجھے کھویا ہُوا پیار واپس ملنے لگا تو میں راہ پر آنے لگا۔ سکول میں لڑائیاں جھگڑے بند ہو گئے۔ چوری چکاری ختم ہو گئی اور میں پھر دل لگا کے پڑھنے لگا۔ ماسٹر مجھے ہر روز ایک آنہ دیتا تھا اور میرا ہر طرح سے خیال رکھتا تھا.... ایک روز مجھے کہنے لگا، جا نل کے پاس جو سبز دروازے والا مکان ہے وہاں سے میرے لیے روٹی مانگ لاؤ۔ وہ اپنی ہانڈی روٹی خود ہی کیا کرتا تھا۔ میں جھجکتے شرماتے چلا گیا اور اُس گھر سے اس کے لیے روٹی مانگ لایا۔ دوسرے روز اُس نے پھر ایک اور گھر سے روٹی لانے کو کہا تو میں نے انکار کر دیا۔ میں نے کہا مجھ سے یوں بھیک نہیں مانگی جاتی۔ اس نے بہت کہا لیکن میں نہ ہی گیا۔ آخر اُس نے مجھے پیسے دیئے اور میں ہوٹل سے کھانا لے آیا....

"چند روز بعد وہ جلدی جلدی میں گھر آیا اور کاغذ کے پُرزے پر کچھ لکھا پھر تہہ کر کے پُرزہ مجھے دیا اور دروازے میں آ کر مجھے کہنے لگا ـــ "وہ دیکھو گلی میں جو عورت کھڑی ہے نا! یہ رقعہ اس کے پاس پھینک کے آگے نکل جانا ـــ میں کاغذ لے کر چل پڑا۔ معلوم نہیں ماسٹر دیکھ رہا تھا یا نہیں۔ میں نے راستے میں رقعہ کھول کر پڑھا۔ لکھا تھا ـــ 'آج رات دروازہ کھٹکھٹانا' ـــ میں سب سمجھتا تھا۔ میں وہیں سے لوٹ آیا اور رقعہ ماسٹر کو دے کر کہا کہ میں ایسے رقعے نہیں لے جایا کرتا۔ اس نے میرے منہ پر زور سے تھپڑ مارا کہ میں نے رقعہ کیوں پڑھا تھا اور یہ بھی کہ میں نے اس کا حکم کیوں نہیں مانا تھا۔ اس نے مجھے یہ سزا بھی دی کہ دوسرے روز ایک آنہ نہ دیا۔ بولا 'جب تک میری ساری باتیں نہیں مانو گے آنہ نہیں ملے گا' ـــ لیکن میں نے اس کی باتیں ماننے سے انکار کر دیا....

"اگلی رات میں گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ ماسٹر نے مجھے جگا دیا۔ ہم دونوں ایک کمرے میں سویا کرتے تھے۔

اُس نے مجھے دوسرے کمرے میں سونے کو کہا تو میں نے کہا کہ اکیلے ڈر لگتا ہے۔ اس نے مجھے گھسیٹ گھسیٹ کر دوسرے کمرے میں دھکیل دیا اور میرا بستر وہاں لا پھینکا۔ مجھے مارا بھی اور دھمکایا بھی کہ میں چپ چاپ سو جاؤں۔ اُس نے باہر سے چٹخنی چڑھا دی....

"میں رونے لگا۔ کچھ دیر بعد ماسٹر کے کمرے میں کسی عورت کے ہنس ہنس کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میری نیند اچاٹ ہو چکی تھی....

"گھنٹہ دو گھنٹہ بعد ماسٹر نے دروازہ کھولا اور مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ دیکھا وہ اکیلا تھا۔ عورت جا چکی تھی۔ وہ بغیر بیوی کے رہتا تھا۔ میری عمر بارہ تیرہ برس کی تھی۔ اُس نے مجھ سے الٹی سیدھی باتیں شروع کر دیں اور ایسا مطالبہ کر بیٹھا جو میں جان کے بدلے بھی پورا کرنے کو تیار نہ تھا۔ اُس نے پیسوں کا لالچ دیا۔ سینما دکھانے کا وعدہ کیا۔ آخر مار کٹائی پہ اتر آیا اور اس نے ایک رات مجھے بہت پیٹا....

"ایک آنہ ملنا تو بند ہو ہی چکا تھا۔ اب وہ مجھے ذرا ذرا سی بات پر مارنے پیٹنے لگا۔ بغاوت کی جو چنگاریاں دب گئی تھیں پھر سلگ اٹھیں۔ میں نے اُس کے ہاں بھی چوری کی اور آوارہ لڑکوں کی منڈلی میں جا بیٹھا.... ایک روز ماسٹر نے چوری کرتے پکڑ لیا اور لگا پیٹنے۔ میں نے چیخ چیخ کر کہا کہ یہ میرے اپنے پیسے ہیں جو

تم ہمارے کرائے کے وصول کرتے ہو اور مجھے نہیں دیتے۔ اس کے پاس اس کا ایک ہی جواب تھا ـــــ تھپڑ، گھونسے اور لاتیں۔ اُس رات اُس نے مجھے بھوکا رکھا۔ اس کا انتقام میں نے اس طرح لیا کہ اس کا نیا کمبل چرا کے کباڑی کے ہاں چھ روپے پر بیچ دیا اور سب دوستوں کو پکچر دکھائی....

"ماسٹر نے مجھے غیر انسانی اذیتیں دے دے کر اقبال جرم کرانا چاہا لیکن میرا جسم سخت ہو چکا تھا اور پیار سے محروم دل ایسا پتھر بن گیا تھا کہ اذیت، تشدد اور ظلم سے یہ اور زیادہ مضبوط ہوتا جا رہا تھا....

"ایک روز چچا ماسٹر کے ہاں آیا اور بتایا کہ میرا باپ ناگپور میں مر گیا ہے۔ میرے لیے دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ اب امید کی ذرا سی جو کرن تھی وہ بھی مٹی میں مل گئی۔ چچا نے مجھے اپنے ہاں چلنے کو کہا تو میں نے انکار کر دیا۔ دونوں نے بہت اصرار کیا لیکن میں نہ گیا۔ دوسرے روز ماسٹر نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ میں تو خود بھی اب اس گھر میں رہنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اپنے مکان کے کرائے کا آسرا تھا۔ سوچا کرایہ داروں سے پانچ دس روپے کم کرایہ لے لیا کروں گا اور وہیں ایک کمرے میں جا رہوں گا....

"ماسٹر کے گھر کو آخری سلام کر کے میں کرایہ داروں کے ہاں گیا تو وہاں تالا لگا دیکھا۔ معلوم ہوا کہ وہ دو ماہ کی چھٹی پر کہیں باہر گئے ہوئے ہیں.... اور میں بمبئی شہر کی گلیوں، فٹ پاتھوں، سڑکوں اور باغوں میں مارا مارا پھرنے لگا۔ ایک رات ریلوے سٹیشن کے مسافر خانے میں سویا۔ اگلی رات قبرستان میں ماں کی قبر کے پاس سویا اور اس سے اگلا دن میرے لیے قیامت کا دن تھا۔ یہ فاقے کا تیسرا روز تھا۔ پاس پلّے پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ بھیک مانگی نہ گئی۔ جی میں آئی کسی گھر یا ہوٹل میں نوکری کر لوں لیکن ماں کا اکلوتا اور لاڈلا بچہ کسی کے جھوٹے برتن مانجھنے پر آمادہ نہ ہوا....

"میں نے بازار کا رخ کیا۔ اُس وقت مجھے ماں یاد آئی نہ باپ نہ یہ خواہش کہ کوئی مجھے پیار سے بیٹا کہے۔ بس ایک ہی خواہش تھی کہ کوئی روٹی کا ٹکڑا پھینک دے اور میں اٹھا کے کھا لوں۔ ٹانگیں لرزنے لگیں۔ سر ڈول گیا۔ آنکھوں کے سامنے دھند چھانے لگی اور اس دھند میں مجھے روٹی کباب والے کے ریڑھے کے نیچے کیچڑ میں پڑا روٹی کا ایک ٹکڑا دکھائی دیا اور میں اس ٹکڑے پر جا گرا۔ پیشتر اس کے کہ میں اس سے کیچڑ صاف کرتا ٹکڑا میرے پیٹ میں پہنچ چکا تھا۔ اس ایک لقمے نے بھوک کی آگ کو اور زیادہ بھڑکا دیا....

"تھوڑی ہی دور آگے کسی حکیم یا مداری نے مجمع لگا رکھا تھا۔ میں نے ایک آدمی کی پتلون کی جیب میں پانچ روپے کے نوٹ کا کونہ دیکھا۔ دوسرے لمحے میرا ہاتھ اُس کی جیب میں تھا اور اسی لمحے اُس کا ہاتھ میری کلائی پر تھا۔ میں چیخنے چلّانے لگا ـــ "بھوکا مر رہا ہوں، مت مارنا مجھے، تین روز سے بھوکا ہوں" ـــ میں اپنے حشر سے آگاہ تھا۔ تھپڑوں اور گھونسوں سے بچنے کے لیے دوسرا ہاتھ چہرے پر لپیٹ لیا لیکن اُس نے مجھے نہ تھپڑ مارا نہ گھونسا۔ وہ مجھے مجمع سے ایک طرف لے گیا۔ میں روتے اور چلّاتے جا رہا تھا۔ اُس نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ رکھا، چپ ہو جانے کو کہا اور پانچ کا نوٹ نکال کے میرے ہاتھ میں دے دیا۔ بولا ـــ "ڈرو نہیں.... یہ نوٹ اپنے پاس رکھ لو۔ بھوک لگی ہے؟" ـــ میں نے کہا بہت بھوک لگی ہے....

"وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ عجیب ویران سا گھر تھا اُس کا۔ جہاں جاتے ہی میرا دل ڈوبنے لگے۔ اپنی عمر اور کسمپرسی دیکھتے ہوتے دل میں طرح طرح کے خدشے آتے۔ اس کے گھر کا ماحول گھریلو تھا ہی نہیں۔ وہ مجھے کمرے میں بٹھا کر باہر گیا اور لوٹ آیا اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک لڑکا روٹیاں، سالن اور کھیر کی پلیٹ لیے

کمرے میں آیا جسے دیکھ کر میں سب خوف بھول گیا اور میں روٹی پر ٹوٹ پڑا۔ روٹی کھا چکا تو اُس نے دودھ پلایا۔ وہ رہ رہ کے میرے سر پر ہاتھ رکھتا تھا اور باپ کی طرح پچکار پچکار کر باتیں کرتا تھا....

"اُس نے مجھ سے پوچھا میں کون ہوں تو میں نے ماں کے مرنے سے لے کر اُس کی جیب میں ہاتھ ڈالنے تک کی روئیداد سنا ڈالی۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوتے کہا ـــ "مجھے اپنا باپ سمجھو اور اس گھر کو اپنا گھر سمجھو"....

"مجھے اونگھ آئی تو اُس نے مجھے لیٹ جانے کو کہا۔ دن کا پچھلا پہر تھا۔ میں لیٹا اور سو گیا اور دوسرے دن دوپہر کو آنکھ کھلی۔ وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ میں جاگا تو اُس نے مجھے پھر کھانا کھلایا اور کہا ـــ "دیکھ بچو! کسی کی جیب سے یوں نوٹ نہیں نکالا کرتے، آ میں تجھے بتاؤں"....

"اور اُس نے مجھے جیب تراشی کا پہلا سبق دیا۔ دو ہی چار روز بعد مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ بمبئی کا ماسٹر گرہ کٹ ہے، استاد غنڈہ، جس کا گروہ ساری بمبئی میں پھیلا ہوا تھا۔ شہر کے تمام جیب کترے، اٹھائی گیرے اور رنڈیاں اُس کی مرید تھیں"

جیدا اپنے ماضی کی داستان سنا رہا تھا۔ اُس کے لب و لہجے میں خونخواری نہیں تھی، انداز میں مُجرمانہ ذہنیت کی ہلکی سی بھی جھلک نہیں تھی۔ کوئی اجنبی اُسے دیکھتا تو یہی کہتا کہ کمزور اور بے بس سا یہ آدمی ستم رسیدہ ہے اور ابھی دھاڑیں مار کر رو پڑے گا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں لال سرخ ہوتی جا رہی تھیں کبھی اُس کی زبان سے الفاظ کی بجائے آہ نکل جاتی تھی۔

بوڑھا موسیقار بے خود بیٹھا جیدا کی داستان میں جیسے تحلیل ہو گیا تھا۔

جیدا کہہ رہا تھا ـــ "بمبئی کے اُس استاد نے مجھے جیب تراشی کے تمام داؤ پیچ سکھا کر اپنے وہ میں شامل کر لیا، پھر مجھے تالے توڑنے اور رہزنی میں ماہر بنا دیا۔ اُس نے مجھے پیٹا بھی، پیار بھی کیا لیکن اب میں پٹائی کی اذیّت اور پیار کی لذّت سے بہت دور نکل آیا تھا۔ میں تھوڑے ہی عرصے میں اُس کا صحیح جانشین ثابت ہُوا.....

"بابا! تم یہ سن کر شاید حیران ہو گے کہ میں اس پیشے میں لکھنے پڑھنے کو نہ بھول سکا۔ میں نے اچھی اچھی کتابیں پڑھ ڈالی ہیں۔ میں ایک ڈائری بھی لکھتا ہوں۔ دل میں غبار سا ہے جسے سُننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ میں یہ غبار ڈائری میں اُگل دیا کرتا ہوں۔ چند فقرے لکھ کے یوں تسکین ہو جاتی ہے جیسے میں نے کسی کو حالِ دل سنا دیا ہو.....

"جب ہندوستان تقسیم ہُوا تو میں کراچی آ گیا اور اپنا گروہ بنا لیا جس کا میں اب سردار ہوں۔ ساری کراچی میں جال بچھا رکھا ہے۔ اس جال سے کوئی محفوظ نہیں۔ پولیس، قانون، حاکم، وزیر سبھی میرے جال میں اُلجھے ہُوتے ہیں" ـــ وہ چپ ہو گیا پھر بولا ـــ "مگر اب میں خود ایک جال میں اُلجھتا جا رہا ہُوں"۔

"وہ کیسے؟"

"میرے پاس ایک لڑکی ہے جسے میں نے خریدا تھا"۔

"خریدا تھا؟" ـــ بوڑھے موسیقار نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ہاں!" ـــ جیدا نے کہا ـــ "ہر رات بیچنے کے لیے لیکن اب تک اُسے بیچا نہیں۔ میں نے اسے خرید کر گھر رکھ لیا تھا لیکن اُس نے آہستہ آہستہ مجھے خرید لیا ہے۔ اس نے مجھے اپنی ذات میں اس طرح اُلجھا لیا ہے کہ میں اُس کے سامنے اپنے تمام داؤ پیچ بھول جاتا ہوں اور ایک بچہ ہے جسے شاید کبھی کا کوڑے کرکٹ کا کوئی ڈھیر نگل چکا ہوتا لیکن میں نے اسے زندگی دی ہے۔ اب یہ بچہ مجھ میں ایک نئی زندگی پیدا کرتا جا رہا ہے"۔

"بچہ کس کا ہے؟" ـــ بوڑھے نے پوچھا ـــ "اسی لڑکی کا؟"

"نہیں!" ـــ جیدا بولا ـــ "یہ ایک اور داستان ہے۔ وہ ایک بن بیاہی ماں کا بچّہ ہے۔ اس لڑکی اور بچّے نے مجھ میں ایسی ہلچل مچا دی ہے جس سے میں کوسوں دور بھاگتا رہا۔ اس ہلچل میں ایک لطف سا محسوس کرتا ہوں۔ وہ دونوں جب رات میرے پاس بیٹھتے ہیں اور کھیلتے ہیں، تو میرے تصوّروں میں ایسی یادیں ابھر آتی ہیں جو میں سمجھتا تھا کہ مر چکی ہے مگر آج لپک لپک کر ان یادوں کو اور گتی گزری باتوں

کو پکڑ لینا چاہتا ہُوں۔ میں لڑکی اور اس بچے سے بھاگ جانا چاہتا ہُوں لیکن ان کی معصُوم مسکراہٹوں نے مجھے گرفتار سا کر لیا ہے۔ میں اپنے آپ میں قید ہو گیا ہُوں"..... جیدا جیسے چونک اُٹھا ہو۔ بولا ـــ "میں چلتا ہوں بابا! ناز انتظار کر رہی ہو گی"۔

ناز کون؟

"اس لڑکی کا نام ناز ہے" ـــ جیدا نے کہا ـــ "جاتا ہوں بابا! رات بہت گزر گئی ہے"۔

"عمر تو نہیں گزری" ـــ بوڑھے نے مُسکرا کر کہا ـــ "بیٹھو۔ خوب باتیں کرو..... اور دیکھو بیٹا! ہر روز میرے پاس آیا کرو۔ تم میرے سب سے پیارے بچے ہو۔ ان دو معصوم ہستیوں میں گھل مل جاؤ۔ اپنے بابا کو اپنا بنا لو۔ تم آؤ بیٹا! میرے سینے سے لگ جاؤ۔ اپنے دکھ مُجھے دے دو"۔

جیدا کے آنسو نہ نکلے۔

"تم نے کبھی مسکراتے ہُوتے آنسو دیکھے ہیں؟" ـــ جیدا نے ہتھیلیوں سے آنکھیں پونچھ کر کہا ـــ "کبھی روتی ہُوئی مسکراہٹیں دیکھی ہیں؟..... نہیں دیکھیں تو مجھے دیکھ لو۔ میرے آنسو اُس وقت مسکراتے ہیں جب میں کسی کا گھر لوٹ لیتا ہوں، کسی کی جیب کاٹ لیتا ہوں اور جب میرے چاقو کے زخم سے کسی کا خون بہتا ہے..... اور جب تم سا کوئی پیارا انسان اس ستار کی طرح میرے جذبات کا ساز چھیڑ دیتا ہے تو میری مسکراہٹیں روتی ہیں۔ میں خدا کا شکر ادا کیا کرتا ہوں کہ بچپن میں جب میں بمبئی کی سڑکوں پر بھوکا پھر رہا تھا تو مجھے جرائم کی دنیا کے ایک استاد نے سنبھال لیا، اور شکر اس بات کا زیادہ ادا کرتا ہُوں کہ مجھے کوئی ان شہریوں سے نہ مل گیا جو چوروں کو چور اور اپنے آپ کو شریف شہری کہا کرتے ہیں"۔

"تم عجیب انسان ہو" ـــ بوڑھے موسیقار نے ہنستے ہُوتے کہا ـــ "میں نے تم جیسا انسان کبھی نہیں دیکھا"۔

"میں نے اپنے جیسا انسان خود بھی کبھی نہیں دیکھا..... میں تو اچھا بھلا تھا بابا مگر جب سے ناز کو اپنے ساتھ رکھا ہے اور پھر یہ بچہ آ گیا ہے تو میری حالت یہ ہو گئی ہے جیسے اپنے آپ کے لیے اجنبی ہو گیا ہوں۔ اپنے آپ کو پہچاننا مشکل ہو گیا ہے... میں کون ہوں؟ میں کیا تھا؟ اب کیا ہوں؟ کہاں سے چلا تھا میں؟ کدھر جا رہا ہوں؟ میری منزل کہاں ہے؟"

بوڑھے موسیقار نے دھیما سا قہقہہ لگایا اور کہا ـــ "پتھر پیار کو نہیں توڑ سکتا، پیار پتھر کو توڑ دیتا ہے، پتھروں کے آنسو نکال دیتا ہے"۔

جیدا جانے کے لیے اٹھا اور آہ بھر کر کمرے سے نکل گیا۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہر سُو خاموشی تھی۔ کوارٹروں اور جھونپڑیوں کی وسیع بستی پر موت کا سکوت طاری تھا مگر جیدا کے سینے میں ہنگامے بپا ہو رہے تھے جنہیں بوڑھے موسیقار کی پیار بھری آواز کی گونج تھپکیاں دے دے کر سُلا رہی تھی۔

جیدا آج رات اس طرح چل رہا تھا جس طرح چور اُچکے نہیں چلا کرتے، چل ہی نہیں سکتے۔ اس کا ضمیر جیسے بوجھ پھینک کے ہلکا پھلکا ہو گیا تھا، مگر جیدا اپنے ساتھ ساتھ ایک سائے کو چلتا محسوس کر رہا تھا۔ یہ سایہ کسی چور اچکے کا تھا اور اس کے خطوط جیدا سے ملتے جلتے تھے۔

جیدا نے بوڑھے موسیقار کو کہانی سنا تو دی لیکن اُس کی حالت اُس جنگجو کی سی ہو گئی جس کی تلوار میدانِ جنگ میں گر پڑی ہو یا اُس ناگ کی سی جو زہر کہیں اُگل آیا ہو۔

اُس کے سینے کا الاؤ بجھ کے رہ گیا اور اس کی زندگی میں انقلاب رونما ہونے لگا۔ اپنے آپ سے اُلجھ اُلجھ کر وہ تھک چکا تھا۔ اب اُس نے اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیا۔ داخلی دنیا میں جو طغیانی آگئی تھی، اُس نے اپنا آپ اسی کے بہاؤ میں ڈال دیا۔

دن گزرتے چلے جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے وہ راتیں بھی گزرتی گئیں جو جیدا کو کبھی شراب میں بدمست، کبھی ڈکیتی کی واردات کرتے اور کبھی کسی طوائف کے ہاں دیکھا کرتی تھیں مگر جیدا کی کیفیت ایسی ہو رہی تھی جیسے شب و روز اُس کے اوپر سے ریل گاڑی کی طرح گزر رہے ہوں اور اُس کا انگ انگ کٹ رہا ہو۔

اُس کے شاگردوں نے کتنی بار دیکھا کہ شام جب جیب کتروں اور جوا چکوں کا باہر نکلنے کا وقت ہوتا ہے، جیدا پلنگ پر لیٹا ہوا ہے اور بچہ اُس کے پیٹ پر کھیل رہا ہے یا وہ فٹ پاتھ پر چلا جا رہا ہے، لوگوں کو بٹوؤں میں نوٹ ڈالتے دیکھا بھی ہے مگر ہاتھ میں کوئی کھلونا اٹھائے چلا ہی جا رہا ہے لیکن شاگردوں نے یہ نہ دیکھا کہ رات کو وہ بعض اوقات گھر سے غائب ہوتا ہے تو جاتا کہاں ہے۔ وہ نہ تو کسی طوائف کے ہاں ہوتا تھا نہ کسی اڈے پر نہ کسی شکار کی کھوج میں۔ وہ اپنے بابا موسیقار کے پاس بیٹھا ہوتا تھا۔

اُس کا گروہ کراچی کے لیے بدستور خوف و ہراس بنا ہوا تھا۔ شہر میں جرائم کی رفتار پہلے سے زیادہ تیز ہو رہی تھی۔ جیدا کے چھوکرے اپنے کاروبار میں پہلے سے زیادہ مصروف تھے لیکن جیدا ان کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ان سے الگ تھلگ سا رہنے لگا تھا۔

اس کے ساتھیوں نے آغاز کے چند روز اس کی خاموشی اور بدلے بدلے سے رویّے کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ سوچا شاید استاد تھک گیا ہے۔ جب اس کی لاتعلقی بڑھنے لگی تو مُنّا اور ٹیپو متفکر ہوتے اور اسے راہ پر لانے کی کوشش کرنے لگے۔ ایک روز جیدا صحن میں ٹہل رہا تھا کہ مُنّا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"استاد!"— منّے نے کہا — "مہینے گزر گئے ہیں تم گھر بیٹھے ہو مانا کہ محبّت ہو گئی ہے لیکن ...."

جیدا نے اُسے آگے بولنے نہ دیا۔ اس کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور مُنّا دبک کے رہ گیا۔

پھر ایک روز جیدا ڈائری کھولے بیٹھا تھا۔ ٹیپو کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ دونوں کے درمیان بہت سی باتیں ہو چکی تھیں۔ دونوں اکتا چکے تھے۔

"میرا مطلب یہ نہیں"— ٹیپو تھک ہار کر صلح جُو قسم کی بات پر آیا "تم یوں بیٹھ جاؤ گے تو ہم تمھارا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ ہم نے تمھارا نمک کھایا ہے اُستاد! تم ہمارے پیر و مرشد ہو لیکن بعض جگہوں پر تمھارا ساتھ ہونا ضروری ہوتا ہے۔"

"ابّن کے گھر کا کیا حال ہے؟"— جیدا نے ٹیپو کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے پوچھا — "انہیں پیسوں کی ضرورت تو نہیں؟"

"وہاں سب ٹھیک ہے"— ٹیپو نے سٹپٹا کر کہا — "وہ میری ذمہ داری ہے۔"

ایک دن جیدا کمرے میں لیٹا ہوا تھا کہ ایک نو عمر لڑکا آیا۔

"اُستاد بیس ہزار کا ہار چاہیئے تو آج موقعہ ہے.... رستہ صاف ہے اور...."

"نہیں چاہیئے!"— جیدا نے غصّے سے کہا اور کروٹ بدل لی — "جاؤ.... اور سنو.... اپنا کوئی آدمی گرفتار تو نہیں ہوا؟"

"نہیں اُستاد!"

اور ایک دن مُنّا اُسے کہہ رہا تھا کہ ایک لیڈر کا پیغام آیا ہے۔ کل کسی دوسری پارٹی کے جلسے کا پروگرام ہے۔

"تم اور ٹیپو سمجھ لو"— جیدا نے کہا — "اُس کا کام میرے بغیر کر دو.... تم بچّے تو نہیں ہو.... اور سنو منّے! اپنا کوئی چھوکرا گرفتار تو نہیں ہوا؟"

"نہیں اُستاد! دو لونڈے چھ چھ ماہ کاٹ کے پرسوں رہا ہوتے ہیں۔"

ایک دن ٹیپو جیدا کے پاس آ بیٹھا۔

"اُستاد! سولجر بازار میں ایک دُکان ہے۔"

"کیا ہے؟"

"ریڈی میڈ کپڑے۔ دو سو تیار بوشرٹیں اور ہیملٹن کے بہت سارے تھان ہیں کچھ اور مال بھی ہے۔ رات تالا توڑنا پڑے گا۔"

"تین چھوکرے کافی ہیں"— جیدا نے بے نیازی سے کہا — "ٹیکسی لے لینا اور تم خود ساتھ جانا۔"

دارالحکومت میں سیاسی شعبدہ بازیاں عروج پر تھیں۔ لیڈروں کو جیدا، مُنّے، ٹیپو، بشیرے اور گلّو بدمعاش اور ان کے گروہوں کی شدید ضرورت تھی۔ یہ تمام لوگ بوقتِ ضرورت حاضر ہو جاتے تھے مگر اب ان میں جیدا نہیں ہوتا تھا۔ وزیروں اور اٹھائی گیروں کے تعلقات بہت گہرے ہو گئے تھے مگر جیدا منظر سے غائب تھا۔ کوئی تلاش کرتا تو وہ ناز اور بچّے کے پاس بیٹھا ملتا یا جیکب لائن کے کوارٹروں میں موسیقار کے پاس!

لیکن جیدا اپنے گروہ کی کارگزاریوں سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ صرف عملی طور پر الگ تھلگ نظر آتا تھا، کمان اُسی کے ہاتھ میں تھی۔ اسے حکومت کی شب و روز بدلتی پالیسیوں اور غیر یقینی سیاسی حالات کا مکمل علم تھا۔ وہ صرف فرنٹ لائن سے ہٹ آیا تھا۔ ہدایات اسی کی چل رہی تھیں۔ رات کو وہ منّے اور ٹیپو یا کسی اور ساتھی کو بلا کر تمام سرگرمیوں کا حال سُن کر اور ضروری ہدایات دے کر سوتا تھا۔

مُنّا اور ٹیپو مطمئن نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ استاد ان کے ساتھ رہے۔ البتّہ ناز مطمئن تھی۔ وہ صرف ایک کمی محسوس کر رہی تھی جس کا اس نے ایک دن اظہار کر ہی دیا۔

"جیدا! آؤ۔ اب ہم ایک ہو جائیں"— ناز نے تشنہ سے لہجے میں کہا — "اب تو ہم میں دُوری نہیں رہنی چاہیئے۔ کیوں نہ شادی کر لیں۔"

جیدا نے اُس کی طرف دیکھا مگر چپ رہا۔

نازنے جیدا کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ جیدا نے یوں تسکین محسوس کی جیسے ناز نے آنکھوں کے راستے اُس کی تیس برس کی بے چینیاں چوس لی ہوں — بڑے دروازے پر کسی کی دستک نے طلسم توڑ دیا۔ ناز نے باہر جا کر دروازہ کھولا۔ ایک لڑکا آیا تھا۔

"استاد کہاں ہے؟" — لڑکے نے پوچھا۔

"وہ باہر گیا ہُوا ہے" — ناز نے بے رخی سے کہا اور پوچھا — "کیوں؟"

"اُسے شمی اور بالی نے بلایا ہے کہتی تھیں آج رات . . . ."

"انہیں کہنا استاد کی طبیعت ٹھیک نہیں" — ناز نے تحکمانہ لہجے میں کہا — "نہیں آسکے گا"

دوسرے روز منا اور ٹیپو اپنے کمرے میں جیدا کو ایک ڈکیتی کے لیے کہہ رہے تھے اور وہ انہیں ٹال رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ دونوں چلے جائیں لیکن وہ دونوں ٹل نہیں رہے تھے۔

"اُستاد! تم آخر استاد ہو" — ٹیپو نے کہا — "آج تم نے ساتھ نہ دیا تو ساٹھ ہزار روپیہ ہاتھ سے نکل جائے گا"

"ہوسکتا ہے کچھ زیادہ ہی ہاتھ آجائے" — منّے نے کہا۔

"کم از کم تین سونے کے ہار ہیں" — ٹیپو بولا۔

جیدا خاموش کھڑا سنتا رہا۔

"ایک پستول اور ایک بندوق بھی ہے" — مُنّے نے اضافہ کیا۔

"نہیں!" — جیدا نے آہستگی سے کہا — "میں ساتھ نہ دے سکوں گا تم چلے جاؤ"

ٹیپو اور منا جھلّا گئے۔

"کیوں اُستاد!" — مُنّے نے قہر آلود لہجے میں کہا — "ہو چکی داداگیری؟"

"عورت کی دوستی شیر کو گیدڑ بنا دیتی ہے" — ٹیپو نے کہا۔

"عورت کا غلام" — مُنّے نے طنزیہ کہا — "زن مرید!"

"تم نے کہا تھا میں اپنی دنیا کا خدا ہوں"

"تم نے انسانوں کا خون پانی کی طرح بہایا ہے"

جیدا خاموش کھڑا سُن رہا تھا جیسے سنگسار کیا جا رہا ہو۔ چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ مُنّا اور ٹیپو شعلے اُگل رہے تھے۔

"آج خود ہی تھک گئے!"

"جی میں آتا ہے تیری ناز کی تکّا بوٹی کر دیں"

"اس حرامی بچے کا گلا گھونٹ دیں"

"تم نے عورتوں کو بازاروں میں بیچا ہے"

"ان دونوں نے تمھیں کہیں کا نہیں چھوڑا"

"یہ گھر گرہستیاں اپنا کھیل نہیں"

جیدا جو کراچی کا بھوت اور گناہوں کی دنیا کا دیوتا تھا۔ منّے اور ٹیپو کے درمیان بے بس کھڑا تھا۔

ان دونوں کی لعن طعن زہر میں بجھے ہوئے تیر بن کر اُس کے سینے میں اُترتی جا رہی تھی۔

"جیدے اُستاد!" — مُنّے نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جھنجھوڑا اور کہا — "کبھی تم نے سوچا ہے کہ تم ہو کیا؟ تم جن بھوت تو نہیں۔ تمھاری طاقت ہم ہیں۔ کہو تو کل سلطانی گواہ بن کر تمھیں پھانسی کے تختے پر کھڑا کرا دیں"

"اُستاد ہو ہمارے اس لیے وفادار ہیں" — ٹیپو نے کہا — "اِس لڑکی کو چلتا کرو۔ نہیں کرو گے تو اِسے ڈھونڈتے پھرو گے"

جیدا یوں چونکا جیسے کسی نے بجلی کے ننگے تار اُس کے جسم سے لگا دیے ہوں۔ اُس نے کرتے کے اندر ہاتھ ڈالا اور بڑی تیزی سے ناف سے خنجر نکال لیا۔ وہ ٹیپو کی طرف بڑھا۔ ٹیپو نے چاقو نکال لیا۔ دونوں کے چہروں پر قہر اتر آیا تھا۔ مُنّا ان کے درمیان آگیا۔

"ایک عورت کی خاطر" — مُنّے نے دھیمی سی آواز میں کہا — "شاگرد اُستاد کے مقابلے میں اُتر آیا ہے . . . . ہوش میں آ استاد! کہو تو ایسی دس لڑکیاں تمھیں لا دیں"

جیدا کا چہرہ لال ہو گیا تھا اور وہ خاموشی سے ٹیپو کو گھور رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ" — منّے نے دونوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں بٹھا دیا اور سگریٹ نکال کر اُس میں چرس ڈالنے کے لیے تمباکو نکالنے لگا۔ اُس نے کہا — "کیا ہمیں ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہونا ہے؟"

جیدا نے خنجر ناف میں اڑس لیا اور باہر کو چل پڑا۔ منّے نے اس کا ٹخنہ پکڑ لیا۔

"ارے جانے دو اسے!" — ٹیپو نے غصے اور مایوسی کے ملے جُلے لہجے میں مُنّے سے کہا — "دیکھ لی اس کی مردانگی۔ سالا دو پیسے کی چھوکری کے لیے جگری یاروں کو خنجر دکھا رہا ہے"

جیدا رک گیا۔ اُس نے اپنے دونوں جگری یاروں کو ایسی عجیب سی نظروں سے دیکھا جیسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نہ جانے وہ کیا کرتا یا کیا کہتا، صحن میں کسی کے دوڑتے قدموں کی آہٹ سنائی دی جو کمرے میں آگئی۔ جیدا کے گروہ کا ایک نوعمر لڑکا تھا۔

"اُستاد!" — لڑکے نے ہانپتی کانپتی آواز میں کہا — "جلدی نکلو۔ اللہ قسم، مزہ آجائے گا"

"کیا ہے؟" — جیدا نے پوچھا۔

"آج سینکڑوں جیبیں کاٹ لو اُستاد!" — لڑکے نے لڑکوں کی سی شوخی سے کہا — "سارا شہر لوطری بازار میں جمع ہو گیا ہے"

"سیدھی بکو اس کر بات کیا ہے؟" — ٹیپو نے لڑکے کو ڈانٹ کر کہا۔

"لوطری بازار کو آگ لگی ہوئی ہے" — لڑکے نے کہا — "دکانیں جل رہی ہیں۔ بازار خالی ہو رہا ہے۔ ہزاروں لوگوں کا ہجوم تماشہ دیکھ رہا ہے۔ کسی کو اپنا ہوش نہیں۔ دکانوں سے دکاندار مال باہر پھینک رہے ہیں"

"اور اُستاد! وہاں جیولری کی دکانیں بھی ہیں" — منّے نے جیدا سے کہا — "دماغ ٹھکانے کرو اُستاد! . . . . اٹھو ٹیپو!"

"چلو استاد!" ــــ ٹیپو نے جیدا کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

جیدا نے سر کو جھٹکا دیا اور بے جان سی آواز میں کہا ــــ "میں چلوں گا۔"

تینوں باہر نکل گئے۔ لڑکا ان کے پیچھے دوڑ پڑا۔

بوٹری بازار کراچی کا ایک مشہور بازار ہے۔ آج یہ ویسا نہیں جیسا ہوا کرتا تھا۔ یہ تین تین چار چار منزلہ عمارتوں کا جھرمٹ تھا۔ نیچے دکانیں اور اوپر رہائشی فلیٹ تھے۔ عمارتوں کے درمیان گلیاں بھول بھلیاں کی طرح تھیں۔ ہر گلی مارکیٹ تھی۔ ہر قسم کی دکانیں تھیں۔ کپڑوں کی، جوتوں کی، جیولری کی اور یہاں جنرل سٹور بھی تھے۔ ان گلیوں میں ہر چیز مل جاتی تھی۔ صرف چلنے کا راستہ نہیں ملتا تھا۔ رات کو یہ دکانیں دن کا منظر پیش کرتی تھیں۔ یہ کراچی کا مشہور شاپنگ سنٹر تھا۔

بوٹری بازار کی رونق میں آج اضافہ ہو گیا ہے اور یہ شاپنگ سنٹر زیادہ خوبصورت ہو گیا ہے۔ تمام عمارتیں سیمنٹ اور سریے سے تعمیر ہوئی ہیں۔ اس سے پہلے عمارتیں کراچی کی پرانی عمارتوں کی طرح اینٹوں اور پتھروں سے بنی تھیں چھتیں لکڑی کی تھیں۔ ان میں اینٹیں اور پتھر اتنے نہیں تھے جتنی لکڑی استعمال ہوتی تھی۔ بعض فلیٹوں کے فرش بھی لکڑی کے تھے۔

۱۹۵۷ء کے آخر میں کراچی کے اس بارونق اور وسیع علاقے کو جو بوٹری بازار کہلاتا ہے، آگ لگ گئی۔ آگ اس طرح لگی کہ فٹ پاتھ پر آتش بازی والے نے اپنا آتش گیر سامان پھیلا رکھا تھا۔ کراچی کے فٹ پاتھ بھی بازار ہی ہوتے ہیں۔ پولیس اور کارپوریشن کی "کرم نوازی" سے فٹ پاتھ کے دونوں طرف زمین پر کپڑا بچھا کر دکانیں لگی ہوتی ہیں اور ان کے درمیان ڈیڑھ ایک فٹ راستہ لوگوں کے لیے رہ جاتا ہے۔ بوٹری بازار کے پہلو سے گزرتی ہوئی ایک چوڑی سڑک کے فٹ پاتھ پر ایسا ہی بازار لگا رہتا تھا۔ ان میں ایک آتش باز بھی تھا جس نے ہوائیاں اور پٹاخے زمین پر پھیلا رکھے تھے۔

کسی نے گزرتے گزرتے سگریٹ کا جلتا ہوا آخری سرا بے احتیاطی سے پھینکا اور بھیڑ میں بہتا آگے نکل گیا۔ جلتا سگریٹ ہوائیوں کی بتیوں سے جا لگا۔ بتیوں نے آگ پکڑ لی اور تین چار ہوائیاں جن کے منہ بوٹری بازار کی بڑی دکانوں کی طرف تھے جل کر اڑیں اور ایک ایسی دکان کے اندر چلی گئیں جس میں طرح طرح کے کیمیکل پڑے تھے۔ ہوائیاں آتش گیر کیمیکل میں جا پھٹیں۔ کیمیکل کا مرتبان بم کی طرح پھٹا اور آناً فاناً دکان آتش فشاں بن گئی۔

ہمارے ہاں چونکہ ایسے ہنگامی حالات سے نمٹنے کی کوئی ٹریننگ نہیں ہوتی اس لیے لوگوں میں بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ بوٹری بازار میں بھی ایسے ہی ہوا۔ لوگ جدھر کو منہ آیا ایک دوسرے کو روندتے کچلتے بھاگ اٹھے۔ آگ پھیل گئی چھتیں لکڑی کی تھیں چھتیں جلنے لگیں۔ دکانوں کے درمیان سے اوپر فلیٹوں کو جاتی سیڑھیاں لکڑی کی تھیں۔ اس صدیوں پرانی خشک لکڑی نے فوراً آگ پکڑ لی۔

آگ دوسری دکانوں میں داخل ہو گئی۔ کسی مکان کو لگی ہوئی آگ کے شعلوں کی آواز بڑی خوفناک ہوا کرتی ہے۔ یہ شعلے دہشت طاری کر دیتے ہیں۔ لوگ سوائے بھاگنے کے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ بوٹری بازار کی آگ میں یوں ہوا کہ لوگ دور کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اس ہجوم میں اضافہ ہو رہا تھا اور اس ہجوم نے

وہ سڑکیں روک دی تھیں جدھر سے فائر بریگیڈ کو آنا تھا۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں آئیں تو انہیں ہجوم آگے بڑھنے کا راستہ نہیں دے رہا تھا۔ آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔

جب جیدا، منّا اور ٹیپو وہاں پہنچے، اُس وقت آگ ساتھ والی عمارتوں کو لپیٹ میں لے چکی تھی۔ ان کی دکانیں جل چکی تھیں اور ان کے اوپر فلیٹ جل رہے تھے۔ ہوا بہت تیز چل رہی تھی۔ شعلے انسانوں کی متاع اور جانوں کو بیدردی سے چاٹتے ہوتے ہر طرف پھیل رہے تھے۔ صرف ایک فائر انجن ان شعلوں سے نبرد آزما تھا۔

ایک فائر انجن بیکار کھڑا تھا۔ شہروں میں کئی جگہوں پر زمین کے نیچے فائر ہائیڈرینٹ ہوتے ہیں۔ یہ ایک کم و بیش تین انچ کھلا نل ہوتا ہے جس کے اوپر چوڑی دار ڈھکنا ہوتا ہے اور اس کے اوپر سطح زمین کے ساتھ ایک بڑا ڈھکنا چڑھا ہوتا ہے۔ فائر بریگیڈ والوں کو ان سے واقفیت ہوتی ہے۔ ان کے پاس ایک بڑی سی چابی ہوتی ہے۔ اس سے وہ فائر ہائیڈرینٹ کھول لیتے ہیں اور اس پر اپنا پائپ چڑھا دیتے ہیں۔ اس تین انچ کھلے نل سے بہت تیز پانی آتا ہے جو فائر انجن کی ٹینکی میں جاتا ہے اور فائر انجن اسے پائپوں کے ذریعے دور اوپر پھینکتا رہتا ہے۔

فائر انجن جو بیکار کھڑا تھا، وہ اپنی ٹینکی کا پانی استعمال کر چکا تھا۔ اُس نے جو فائر ہائیڈرینٹ کھولا تھا، وہ خشک تھا۔ اس میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ یہ انجن سڑک پر کھڑا صرف ٹن ٹن کر رہا تھا۔ دو فائر انجن ہجوم کے عقب میں کھڑے ہارن بھی بجا رہے تھے اور ان کی گھنٹیاں ٹن ٹن کا واویلا بپا کیے ہوئے تھیں مگر ہجوم کو آسمان کی طرف لپکتے شعلوں نے جیسے ہپناٹائز کر رکھا تھا۔ ہجوم اپنی جگہ سے سرک نہ سکنے والی چٹان بن گیا تھا۔

اور یہ ہجوم جو تماشہ دیکھ رہا تھا وہ بڑا ہی بھیانک اور ہولناک تھا۔ ملحقہ بازار خالی ہو رہے تھے۔ آگ کی زد میں آتے ہوئے سہ منزلہ مکانوں میں رہنے والے اپنا سامان اوپر سے نیچے پھینک رہے تھے۔ یہ فلیٹ بھول بھلیوں کی مانند تھے۔ ان کے مکین گیلریوں اور سیڑھیوں کے پیچ و خم میں ہجوم کر کے پھنسے ہوئے تھے۔ عورتیں چیخ رہی تھیں، بچّے چلّا رہے تھے اور کچلے بھی جا رہے تھے۔ نیچے سے دھواں اوپر جا رہا تھا۔ بعض سیڑھیوں کو آگ لگ چکی تھی۔

بعض لوگ بالائی منزلوں کی کھڑکیوں اور بالکنیوں سے کُود آتے اور سڑک پر گر کر مر گئے۔ آگ نے ان کے نکلنے کے تمام راستے بند کر دیئے تھے۔ جل کر مرنے سے انھیں کود کر مرنا زیادہ اچھا لگا ــــ اور کراچی کا ہجوم دور کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اس ہجوم نے یہ "تماشہ" بھی دیکھا کہ ایک آدمی نے اُوپر سے چھلانگ لگائی تو راستے میں بجلی کے موٹے موٹے تاروں پر آ پڑا جن میں سے برقی رَو گزر رہی تھی۔ اس کے انجام کا تصوّر کیا جا سکتا ہے۔

وہ تو قیامت تھی۔ چھتوں، سیڑھیوں، فرشوں اور بالکنیوں کی جلتی ہوئی لکڑی رائفلوں کے دھماکوں جیسی آوازیں پیدا کر رہی تھی۔ شعلے غرّا رہے تھے۔ ان آوازوں کے ساتھ فلیٹوں سے بھاگنے والے مکینوں کی چیخ و پکار، تماشائی ہجوم کا شور اور اس میں سے راستہ بنانے کی کوشش میں فائر انجنوں کی ٹن ٹنا ٹن

اوران کے چیختے چنگھاڑتے ہُوتے ہارن ـــ یوں نظر آتا تھا جیسے سارا کراچی جل کے رہے گا۔

لوگوں کی جیبیں اُس وقت کٹتی ہیں جب وہ بسوں پر ہلّہ بولتے ہیں اور ایک دوسرے کو دھکے دیتے اور دھکے کھاتے بسوں میں اپنے آپ کو ٹھونستے ہیں، یا اُس وقت جب وہ مداری کا تماشہ دیکھنے میں محو ہوتے ہیں، یا جب کھوئی ہوئی جوانی واپس دلانے والے حکیم کے مجمعے میں کھڑے اُس کی پُرفریب باتوں سے مسحور ہو رہے ہوتے ہیں۔

بوہڑی بازار کی آگ تو ایسا تماشہ تھا کہ ہجوم میں کسی کو اپنا ہوش نہیں تھا۔ دھکم پیل ایسی جیسے پتھر ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہوں۔ یہ دھکم پیل اور ہجوم کی یہ محویّت جیب کتروں کے لیے پکے ہوتے فصل کی مانند ہوتی ہے۔ درانتی لے کے کاٹتے چلے جاؤ۔

وہاں صرف جیدا، مُنّا اور ٹیپو ہی نہیں، سارے شہر کے جیب کترے پہنچ گئے تھے اور ہاتھ کی صفائی دکھا رہے تھے۔ ٹیپو نے ایک آدمی کو دیکھا۔ وہ اپنے جلتے گھر سے دو اٹیچی کیس اٹھا لایا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک عورت اور دو بچے تھے۔ ایک اٹیچی کیس عورت نے اٹھا رکھا تھا۔ ٹیپو دوڑ کر آگے گیا اور اس آدمی سے کہا ـــ "ایک اٹیچی مجھے پکڑا دیں۔ آپ بچوں کو سنبھالیں۔ رو رہے ہیں۔"

اس بدنصیب باپ نے ٹیپو کو کوئی ہمدرد انسان سمجھ کر ایک اٹیچی اسے دے دیا۔ دو منٹ بعد اسے نہ یہ ہمدرد انسان نظر آیا نہ اپنا اٹیچی کیس۔

جیدا اپنے روپ میں آ گیا تھا ـــ جیدا جیب کترا ـــ وہ چونکہ استاد تھا اس لیے کوئی موٹی آسامی دیکھ رہا تھا۔ اسے ایک فیشن ایبل عورت چیختی چلّاتی، بھاگتی نظر آئی۔ ایک فائر بریگیڈ کے افسر کے سامنے جا کے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ وہ اُسے بازو سے پکڑ کر کھینچ رہی تھی۔ جیدا ان سے دور نہیں تھا۔ وہ اور قریب ہو گیا۔

جیدا کی تجربہ کار نگاہوں نے عورت کا جائزہ لے لیا۔ وہ زیورات پہنے ہُوتے تھی۔ جیدا نے حساب لگا لیا کہ اُس کے گلے کا ہار پونڈ پاسے کا ہے اور ایک ہزار کی مالیّت کا ہو گا۔ کانوں کے بُندے اڑھائی تین سَو کے اور تین انگوٹھیاں سو سو روپے کی۔ عورت بجائے خود بُری نہیں تھی۔ عمر پچیس کے لگ بھگ تھی اور قد بُت موزوں تھا۔ اس قیامت میں کسی عورت کا اڑا لینا مشکل نہیں تھا لیکن جیدا کی نظر زیورات پر تھی۔

عورت رو رو کر ملکان ہو رہی تھی اور وہ فائر بریگیڈ کے افسر کے گلے میں باہیں ڈالے اُسے کھینچ رہی تھی۔ افسر اُسے پرے دھکیل رہا تھا۔ جیدا ذرا اور قریب ہو گیا۔

"خدا کے لیے میرا بچّہ نکال لاؤ" ـــ عورت چیخ رہی تھی ـــ "اس سامنے والے کمرے میں سو رہا تھا۔ خدا کی راہ میں میرے بچے کو نکال لاؤ۔"

"محترمہ!..... ذرا دیکھئے تو" ـــ افسر نے کہا ـــ "بچہ اب تک....."

عورت نے لپک کر اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا ـــ "نہیں! یوں نہ کہو۔ ایک ہزار روپیہ انعام دوں گی کسی آدمی سے کہو..... میرا بچّہ زندہ ہو گا۔ آپ اُسے نکال سکتے ہیں۔"

جیدا اور قریب ہو گیا۔

ایک آدمی دوڑا آیا۔ وہ اس عورت کا خاوند تھا۔ وہ بھی رو رہا تھا۔

"نجمہ صبر کرو" ـــ اُس نے عورت کو کندھے سے تھام کر پرے لے جاتے ہوتے کہا۔ "جو ہونا تھا ہو چکا۔"

عورت پاگل ہوئی جا رہی تھی، خاوند کے گلے لگتی کبھی افسر کی طرف لپکتی مگر فائر بریگیڈ کا افسر کسی کی جان بچانے کے موڈ میں نہیں تھا نہ وہ گھبرایا ہُوا تھا نہ اُس کی حرکات میں کسی قسم کی سرگرمی یا ضروری پن تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ آگ اُس کے چار انجنوں کے بس سے نکل گئی ہے۔

"کیوں صاحب!" ـــ کسی نے اُس سے پوچھا ـــ "اور انجن نہیں آ رہے؟ اس طرح تو شہر جل جائیگا۔"

"آرمی، نیوی اور ایئر فورس کے فائر فائٹنگ سکواڈ آ رہے ہیں۔ گھبرائیے نہیں۔"

خاوند اپنی بیوی کو گھسیٹنے لگا مگر وہ عمارت کی طرف دیکھتی اور چیختی چلّاتی تھی اور اپنے بچّے کو پکارتی تھی۔

"کیا ماجرا ہے بھائی!" ـــ جیدا نے اس عورت کے خاوند سے پوچھا۔

"دو سال کی عمر کا بچہ کمرے میں سویا رہ گیا ہے" ـــ خاوند نے جواب دیا اور اُس کی سسکیاں نکل گئیں۔

"اُس سامنے والے کمرے میں" ـــ عورت نے کہا ـــ "وہ سامنے دوسری منزل پر" ـــ اب اُس کی آواز بھی بیٹھتی جا رہی تھی۔ اُس نے جیدا کے دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور بڑی زور سے بولی ـــ "میرا بچہ..... میرے بھائی! میرا لال جل رہا ہو گا۔ میرا لال..... میرا لال!"

جیدا جو ذرا سی دیر پہلے اُس کے زیورات کی اور اس کے جسم کی قیمت کا حساب لگا رہا تھا، یوں محسوس کرنے لگا جیسے اُس کی اپنی ماں اسے پکار رہی ہے اور وہ جل رہا ہے۔ اُس کے پاؤں تلے زمین یوں ہل گئی جیسے زلزلہ آیا ہو۔ اسے ایک ثانیے کے لیے اپنی ماں یاد آئی اور اس کے وجود میں آگ لگ گئی۔

ہر طرف وہ شور و غوغا تھا کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ دو اور انجن پہنچ گئے مگر ہوا اِس قدر تیز تھی کہ آگ پانی کے قابو سے باہر ہو چکی تھی۔

جیدا کو فائر بریگیڈ کی سیڑھی پڑی نظر آئی۔ اُس نے بچے کی ماں سے کہا ـــ "یہیں ٹھہرو" ـــ اُس نے بلڈنگ کی طرف دیکھ کر پوچھا ـــ "وہ فلیٹ بتایا ہے؟ دوسری منزل پر؟"

"ہاں!" ـــ عورت نے جواب دیا ـــ "وہ بالکونی والا دروازہ۔"

وہ فائر بریگیڈ والوں کی آہنی سیڑھی کی طرف دوڑا جو سڑک پر بیکار پڑی تھی۔ عورت کا خاوند اُس کے پیچھے گیا اور اُسے کہا ـــ "کیا کر رہے ہو تم؟..... کیا میری بیوی نے تمھیں انعام کا لالچ دیا ہے؟ احمق نہ بنو۔ آگ اوپر پہنچ چکی ہے۔ آگے نہ جانا۔"

جیدا نے اُسے گھور کر دیکھا اور سیڑھی گھسیٹ کر لے گیا۔ اُس نے سیڑھی اوپر کی تو بالکونی تک پہنچ گئی۔ فائر بریگیڈ کے دو آدمی اُس کی طرف دوڑے مگر جیدا احمق نہیں پاگل ہو چکا تھا۔ اس قسم کے نفسیاتی کیس انتہا پسند ہُوا کرتے ہیں۔ ان کا اچھا کام بھی ابنارمل حالت میں ہوتا ہے اور بُرا بھی۔

فائر بریگیڈ کے آدمیوں کے پہنچنے تک وہ سیڑھی پر چڑھ کر بالکونی تک پہنچ چکا تھا۔ اس طرف اس بلڈنگ سے کوئی شعلہ باہر نہیں آ رہا تھا۔ لگتا تھا کمرے آگ سے محفوظ ہیں۔ جیدا نے بند دروازے کو دھکیلا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ جیدا نے کواڑوں پر لاتیں ماریں۔ زور زور سے کندھے سے ٹکریں ماریں۔ ایک کواڑ ٹوٹ گیا۔ جیدا نے اپنے جسم کی طاقت کبھی نہیں آزمائی تھی۔ اُسے پہلی بار

پتہ چلا کہ اُس کے جسم میں طاقت ہے۔ اس نے ٹوٹے ہوئے کواڑ کے تختے کو پکڑا اور اتنا زور لگایا کہ تختہ ٹوٹ گیا۔

نیچے ہجوم چلّا رہا تھا ـــــ "وہ دیکھو وہ آدمی زندہ جلنے جا رہا ہے..... وہ اندر گیا تو واپس نہیں آسکے گا۔"

اس ہجوم میں صرف ایک عورت تھی جو سڑک پہ دوزانو بیٹھ گئی تھی اور دوپٹہ اپنے ہاتھوں پر پھیلا کر خدا سے اپنا بچہ زندہ مانگ رہی تھی اور وہ رو رو کر اس اجنبی کی سلامتی کے لیے دعا مانگ رہی تھی جو اس کے بچے کو جلتی ہوئی بلڈنگ سے نکالنے کے لیے تنور میں کود گیا تھا۔

جیدا نے کواڑ توڑ لیا تو رُکا ہُوا دھواں باہر نکلنے لگا۔ جیدا جھک کا جسم کو سکیڑا اور ٹوٹے ہُوئے کواڑ میں سے اندر چلا گیا۔

یہ فراخ کمرہ تھا مگر دھواں اتنا کہ جیدا کو اچھی طرح نظر نہیں آرہا تھا۔ دروازے کے ساتھ لکڑی کی ایک الماری کے پیچھے آگ بھڑک چکی تھی۔ الماری کے پیچھے ایک کھڑکی تھی۔ اس کے کواڑ جل رہے تھے۔ دھوئیں سے جیدا کو کھانسی آئی۔ اس نے پلنگ سے چادر اٹھا کر اپنے سر اور چہرے پر لپیٹ لی۔

کمرے کے ایک کونے میں دو برس کی عمر کا ایک بچہ چیخ چیخ کر رو رہا تھا ـــــ "امّی! امّی! امّی"

جیدا نے بچے کو دیکھا تو وہ ایک ہی جست میں بچے تک جا پہنچا اور اسے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ وہ دروازے کی طرف گھوما تو جلتی ہوئی الماری کا نیچے والا کونہ جل چکا تھا۔ الماری ہیبت ناک گڑگڑاہٹ سے دروازے کے سامنے گر پڑی۔ شعلے چھت تک جا پہنچے اور دروازہ بھی جلنے لگا۔ نکلنے کا راستہ بند ہوتے دیکھ کر جیدا کا دل ڈوبنے لگا ـــــ کمرہ تنور بن چکا تھا۔ اُس نے بچے کو زندہ اُٹھا لیا تھا مگر نکلے کدھر سے؟

بچہ تپش اور خوف سے چیخ چیخ کے پاگل ہو رہا تھا۔ جیدا کا جسم جھلسنے لگا۔ ایک لمحہ ضائع کرنا خودکشی کے برابر تھا۔ اُس نے ہر طرف نظر دوڑائی۔ کسی طرف سوائے دھوئیں اور شعلوں کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اُس کا دل گھٹنے لگا اور بچے کا سر ڈول گیا۔ جیدا نے ایک چارپائی سے جو ابھی آگ سے محفوظ تھی، چادر اٹھا لی اور بچے کو اس میں لپیٹ کر کندھے سے لگا لیا۔

چارپائی کے ساتھ اسے ایک دروازہ نظر آیا۔ اس نے چارپائی پھلانگ کر کواڑ دھکیلے تو معلوم ہُوا کہ دوسری طرف سے بند تھے۔ باقی دو دروازے جل رہے تھے۔ جیدا نے تمام قوتیں یکجا کر کے اس دروازے کو بھی لاتوں سے توڑ لیا اور دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔

اس کمرے کا حال بھی وہی تھا۔ شعلے تو کم تھے، دھواں زیادہ تھا۔ بچے کا سر اور منہ چادر میں لپٹا ہُوا تھا۔ وہ بُری طرح تڑپ رہا تھا اور جیدا پسینے میں نہایا ہُوا نہایت تیزی سے کسی راستے کی تلاش میں ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ فرش پر پاؤں رکھنا محال ہو رہا تھا۔ جیدا اکیلا ہوتا تو جلتے ہوئے دروازے میں سے ہی نکل جاتا لیکن اس کی تمام تر توجہ بچے پر تھی۔

ٹٹولتے ٹٹولتے جیدا کو ایک کونے میں دھواں دھار میں چھپی ہوتی لکڑی کی ایک سیڑھی نظر آئی جس کے پائیدان ایک ایک فٹ چوڑے تھے۔ سیڑھی کا نیچے والا پائیدان جل رہا تھا۔ جیدا کی آنکھیں دھوئیں اور تپش سے بند ہو رہی تھیں۔ اُس نے پلکوں پر زور دے کر آنکھیں کھولیں اور شعلے کو پھلانگ

کر دوسرے پائیدان پر جا پہنچا۔ اُسے یوں لگا جیسے اُس کی ٹانگ جل گئی ہو اور لال سرخ گرم لوہے کی سلاخیں اس کے جسم کے ساتھ چپکا دی گئی ہوں۔ سیڑھی پر وزن جو پڑا تو جلتا ہُوا حصہ بیٹھ گیا اور سیڑھی ایک طرف لڑھکنے لگی۔ نیچے سے شعلہ بلند ہو کر جیدا اور بچے کے تعاقب میں بڑھ رہا تھا لیکن جیدا آخری پائیدان تک پہنچ چکا تھا۔

اُس نے ہاتھ اوپر کیا تو چھت کے ساتھ ملا ہُوا لکڑی کا تختہ محسوس ہُوا جو اوپر کو کھلتا تھا مگر چٹخنی بند تھی۔ کراچی کے پرانی طرز کے فلیٹوں کی چھتوں میں اوپر جانے کے لیے ایسے راستے بنائے گئے تھے جن کے نیچے سیڑھیاں لگی ہوتی ہیں اور چھت میں ایک مضبوط تختہ ہوتا ہے جو اُوپر کو کھلتا ہے ـــــ سیڑھی کسی لمحے گرا ہی چاہتی تھی۔ دھوئیں سے جیدا کا دم گھٹ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے موت بھی جیدا کے ساتھ آخری پائیدان پر کھڑی تھی۔

اُس نے آنکھیں بند کر کے تختے کو ٹٹولا تو چٹخنی مل گئی جسے کھول کر جیدا نے دھکیلا تو تختہ اُوپر اٹھ گیا۔ اُس کے ساتھ دھواں گھنے گرم بادلوں کی طرح اس تنگ راستے پر حملہ آور ہُوا۔ نکاس کی یہی ایک راہ تھی۔ جیدا تقریباً غش کھا گیا تھا لیکن اُوپر چلا گیا۔

یہ ایک اور کمرہ تھا جس میں آگ تو نہیں پہنچی تھی لیکن دھوئیں سے اس قدر بھر گیا تھا کہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ جیدا کی آنکھیں اب بالکل بند ہو کے جلنے لگی تھیں۔ بچہ گرمی اور حبس کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔ اب تو اس کی آواز بھی بند ہو چکی تھی۔ جیدا اسی قدر سوچ سکا کہ یہاں دو منٹ بھی رک گیا تو دم نکل جائے گا۔

اندھوں کی طرح ٹٹولتا ہُوا وہ چل پڑا۔ فرش کی تپش تنور سے کم نہ تھی۔ وہ میز سے ٹکرایا، پھر ٹرنک پر گرا، اٹھا تو تپائی سے ٹھوکر کھائی۔ کہیں اُنچی کہیں کھلا پڑا تھا۔ وہ گرتا، اٹھتا، آگے بڑھا تو کھلے ہُوئے دروازے میں سے باہر نکل گیا۔ سامنے دیوار سے ٹکرایا اور بائیں طرف گھوم گیا کیونکہ دائیں طرف سے ایک سخت گرم جھونکے نے اُسے جھلسا کے رکھ دیا تھا۔ چند قدم آگے بڑھا تو وہ ٹھوکر کھا کے آگے کو جھک گیا اور اس کا ہاتھ نیچے جا لگا۔ اسے محسوس ہُوا جیسے یہ چبوترہ ہے۔ پاؤں اوپر رکھا تو معلوم ہُوا کہ یہ سیڑھیاں ہیں۔ تمام دھواں اسی راستے سے اوپر جا رہا تھا۔ جیدا دھوئیں میں اڑتا ہُوا سیڑھیاں چڑھ گیا۔

ہوا کے تیز جھونکے نے اُس کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ سر تو پہلے ہی سے چکرا رہا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ کھلی جگہ آ گیا ہے۔ سب سے پہلے اس نے بچے کو چادر سے نکالا۔ دوسرے لمحے اسے خنکی محسوس ہونے لگی اور ہوش بھی ٹھکانے آنے لگے۔ پلکوں پر زور دیا تو آنکھیں ذرا ذرا کھلیں۔ دیکھا کہ وہ چھت پر کھڑا ہے۔ اوپر آسمان تھا اور دھوئیں کے بادل اوپر اُٹھ رہے۔ شعلوں کی بھیانک آواز میں اُسے لوگوں کا شور و غوغا بھی سنائی دینے لگا۔ یہ اس بلڈنگ کی آخری چھت تھی ـــــ تیسری منزل کی چھت!

تازہ ہوا نے جیدا اور بچے کو دم گھٹنے سے بچا لیا۔ وہ زندہ جلنے سے بھی بچ گئے مگر موت کی پیٹھ پر کھڑے تھے۔ جیدا نے لمبی لمبی سانسیں لیں اور سنبھل گیا۔ آنکھوں کو مل مل کے کھول لیا۔ بچہ ہچکیاں لے رہا تھا ـــــ "امّی پانی! امّی پانی!"

جیدا کی آنکھیں اچھی طرح کھلیں تو اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ دھوئیں میں سے اُسے کراچی کی دوسری عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ چھت وسیع میدان کی طرح تھی۔ چاروں طرف فصیل تھی۔ جیدا فصیل

تک گیا۔ جھک کے دیکھا۔ اس طرف بازار کی گلی تھی۔ دوسری طرف جا کے دیکھا۔ اس طرف بھی بازار کی گلی تھی۔ وہ بھاگ کر تیسری طرف گیا۔ یہ بھی گلی تھی۔ یہ عمارت چاروں طرف سے کسی عمارت کے ساتھ ملی ہوئی نہیں تھی۔ جیدا نے اوپر دیکھا۔ اوپر آسمان تھا۔

فائر انجنوں کی ٹن ٹن، پانی پھینکنے کی آوازیں اور لوگوں کا شوروغوغا کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔ جیدا نے ایک دفعہ پھر چاروں منڈیروں کا جائزہ لیا لیکن بے سود۔ بچے کا سر ڈول رہا تھا۔ وہ اب نزع کے وقت کی سی ہچکیاں لینے لگا تھا۔ جیدا تڑپ اٹھا۔

اسے ایک ہی راستہ سوجھا کہ کوئی نیچے سے رسّہ پھینکے اور وہ رسّے کا سرا فصیل سے باندھ کے نیچے اتر جائے لیکن شعلوں نے اب تمام عمارت کو ہر طرف سے لپیٹ میں لے لیا تھا۔ رسّے کا اوپر آنا ناممکن تھا۔ وہ سڑک کی طرف منڈیر تک گیا۔ نیچے دیکھا تو ایک شعلے نے لپک کر اُسے جھلسا دیا۔ وہ پیچھے ہٹا اور سامنے دیکھا۔

اس کا ڈوبتا ہوا دل سنبھل گیا۔ امید کی ایک کرن چمکی اور جیدا نے ایک بار پھر آنکھیں سکیڑ کر دھوئیں میں سے دیکھا۔ سامنے سڑک کے اُس پار فٹ پاتھ پر ایک پرانا اور گھنا درخت تھا جو سڑک کے اُوپر پھیلتے پھیلتے جلتی ہوئی عمارت سے پانچ چھ گز تک پہنچا ہُوا تھا۔ یہی ایک راستہ تھا۔

جیدا نے ایک ایسا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا جو خودکشی کا فیصلہ تھا لیکن بچ نکلنے کی آخری کوشش یہی ہوسکتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اس چھتری نما درخت کی ٹہنیاں شاید اُس کا وزن نہ سہار سکیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ منڈیر سے کود کر درخت کی ٹہنیوں تک پہنچ ہی نہ سکے لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ آگ بے قابو ہو کر پھیل چکی ہے۔ چھت لوہے کی طرح تپ رہی ہے اور گرنے ہی والی ہے۔ جل کے مر جانے سے تو یہی بہتر ہے کہ وہ کود جائے۔ اگر درخت تک نہ بھی پہنچ سکے تو وہ سڑک پر گر کر مر جائے گا لیکن بچہ شاید اس کے اوپر گرے اور بچ جائے۔

اس نے اور کچھ سوچے بغیر فصیل کو لاتوں سے گرا کر گز بھر چوڑا راستہ بنالیا۔ وہ بیس پچیس قدم پیچھے آیا۔ بچے کو پیٹھ پر بٹھا کر اُس کے بازو اپنی گردن کے گرد کر لیے اور چادر بچے پر ڈال کے چادر کے سرے اپنے سینے کے آگے باندھ لیے۔ بچہ چادر میں لپٹ گیا۔ جیدا دو تین بار اچھلا، پھر بچے کو ہاتھ لگا کر محسوس کیا۔ گانٹھ کو دیکھا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ بچہ مضبُوط بندھا ہُوا ہے تو وہ دوڑ پڑا۔

اُس نے رفتار اتنی تیز کر لی کہ بیس پچیس قدم کا فاصلہ پلک جھپکتے طے کر لیا۔ جیدا کا آخری قدم منڈیر پر پڑا جہاں سے اُس نے فصیل گرائی تھی اور وہ جسم کا تمام زور لگا کر ہوا میں آگے کو بلند ہو گیا۔ بازو آگے پھیلائے جیسے اڑ رہا ہو — اور دوسرے لمحے وہ درخت کی گھنی شاخوں پر جا پڑا۔

جیدا کے وزن سے ٹہنیاں ٹوٹنے لگیں۔ اُس نے چند ایک ٹہنیاں مضبوطی سے پکڑ لیں اور نیچے والی ٹہنیوں پر پاؤں رکھے۔ اس طرح وہ شاخوں کو تھامتا، سرکتا بڑے ٹہن تک پہنچ گیا۔

فائر بریگیڈ کے آدمی مصروف تھے۔ ہجوم میں سے دو چار آدمی دوڑے اور فائر بریگیڈ کی ایک سیڑھی گھسیٹ کر درخت کے ساتھ لگا دی۔ جیدا سیڑھی پر پاؤں رکھتا نیچے آگیا۔ اُس نے سب سے پہلے بچے کو چادر سے نکال کر دیکھا۔ بچہ صحیح وسلامت تھا۔

بچے کی ماں رو رو کے ہلکان ہو رہی تھی اور ابھی تک اُس دروازے پر نظریں جمائے ہُوئے

تھی جس میں جیدا غائب ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھوں پر دوپٹہ پھیلا رکھا تھا اور ابھی تک خدا سے اپنا بچہ مانگ رہی تھی۔ اُس کے خاوند نے اُسے ایک بار غصے سے کہا تھا — "تُو نے ایک آدمی کو زندہ جلا ڈالا ہے" — مگر ماں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اُس نے خاوند کی طرف دھیان نہ دیا۔

اُس کے خاوند نے ایک آدمی کو بلڈنگ کی منڈیر سے اڑ کر درخت پر آتے دیکھا تھا۔ پھر اُس نے جیدا کے کندھے سے اپنا بچہ لگا دیکھا تو وہ دوڑا گیا۔ بچے کی ماں سے کسی نے کہا — "وہ دیکھو۔ وہ آدمی ایک بچے کو نکال لایا ہے۔"

ماں دوڑی گئی۔ اُس نے اپنے بچے کو پہچان لیا اور اُسے جیدا سے نوچ کر سینے سے لگا لیا۔ بچے کا باپ جیدا سے بغل گیر ہو گیا۔ ایک ہجوم جیدا پر ٹوٹ پڑا۔ کوئی ہاتھ ملا رہا تھا، کوئی پیٹھ تھپکا رہا تھا۔ کوئی گلے لگنے کو لپک رہا تھا اور بہتوں نے دور سے ہی مرحبا، زندہ باد اور آفرین کہہ کر داد دے لی۔

جیدا اس ہجوم میں یوں کھڑا تھا جیسے اپنے گردوپیش کا ہوش ہی نہ تھا۔

ماں نے بچہ باپ کے حوالے کیا اور گلے کا ہار اتار کر جیدا کے ہاتھ میں دے دیا اور بولی — "میرے پیارے بھائی! یہ قبول کر لو۔"

جیدا اپنے ہاتھ میں سونے کا ہار دیکھ کر چونک اٹھا۔ اُس نے عورت کی طرف دیکھا، پھر ہار کو دیکھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر ہار بچے کے گلے میں ڈال دیا اور ہجوم کو چیرتا ہُوا نکل گیا۔ عورت اس کی طرف لپکی۔ اُس کے خاوند نے بھی کہا۔ "لے جاؤ بھائی! ہم اُجرت نہیں دے رہے۔ یہ تمہارا انعام ہے" — لیکن جیدا کہیں گم ہو چکا تھا۔

ادھر وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوا اُدھر فائر بریگیڈ کی ٹن ٹن یکبارگی تھم گئی۔ ہجوم میں ہڑبونگ مچ گئی۔ لوگ ایک دوسرے کو روندتے بھاگ اُٹھے۔ فائر انجن جدھر کو منہ آیا بھاگنے لگے۔ دلوں کو ہلا دینے والی خوفناک گڑگڑاہٹ سے عمارت کی سامنے والی دیوار زمین پر ڈھیر ہو گئی۔ تین منزلہ عمارت کی دیوار کی بلندی معمولی نہیں تھی۔ چھتیں بھی گرنے لگیں اور آگ دُور دُور تک پھیلنے لگی۔

—

نازؔ بچے کو سُلا کر باورچی خانے کی طرف جارہی تھی کہ جیدا آ گیا۔ نازؔ نے اس کا حال حلیہ اور رنگ روپ دیکھا تو گھبرا کر اس کی طرف دوڑی۔

جیدا کی قمیض کہنیوں سے پھٹی ہُوئی اور پتلون نما پاجامہ ٹخنوں کے قریب سے جلا ہُوا تھا قمیض اور پاجامے پر سیاہ اور سبز رنگ کے داغ دھبّے تھے۔ چہرہ کالا ہو گیا تھا آنکھیں لال سرخ اور سوجی ہوئیں۔ بال پسینے سے جُڑے ہُوتے اور سر سے دائیں کان کے پیچھے سے خون ٹپک رہا تھا اور اس کی چال ڈھال بھی بدلی ہوئی تھی۔ نازؔ سمجھی کہ کسی سے لڑ کر آیا ہے

"یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟"— نازؔ نے پوچھا۔

جیدا جواب دیئے بغیر کمرے میں چلا گیا۔ نازؔ نے لڑکے کو پانی گرم کرنے کے لیے کہا اور خود کمرے میں گئی۔ جیدا سر جھکائے ٹہل رہا تھا۔ نازؔ نے اُسے بلایا تو بھی وہ کسی گہری سوچ میں غرق رہا۔

"آخر معاملہ کیا ہے؟" — نازؔ نے جھنجھلا کر کہا۔ "آج کوئی نئی لڑائی تو نہیں لڑی تم نے کہیں مُنّے اور ٹیپو کے ساتھ ہی تو جھڑپ نہیں ہوگئی؟"

"نہیں الڑائی تو نہیں ہُوئی"— جیدا نے ایسے لہجے میں کہا جو اُس کا اپنا لہجہ نہیں تھا۔ اُس کی زبان جیسے اُس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اُس نے کہا— "بازار میں آگ لگ گئی تھی۔ ایک بچہ جلتے مکان میں رہ گیا تھا۔ اس کی ماں سڑک پر کھڑی رو رو کر بُرا حال کر رہی تھی۔ میں گیا اور جلتے مکان میں سے بچے کو زندہ نکال لایا۔"

جیدا نے اس قدر عظیم کارنامہ یوں سنا ڈالا جیسے کوئی بات ہی نہیں تھی۔ وہ کمرے میں گیا اور بچے کو اٹھا لایا۔

نازؔ خاموش کھڑی سن رہی تھی۔

جیدا نے ٹخنے پر ہاتھ رکھتے ہوتے کہا— "معلوم ہوتا ہے یہاں سے ٹانگ جل گئی ہے..... بچے کی ماں عجیب بے وقوف عورت تھی۔ اتنا قیمتی ہار گلے سے اتار کر مجھے دے دیا۔"

"اس نے ہار تمہیں دے دیا؟"— نازؔ نے پوچھا۔ "کہاں ہے وہ ہار؟"

"اُسی کے بچے کے گلے میں ڈال آیا ہُوں"— جیدا نے جواب دیا۔

"معلوم ہوتا ہے آج شراب یا چرس کی بجائے گانجا پی کر آئے ہو"— نازؔ نے کہا— "اور نشے کی حالت میں لڑائی مار کٹائی کی کوئی فلم دیکھ آئے ہو۔"

اُس نے نازؔ کی طرف دیکھا۔ ایک تو اس کے چہرے پر سیاہ دھبّے تھے اور آنکھیں لال اور سُوجی ہُوئی تھیں، دوسرے کچھ ایسے تاثرات اُس کے چہرے پر آ گئے تھے جو جیدا جیسے جرائم پیشہ انسان کے لیے اجنبی سے لگتے تھے۔ اُس پر جیسے خوف سا بھی طاری تھا۔ جو کچھ بھی تھا، نازؔ کے لیے انوکھا تھا۔ جیدا کو اُس نے جسمانی طور پر بھی اور ذہنی لحاظ سے بھی اس حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"تمہیں ہو کیا گیا ہے جیدے!"— نازؔ نے جھنجھلا کر کہا— "بیٹھ جاؤ..... میرے پاس بیٹھ جاؤ..... ہاں اب بتاؤ"

"کیا بتاؤں نازؔ!"— جیدا نے اکھڑے اکھڑے سے لہجے میں کہا— "کسی کے ساتھ لڑائی نہیں ہوئی..... ایک ایسی بات ہوگئی ہے..... ایسی بات..... نہیں..... وہ کوئی اور تھا۔ میں ایسا بہادر نہیں ہُوں۔ گناہگار اور مجرم بہادر نہیں ہُوا کرتے....."

"کچھ سناؤ تو سہی"— نازؔ نے کہا— "ایسی کون سی بات ہوگئی ہے؟"

جیدا نے نازؔ کو سارا واقعہ من وعن سنا دیا لیکن اس کے سنانے کے انداز میں ڈرامائی تھا تو دُور کی بات ہے، خودستائی کی ہلکی سی بھی جھلک نہیں تھی، بلکہ وہ حیران ہُوا جا رہا تھا کہ وہ کیا کر گزرا ہے۔

وہ نازؔ سے پوچھنے لگا تھا کہ وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا لیکن نازؔ نے اسے مہلت نہ دی اور دیوانہ وار اس سے لپٹ گئی۔ اس کے گالوں کو چوما، پسینے سے جڑے ہوتے بالوں کو چوما۔ جیدا بے تاب ہو گیا اور اس نے بازو نازؔ کی کمر کے گرد لپیٹ لیے۔

اُسے یوں لگا جیسے وہ ایک بار پھر جلتے ہوتے مکان میں پھینک دیا گیا ہو۔ نازؔ کے بازوؤں میں اُس کا انگ انگ جلنے لگا۔ اُس کی آنکھیں نیم وا تھیں جیسے اس پر بے خودی طاری تھی۔

نازؔ کے آنسو بہ نکلے۔ بولی— "جیدا! میں بھی تو جل رہی ہوں۔ تمہاری ہی لگائی ہُوئی آگ میں جل رہی ہوں۔ خدا کے لیے بتا دو اس آگ سے کب نکالو گے؟"

جیدا نے کچھ جواب دیئے بغیر اس کا گال اپنے گال سے لگا لیا۔

دوسرے کمرے سے بچے کے رونے کی آواز آئی تو نازؔ نے دھیان نہ دیا لیکن جیدا چونک اٹھا، کرسی سے اٹھا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

بچہ جیدا کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ اس کے حلیے سے ڈر رہا تھا۔

"بھوت بنے ہُوتے ہو"— نازؔ نے ہنس کر کہا— "ہٹو! میرے مُنّے کو ڈرا دیا۔"

جیدا نے بچے کو اٹھایا تو نازؔ نے بچہ اس سے لے لیا۔

"میں دیکھتی ہُوں، پانی گرم ہو گیا ہوگا"— نازؔ نے کہا— "تم پہلے نہا لو پھر مرہم پٹی کرا آؤ..... دکھاؤ تو ٹانگ کتنی کچھ جل گئی ہے"— اس نے جھک کر جیدا کی ٹانگ دیکھی۔ ٹخنے کے قریب خاصا بڑا زخم تھا۔

بچہ بھوک سے بیتاب ہو رہا تھا۔ نازؔ باورچی خانے میں چلی گئی۔

لڑکے نے جیدا کو آکے بتایا کہ اُس نے غسلخانے میں گرم پانی رکھ دیا ہے۔ جیدا نے غسلخانے میں جا کر صرف منہ ہاتھ دھویا اور آکے قمیض اور پاجامہ بدلا۔ اس کے ذہن میں آندھی سے پہلے کا سکوت تھا۔ اُسے جیسے نہ وہ آگ یاد تھی جس میں سے وہ ایک بچے کو زندہ نکال لایا تھا نہ یہ آگ جو ابھی نازؔ نے اس کی داخلی دنیا میں لگا دی تھی

وہ کرسی پر جا بیٹھا۔ سگریٹ منہ میں لیا اور ماچس جلائی۔ جب جلتی ہوئی دیا سلائی اُس کی آنکھوں کے قریب آئی تو ذرا سی لو مہیب شعلہ بن گئی اور دوسرے ہی ثانیے جیدا کو ہر سو شعلے ہی شعلے نظر آنے لگے۔ اس نے چونک کر دیا سلائی پرے کر دی۔ دیا سلائی تو بجھ گئی لیکن شعلے پھیلتے اور غراتے ہی رہے۔ اس کے ذہن میں ایک مکان جل رہا تھا شعلوں نے مکینوں کے نکل بھاگنے کے تمام راستے بند کر رکھے تھے

جیدا نے سر کو جھٹکا دیا لیکن آگ کا قہر پھیلتا ہی چلا گیا۔ ایک آج کی آگ کہ اُس نے ایک بچے کی خاطر اپنی جان شعلوں کے سپرد کر دی تھی، اور ایک اس کے ذہن میں لگی ہُوئی آگ.... برسوں پرانی جس میں اُس نے ایک آدمی اور اُس کے دو بچے جلا ڈالے تھے۔

اُس کے ذہن میں آتش فشاں پہاڑ پھٹنے لگا۔ اسے برسوں پرانی۔ اپنے ہاتھوں لگائی ہوئی ایک آگ یاد آ گئی۔ کراچی آنے سے چند سال پہلے اُس نے مبئی میں ایک مکان میں نصف شب کو آگ لگائی تھی پیشتر اس کے کہ گھر والے نکل بھاگتے شعلوں نے دروازوں اور کھڑکیوں کو لپیٹ میں لے کر بھاگنے کے رستے بند کر دیتے تھے۔ ایک قیامت بپا کر کے جیدا الگ کھڑا جلتے ہُوئے ایک آدمی، ایک عورت اور دو بچوں کی دلدوز چیخیں سنتا رہا تھا۔ شعلوں نے ان چیخوں کو بھی خاموش کر دیا تو جیدا جا کے اطمینان کی گہری نیند سو گیا تھا۔ دوسری صبح اُس نے جھلسی ہُوئی لاشیں دیکھیں تو اس کے رگ و ریشے میں ٹھنڈی سی لہر دوڑ گئی —— انتقام کی آگ بجھ چکی تھی۔ اس آدمی نے اس کے اُستاد کے خلاف گواہی دی تھی۔ یہ آدمی اپنے دو بچوں کے ساتھ جل گیا اور اس کی بیوی بچ گئی تھی۔

برسوں پرانی اس آتشزدگی کو وہ کبھی کا بھول چکا تھا لیکن آج دیا سلائی نے یا جھلسی ہُوئی ٹانگ نے اُس کے ذہن میں وہی شعلے پھر بیدار کر دیتے۔ جلتے ہوئے بچوں کی چیخیں اُس کی داخلی دنیا میں زلزلے بپا کرنے لگیں، پھر یادوں کے یہ شعلے اُس کا انگ انگ جلانے لگے ضمیر جھلس کر تڑپنے لگا۔

اُس نے درد کی شدید ٹیس محسوس کی۔ اُس کا ہاتھ لاشعوری طور پر ٹانگ پر چلا گیا تو اُسے خیال آیا کہ آج کی آگ نے اُسے جھلسا دیا ہے۔ سینے کی جلن کہیں زیادہ شدید تھی۔ اُسے آج پہلی بار محسوس ہُوا کہ اُس نے مبئی میں معصوم بچوں کو کس بے دردی سے زندہ جلا ڈالا تھا۔ انتقام تو بڑوں سے لینا تھا۔

وہ اپنے آپ میں تڑپ اٹھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اس کے ضمیر میں ایک کانٹا چبھا ہُوا ہے جو اُسے اب جینے نہ دے گا، شاید مرنے بھی نہ دے۔ یہ چبھن اُس نے آج پہلی بار محسوس کی جیسے اُن جلے ہُوئے بچوں کے جسموں کا درد اُسی کے جگر میں سمٹ آیا ہے۔

وہ اٹھ کھڑا ہُوا اور باہر کو چل پڑا۔ وہ دیوانہ سا ہونے لگا اور اسے غصہ بھی آنے لگا تھا۔ اُسے ابّن پر غصہ آیا تھا تو اُسے اس نے بھوکا مار دیا تھا۔ بادل پر غصہ آیا تھا تو اُسے قتل کروا دیا تھا۔ آج اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا تو اپنے آپ سے بھاگ بھی رہا تھا اور اپنے آپ میں ہی پناہ ڈھونڈنے لگا۔ وہ بے چین تھا۔ بے حال تھا۔

وہ باہر کو چلا تو ناز نے پوچھا —— "ڈاکٹر کے پاس چلے؟"

وہ خاموش رہا۔

"پٹی کروا آؤ۔ پھر نہا لینا طبیعت سنبھل جائے گی" —— ناز نے کہا۔

وہ سر جھکائے خاموشی سے باہر نکل گیا۔ چہرے کے تاثرات شدید درد کے آئینہ دار تھے۔

ناز بہت خوش تھی۔ جیدا نے آج اُسے گلے لگا لیا تھا۔ وہ ایسے خوش تھی جیسے منزل اس کے استقبال کو آگے بڑھ آئی ہو لیکن اُسے معلوم نہ تھا کہ اُس کی منزل جل رہی تھی۔

جیدا فٹ پاتھ پر سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ وہ رہ رہ کے جھٹکے ہوتے سر کو جھٹک کر اُس آگ کی یاد کو اگلنے کی کوشش کر رہا تھا جو اُس نے مبئی میں لگائی تھی لیکن آج ساری کراچی میں آگ ہی ہر کسی کا موضوع تھا۔ اس کے پاس سے جو گزرتا تھا آگ کی ہی باتیں کرتا گزرتا تھا۔

"بڑی زور کی آگ ہے"

"ابھی تک نہیں بجھی"

"جانے کتنے لوگ جل گئے ہیں"

"ایسی آگ کبھی سنی تھی نہ دیکھی تھی"

"اپنے گناہوں کا نتیجہ ہے"

"اللہ کا قہر ہے"

"آگ.... آگ.... آگ"

جیدا شعلوں کی لپیٹ میں چلتا ہی گیا۔ وہ جھنجھلا اُٹھا۔ خیال آیا کسی اڈے پر جا کے چرس کے دو کش لگائے یا اتنی وسکی پی لے کہ باہر کی دنیا کی آوازوں سے بیگانہ ہو جائے لیکن چرس اور وسکی کی بُو کے تصوّر سے اسے متلی سی آنے لگی جیسے اس بُو میں اُسے جلی ہوئی لاشوں کی بُو آنے لگی تھی۔

بے چینی اور خیالوں کی افراتفری بڑھتی چلی گئی۔ اُس نے بالی کے گھر کا رخ کیا اور بالی کے دل فریب جسم کے تصور میں پناہ ڈھونڈنے لگا مگر تصور نکھرا تو یہ ناز کا تھا۔ ناز کی تشنہ سی مسکراہٹ، جذبات سے بھرپور تبسّم اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جیدا کو یوں لگا جیسے اس کے بازو ناز کو سینے سے لگا لینے کو بڑھ رہے ہوں۔ بالی کا گناہ گزیدہ جسم ناز کی مسکراہٹ میں ایسا چھپا کہ اُبھر نہ سکا۔ جیدا کو شمی کا خیال آیا۔ سوچا آج کی رات اُس کے ہاں گزار آئے، شاید کچھ قرار آ جائے۔ اس کے قدم رکنے لگے لیکن ناز نے مسکرا کر اس کی راہ روک لی۔ بچے نے لپک کر اس کے دل کو دبوچ لیا اور جیدا تیز قدم چل پڑا۔

ناز اور بچے کے خیال نے اس کی جلن ٹھنڈی کر دی تھی لیکن شعلے پھر بھڑک اُٹھے۔ اُسے اپنے جسم سے بدبو کے بھبوکے اٹھتے محسوس ہُوتے اور ساتھ ہی یہ احساس کہ یہ جسم ناز کے قابل نہیں اور ہونٹ بچے کا منہ چومنے کے قابل نہیں۔ اُسے یوں لگا جیسے ناز اور بچہ اُسے چیخ چیخ کر کہہ رہے ہوں —— "تم پاپی ہو، ظالم اور دوزخی ہو۔ ہمارے قریب مت آؤ۔ تمہارے جسم سے جلے ہُوئے بچوں کی بو آتی ہے"

وہ رک گیا۔ جھنجھلاہٹ اور غصے سے وہ دیوانہ ہونے لگا۔ ضمیر اس کے سامنے ننگا ناچ رہا تھا۔ اُسے خیال آیا کہ آگ ابھی تک لگی ہوئی ہے۔ چل کے اسی میں کود جائے یا کسی کا خون کر دے یا ہر کسی کو آگ میں پھینک دے اور اس دنیا میں اکیلا رہ جائے۔

اس نے بہت کچھ سوچا مگر اس کی سوچ اور فکر پر ایک تلخ احساس غالب آ گیا کہ اس کا زہر چوس لیا گیا ہے۔ اب وہ کسی کا خون نہ بہا سکے گا۔ اس نے اپنے آپ میں بزدلی سی محسوس کی اور وہ خوفزدہ سا ہو گیا۔ زہریلے ناگ نے ڈنک مارنے کو پھن تو پھیلا لیا مگر ڈنک میں زہر نہیں تھا۔ وہ بجھ کے رہ گیا اور سر جھکا کے چل دیا۔

"کراچی جل رہا ہے....!"

جیدا چونک اُٹھا۔ سر اٹھا کے دیکھا۔ دو آدمی آگ کی باتیں کرتے جا رہے تھے۔ اس نے چاہا کہ بڑھ کے انہی کا گلا گھونٹ دے۔

"ابھی بھی نہیں" — ایک اور آدمی کہتا ہُوا قریب سے گزر گیا۔

جیدا کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے کان میں طنز آلود آواز میں کہہ دیا ہو — "یہ آگ تم نے لگائی تھی۔ بچے تم نے جلائے تھے۔"

وہ بھاگنے کی رفتار سے چل پڑا۔ کس سمت؟ اُسے معلوم نہ تھا۔ وہ چلا ہی جا رہا تھا جیسے کوئی اُس کا تعاقب کر رہا ہو۔

اس سراسیمگی میں، پسینے میں شرابور، ہانپتی سانسوں کو سنبھالنے کی کوشش کرتا وہ ایک دروازے میں داخل ہوگیا۔ صحن عبور کیا اور ایک کمرے میں جا پہنچا۔

"آؤ بیٹا!" — ایک پیار بھری بوڑھی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

جیدا نے پھٹی پھٹی نظروں سے ہر طرف دیکھا اور بے بس ہو کر دو زانو گر پڑا۔

"بابا جان!" — وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا — "مجھے کیا ہوگیا ہے؟ میرا زہر کہاں ہے؟"

بوڑھے موسیقار نے اُسے کندھوں سے تھام کر دیکھا۔ اس کے کان کے پیچھے خون جم گیا تھا۔ اُسے شک ہُوا کہ سر پر چوٹ آنے سے دماغ ماؤف ہوگیا ہے۔

"جیدا" — بوڑھے نے جیدا کو کندھوں سے جھنجھوڑا اور کہا — "جیدا بیٹا!"

"کہو بابا! میں سُن رہا ہوں" — جیدا کی آواز گہری کھائی سے آتی معلوم ہوتی تھی۔

"کیا کر آئے ہو آج؟" — بوڑھے نے پوچھا — "لڑائی جھگڑا ہوگیا کسی سے؟"

"نہیں" — جیدا نے کہا اور آگ میں سے بچہ نکال لانے کی تمام تر تفصیلات سنا دیں اور یہ بھی سنا دیا کہ اس کے بعد اس کی ذہنی حالت کیا ہوگئی ہے۔ اس نے بابا کو بمبئی والی آگ کی واردات بھی سنا ڈالی۔

جیدا چپ ہوگیا۔ چہرے پر گہری اداسی چھا گئی۔ دکھ سے لبریز لہجے میں بولا — "اب میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ کاش! میں ناز کو خرید کے یوں گھر پر نہ رکھ لیتا۔ جس کام کے لیے خریدی تھی اسی پر چلا دیتا۔ کاش! میں کسی کا بچہ یوں گود نہ لیتا۔ کسی کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیتا" — اُس نے آہ لی اور بولا — "بابا! وہ منحوس گھڑی تھی جب میں تمھارے ہاں پہلی بار آیا تھا اور تم نے مجھے بیٹا کہا تھا۔ تم مجھے یوں پیار سے بیٹا نہ کہتے .... تم تینوں کے پیار نے میرا زہر چوس لیا ہے .... میں بھٹک گیا ہوں۔ یہ محبت میرے لیے نہیں، میں محبت کے لیے نہیں۔ میں غنڈہ ہوں، چور ہُوں، خونی ہوں۔"

"اپنے آپ کو یوں بے حال نہ کرو بیٹا" — بوڑھے نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہُوئے کہا — "تمھارے دل نے محبت کو قبول کر لیا ہے۔ یہ حقیقت تمھیں انوکھی سی لگ رہی ہے کیونکہ تم اس جذبے سے بیگانہ رہے ہو۔ اب ایک جست سے غنڈہ گردی سے نکل آؤ اور ناز اور بچے کو لے کر کسی گوشے میں آباد ہو جاؤ۔"

"یہ ناممکن ہے بابا جان!"

"کیوں ناممکن ہے؟"

"اب میں اس حقیقت کو چھپا نہیں سکتا کہ مجھے ناز سے محبت ہے اور مجھے بچے سے پیار ہے

— جیدا نے تلخ سا گھونٹ نگل کر کہا — "میں اب ان کی خاطر زندہ رہنا چاہتا ہُوں۔ ان کی محبت نے اور میرے گناہوں نے مجھے ڈس لیا ہے۔ میرا جسم بھی اور دماغ بھی بیکار ہوگیا ہے۔ آج ایک بچے کو آگ سے نکالا تو میرے سینے میں وہ آگ بیدار ہوگئی جو برسوں گزرے میں نے لگائی تھی اور ایک آدمی اور دو بچوں کو زندہ جلا ڈالا تھا۔ ان معصوموں کی روحیں جیسے آج کی آگ کے شعلوں میں چھپی بیٹھی تھیں اور اُنہوں نے میری روح کو لہولہان کر دیا ہے" — جیدا کے جسم نے جھرجھری لی اور جیسے اپنے آپ میں لرز اُٹھا ہو۔ بولا — "لیکن میں اب ناز اور بچے کا ساتھ نہ دے سکوں گا۔ میں ان کے قابل نہیں۔ میں اس قدر بزدل ہوگیا ہوں کہ اپنے شاگردوں کے سامنے بھی نہ جا سکوں گا۔"

اس کے چہرے کا تاثر یک لخت بدل گیا۔ آنکھیں کہیں دور دیکھ رہی تھیں اور ہونٹوں پر ہلکی سی لرزش تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہُوا۔ بولا — "میں طوفان میں گھر گیا ہُوں بابا! کوئی راہ نہیں۔"

جیدا کی آواز لرز کے خاموش ہوگئی۔ بابا اس کی بدلتی ہوئی ذہنی کیفیت کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ کیا کرے کہ جیدا نے بجلی کی سی تیزی سے پتلون نما پاجامے کی جیب سے بڑا سا راچاقو نکالا۔ کھولا اور چاقو اوپر کر کے کہا —

"بابا جان! ایک ہی راہ ہے۔ میں جا رہا ہوں۔"

اُس نے بازو لمبا کیا اور چاقو کی نوک اپنے سینے کی طرف کر کے چاقو کھینچا۔ چاقو اور اس کے سینے میں صرف ایک سانس، صرف ایک ثانیے کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ بابا یوں تڑپا جیسے چاقو اُس کے اپنے سینے میں پیوست ہو رہا ہو۔ سوچنے کا وقت نہ تھا۔ اٹھ کر جیدا کے ہاتھ پکڑ لینے کا وقت نہ تھا۔ اُس کے پاس ستار رکھی تھی۔ اُس نے پلک جھپکتے ستار اٹھائی اور لپک کر جیدا کے سینے پر رکھ دی۔ چاقو ستار کے تونبے میں گھس گیا۔ بوڑھے نے ستار کھینچی تو چاقو ستار کے ساتھ ہی چلا آیا۔ دوسرے ہی ثانیے وہ اچھل کے اٹھا اور ستار پرے پھینک کر جیدا کے مُنہ پر زناٹے دار دو تھپڑ مارے، ایک اس گال پر ایک اُس گال پر اور چلّا کر کہا — "میں تمھیں مرنے نہ دوں گا" — اور پیشتر اس کے کہ جیدا سنبھلتا اُس نے جیدا کو سینے سے لگا کر زور سے بھینچا اور اس کی پیشانی پر ہونٹ رکھ کر طویل بوسہ لیا۔

بابا جیدا کو سینے سے لگائے پلنگ پر بیٹھ گیا اور جیدا اس کے سامنے فرش پر دو زانو بیٹھ گیا۔

"جاگ! جیدا جاگ!" — بابا نے اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کے کہا — "نکل اس جہنم سے۔ ناز تیری راہ دیکھ رہی ہے۔ وہ معصوم بچہ تیرے انتظار میں رو رہا ہے جس کا کوئی باپ نہیں۔ تو ہی اُس کا باپ ہے۔ میرا کوئی بیٹا نہیں۔ تو ہی میرا بیٹا ہے" — بابا کی آواز بھرّا گئی۔ لرزتی ہُوئی آواز میں بولا — "تو باپ کو ڈھونڈ رہا ہے۔ میں بیٹے کی تلاش میں ہوں .... جاگ جیدا! ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پا لیا ہے۔ آنکھ کھول کے دیکھ! تیرا وہ گھر آباد ہوگیا ہے جسے تیس برس گزرے موت نے اجاڑ دیا تھا۔"

"بابا جان!" — جیدا زار و قطار رو رہا تھا۔ بولا — "سخت اذیّت میں ہوں۔ ذرا سا لیٹ جانے دو۔ میرے منہ پر چادر ڈال دو۔ ذرا سا رو لوں۔ کچھ سوچ لوں۔ تم نے مرنے بھی نہ دیا۔"

وہ لیٹ گیا۔ آنسو بہے جا رہے تھے۔ بابا اس کے سرہانے بیٹھ گیا اور اس کی پیشانی سہلانے لگا۔ جیدا نے یوں محسوس کیا جیسے لرزتا ہُوا یہ ہاتھ اس کے ضمیر سے گناہوں کا زہر چوس رہا ہو۔ اس نے سکون سا محسوس کیا۔

”تم بزدل ہو بیٹا!“ — بوڑھے موسیقار نے کہا — ”دل والے یوں نہیں مرا کرتے.... اُٹھو، تمہارے زخم دھو کر ان پر کچھ لگا دوں، خراب ہو جائیں گے۔“

”میں یہ زخم اپنے ساتھ اسی حالت میں خدا کے پاس لے جانا چاہتا تھا“ — جیدا نے آہ بھر کر کہا — ”یہ زخم میری ایک نیکی کا ثبوت ہیں۔ میں خدا سے کہنا چاہتا ہوں کہ ساری عمر کے گناہ نیکی کے ان دو زخموں کے عوض بخش دے.... اب جی کے کیا کروں گا۔“

بوڑھا ہنس دیا اور باہر نکل گیا۔ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں ایک سلابچی تھی اور زخم دھونے کے لیے کپڑا، روئی اور دوائی بھی تھی۔ اُس نے جیدا کے زخم دیکھے۔ ایک کان کے پیچھے تھا اور ایک ٹخنے کے اوپر۔ یہ جگہ جلی ہوئی تھی اور اس میں سے نمی رس رہی تھی۔ بوڑھے نے کان کے پیچھے کا زخم صاف کرنا شروع کیا۔

”خدا نے تمہیں بہت بڑا انعام دیا ہے“ — بوڑھے موسیقار نے زخم صاف کرتے ہوئے کہا — ”گناہگاروں کو خدا بڑی لمبی ڈھیل دیتا ہے۔ اگر کسی گناہگار کے ہاتھوں خدا نیکی کا کوئی کام کرا دے تو یہ خدا کا انعام ہوتا ہے.... دنیا میں زیادہ تر لوگ وہ ہیں جو گناہوں میں سکون حاصل کرتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو تمہاری طرح جرائم کو زندگی بنا لیتے ہیں اور اعلانیہ کہتے ہیں کہ وہ گناہگار ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو اپنی شرافت کا ڈھنڈورہ پیٹتے رہتے ہیں لیکن جہاں اپنے فائدے کی خاطر جھوٹ بولنا پڑے، جھوٹ بولتے ہیں۔ دغا اور فریب دیتے ہیں، رشوت لیتے ہیں اور نماز روزے کی پابندی بھی کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عبادت کے عوض خُدا ان کے گناہ معاف کیے رکھے گا۔ انہیں خدا کبھی معاف نہیں کرے گا۔“

”میں کچھ نہیں سمجھتا بڑے میاں!“ — جیدا نے کہا — ”میں یہی سمجھتا ہوں کہ مجھ پر ظلم ہوا اور میں ظالم بنا۔ میرے ساتھ بے انصافی ہوئی اور میں نے قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا۔“

بوڑھا اُس کے کان کا زخم صاف کر کے اس پر دوائی لگا رہا تھا۔ اُس نے جیدا کو کوئی جواب نہ دیا۔ جیدا چپ ہوا تو وہ بھی چپ ہو گیا۔ کمرہ خاموش ہو گیا۔ بوڑھا چپ رہنے والا آدمی نہیں تھا۔ جیدا نے اُسے دیکھا۔ بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جیدا نے سر اُس سے دور کر لیا اور اُسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

”تمہاری آنکھوں میں آنسو بابا جان؟“

بوڑھے نے ہتھیلیوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا — ”تم نے ایک روز مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے کبھی مسکراتے ہوئے آنسو اور روتی ہوئی مسکراہٹیں دیکھی ہیں؟.... میں نے تمہیں کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ مسکراتے ہوئے آنسو اور روتی ہوئی مسکراہٹیں تم نے بھی کبھی نہیں دیکھیں.... میں آج تمہیں دکھانا چاہتا ہوں۔“

اُس نے جیدا کا سر پکڑ کر اپنے آگے کر لیا اور زخم پر دوائی لگانے لگا۔

”تم نے اپنے دل کی سنائی ہے بیٹا!“ — بوڑھے موسیقار نے جیدا کے سامنے بیٹھ کر اُس کے ٹخنے کے زخم کو دیکھتے ہوئے کہا — ”کبھی دوسروں کی بھی سنو.... ہر کوئی دکھی ہے بیٹا! اب تو وہ وقت آن

لگا ہے کہ جھوٹ بولو تو تم سچے، سچ بولو تو سزا پاؤ۔ قتل میں کروں، پھانسی تم پاؤ.... پھر بھی جیدا بیٹے! سچ اور سچی محبت خدا کو عزیز ہے۔ یہ روح کی غذا ہے۔ روح کے لیے جھوٹ اور بدی ویسے ہی ہے جیسے تم اپنے جسم میں شراب اور چرس ڈالتے رہتے ہو۔ جسم اندر سے گل سڑ جاتا ہے۔ اسی طرح روح بھی مریض اور کمزور ہو جاتی ہے۔ اسے سچ اور محبت کی غذا دو تو تندرست اور توانا رہتی ہے.... تم مجھے بڑا پیارا انسان کہا کرتے ہو اور کہتے ہو کہ تمہیں سکون میرے پاس آکر ملتا ہے۔ آؤ تمہیں بتاؤں کہ میں نے یہ پیار اور سکون کہاں سے حاصل کیا ہے۔“

بوڑھا ستار نواز جیدا کے سامنے بیٹھ گیا اور اُس کے ٹخنے کا زخم صاف کرنے لگا۔

”میری ماں نے مجھے جنم دیا اور میرا نام لقمان رکھا“ — بوڑھے موسیقار نے کہا — ”تین برس بعد شاید میرا دل بہلانے کے لیے یا مجھے ساری عمر تڑپانے کے لیے خدا نے مجھے ایک بہن دی۔ ماں نے اس کا نام شاہدہ بی بی رکھا۔ مجھے ننھی سی اس گڑیا کے ساتھ بہت پیار تھا۔ اُس کی خاطر میں نے ماں کے پاس سونے کی ضد چھوڑ دی اور ماں کی گود ننھی کے لیے خالی کر دی۔ ننھی بھوک سے روتی تو میں ماں کو، جہاں کہیں وہ ہوتی، پکڑ لاتا — ’ماں جی! ماں جی! گڈی کو دودھ پلاؤ‘ — اور ماں ہنستی مسکراتی گڈی کو گود میں لے کر دودھ پلانے بیٹھ جاتی۔ میں دودھ پیتی گڈی کے پھول جیسے ہاتھوں سے کھیلتا رہتا....

”گڈی میرا کھلونا تھی۔ میں نے اس کے سوا اور کوئی کھلونا نہیں دیکھا جیدا بیٹے! ماں نے مجھے بہت پیار دیا ہے لیکن مجھے گڈی سے بہت پیار تھا۔ میرا باپ بہت غریب آدمی تھا لیکن ہمارے گھر میں پیار کا خزانہ تھا۔ باپ بمبئی کی بندرگاہ پر محنت مزدوری کرتا تھا۔ ہم تنگدست تھے لیکن ہمیں تنگدستی بھی پیاری لگتی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ میرے ماں باپ آپس میں کبھی لڑے ہوں....

”میں نو برس کا ہو گیا اور گڈی چھ برس کی۔ ایک صبح میرا باپ کام کے لیے گھر سے نکلا اور شام کو واپس نہ آیا۔ رات گزر گئی۔ اگلا دن بھی گزر گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے ماں کو پریشان اور بے چین دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس واقعہ کو ساٹھ برس گزر گئے ہیں۔ مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے۔ میری ماں نے مجھے کہا کہ تم اور گڈی گھر کھیلتے رہنا۔ میں تمہارے ابا کو لینے جا رہی ہوں۔ میں نے ماں سے کہا کہ تم جاؤ، میں گڈی کا خیال رکھوں گا۔ میں نے یہ بات جوانمردوں کی طرح کہی تھی....

”ماں جانے ہی والی تھی کہ میرا باپ آ گیا مگر ویسا نہیں تھا جیسا گھر سے نکلا تھا۔ اس کے کپڑے خون آلود تھے۔ دائیں کہنی سے ہاتھ تک بازو پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا اور ایک کپڑا گلے سے بندھا تھا جس میں اُس نے بازو ڈال رکھا تھا۔ اُس کا رنگ جو سانولا ہوا کرتا تھا، پیلا پڑ گیا تھا۔ ہم سب پر سناٹا طاری ہو گیا۔ باپ نے بتایا کہ جہاز پر بہت بڑے بڑے بکس چڑھاتے ایک بکس ایسا گرا کہ اُس کا بازو اُس کے نیچے آ گیا اور ہڈی ٹوٹ گئی۔ اُسے ہسپتال لے گئے۔ اُس کی ہڈی جگہ پر کر کے پٹی باندھ دی گئی اور اگلے روز اُسے ہسپتال سے نکال دیا گیا....

”ٹوٹے ہوئے بازو نے باپ کو بیروزگار کر دیا۔ دو ہی روز بعد گھر میں فاقے ہونے لگے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ ایک رات میرے ماں باپ یہ سمجھ کر آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ میں سو رہا ہوں۔ گڈی سو گئی تھی۔ میں جاگ رہا تھا۔ میری ماں باپ سے کہہ رہی تھی کہ تم تو کام کرنے سے رہے، بچوں کو بھوکا نہیں مارا جا سکتا، میں محنت مزدوری کے لیے باہر نکلتی ہوں۔ میرے باپ نے اُسے کہا — ”نہیں۔ زمانہ خراب ہے۔ تم

جوان ہو اور خوبصورت بھی ہو تمھارا باہر جا کر کام کرنا ٹھیک نہیں"...

"ماں اُسے یقین دلاتی رہی کہ عورت ایمان اور اخلاق کی پکّی ہو تو دنیا کا طاقتور مرد بھی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ دونوں اس مسئلے پر باتیں کرتے رہے اور میری آنکھ لگ گئی۔ اگلی صبح ماں کام کے لیے چلی گئی شام کو ایک روپیہ کما لائی پھر وہ ہر روز کام پر جاتی اور روپیہ سوا روپیہ کما لاتی۔ یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب روپے کی پوری قیمت ملا کرتی تھی۔ چار آنے میں گھر کی دال روٹی چل جایا کرتی تھی۔ ماں دو چار آنے میں ہانڈی روٹی کرتی اور باقی پیسے الگ رکھ دیتی۔ باپ گھر میں درد سے کراہتا رہتا۔ تکلیف کے باوجود اُس نے مجھے اور گڈی کو ماں کی غیر حاضری محسوس نہ ہونے دی۔ اس نے ہمیں ماں کا پیار دیا...

"دو مہینوں میں ماں نے اتنے پیسے بچا لیے جن سے باپ کی ٹوٹی ہوئی ہڈی جڑوائی جا سکتی تھی۔ ماں اسے ایک جرّاح کے پاس لے گئی۔ اس نے ہڈی بٹھا دی۔ زخم کی حالت ٹھیک نہیں تھی لیکن جرّاح نے امید دلائی کہ زخم بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ ہمارے گھر میں خوشیاں لوٹ آئیں۔ باپ بہت خوش تھا کہ وہ کام کرنے کے قابل ہو جائے گا مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا"

بوڑھا موسیقار جیدا کے ٹخنے کا زخم صاف کر کے اس پر ایک پوڈر چھڑک رہا تھا اور کہہ رہا تھا —

"تمھارا یہ زخم تو کچھ بھی نہیں۔ میں نے اپنے باپ کے بازو کا زخم دیکھا تھا تو میں کانپ اٹھا تھا۔ میری ماں ہر رات اُس کے زخم سے پٹی کھولتی، زخم صاف کرتی اور اس پر کوئی دوائی لگاتی تھی۔ آج تمھارا یہ زخم دیکھ کر مجھے باپ کا زخم یاد آ گیا ہے...... ہم یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ ہمارا باپ ٹھیک ہو جائے گا تو وہ کام پر جایا کرے گا اور ماں ہمارے ساتھ گھر رہا کرے گی، مگر ایک روز ماں شام کو آنے کی بجائے دوپہر کو ہی گھر آ گئی۔ وہ رو رہی تھی۔ میرا باپ لیٹا ہُوا تھا۔ ماں اُس کے اوپر گر کر ہچکیاں لینے لگی....

"میں اور گڈی بہت چھوٹے تھے۔ ماں کو روتا دیکھ کر ہم بھی رونے لگے۔ ہمیں ماں کے رونے کی وجہ معلوم نہ ہو سکی۔ اُس نے میرے باپ کو کچھ بتایا تھا۔ باپ اٹھا اور چولہے کی طرف گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُس نے وہاں سے چھری اٹھائی تھی اور وہ دوڑتا باہر نکل گیا تھا۔ میری ماں بیٹھی رو رہی تھی۔ اُس نے مجھے اور گڈی کو روتے دیکھا تو ہم دونوں کو بازوؤں میں لے کر ہمیں چپ کرانے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا کہ تمھارا "ابا" کہاں ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ وہ چھری لے کر باہر نکل گیا ہے....

"ماں نے ہمیں الگ کر کے کہا — 'کیا کہا؟ چھری لے کر؟' — اور وہ بھی دوڑتی باہر نکل گئی۔ میں اور گڈی دروازے میں جا کھڑے ہوئے۔ تھک گئے تو بیٹھ گئے۔ دن گزرتا گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ماں روتی ہوتی واپس آئی۔ اڑوس پڑوس کے لوگ جو ہماری طرح غریب اور مزدور تھے، اکٹھے ہو گئے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں لوگوں کی باتیں سننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر پتہ چلا کہ ایک آدمی نے میری ماں پر دست درازی کی تھی اور ماں کو اپنی عزت بچانے کے لیے خاصی لڑائی لڑنی پڑی تھی۔ اس آدمی نے بھرے بازار میں لوگوں سے کہا تھا کہ اس عورت کا خاوند کام سے معذور ہو گیا ہے اور یہ بدکاری سے پیسہ کما رہی ہے....

"میرا باپ بہت پیارا اور مرا مرا سا آدمی تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اس قدر غیرت مند اور دلیر ہے۔ وہ چھری لے کر باہر نکل گیا تھا۔ اس نے بازار میں جا کر اُس آدمی کو ڈھونڈ لیا اور اُس پر حملہ کیا لیکن چھری کا ایک ہی وار کر سکا۔ لوگوں نے اُسے پکڑا اور پولیس کے حوالے کر دیا۔ وہ آدمی روپے پیسے والا تھا۔ وہ

میری ماں جیسی عورتوں اور میرے باپ جیسے آدمیوں کو مزدوری دیا کرتا تھا، اس لیے پولیس اُس کی اور انصاف اُس کا تھا....

"جیدا بیٹے! میں تمھیں نہیں بتا سکتا کہ میری ماں کا اور ہم دونوں بچوں کا گھر میں کیا حال ہوتا تھا۔ ہم وکیل کہاں سے کرتے۔ باپ کو سات آٹھ روز بعد تھانے کی حوالات سے جیل کی حوالات میں بھیج دیا گیا۔ ابھی مقدمہ چلا ہی تھا کہ پتہ چلا کہ میرے باپ کے بازو کا زخم بہت خراب ہو گیا ہے اور وہ جیل کے ہسپتال میں ہے۔ پندرہ بیس روز بعد اطلاع آئی کہ میرا باپ مر گیا ہے۔ اُس کے زخم میں شاید زہر پیدا ہو گیا تھا جو سارے جسم میں پھیل گیا اور موت کا باعث بنا....

"محلّے کے چند آدمی میری ماں کے ساتھ چارپائی لے کر گئے اور میرے باپ کی لاش لے آئے۔

تم نے اپنی ماں کا جنازہ دیکھا تھا۔ میں نے اپنے باپ کا جنازہ دیکھا۔ ہماری خوشیاں باپ کے ساتھ دفن ہو گئیں۔ ماں نے میرے اور گڈی کے لیے اپنا چین اور سکون قربان کر دیا مگر ایک ماہ بعد ماں کام پر گئی اور واپس نہ آئی۔ وہ آج تک نہیں آئی۔ میری عمر ایک کم ستّر برس ہو گئی ہے۔ ماں تو کبھی کی مر چکی ہو گی لیکن وہ آج بھی مجھے اُسی طرح نظر آتی ہے جس طرح میں نے اُسے دیکھا تھا — بھولی بھالی سی، جوان اور خوبصورت لڑکی۔ اپنے بچوں کی خاطر باہر نکلی اور...."

بوڑھے موسیقار نے ہچکی سی لی اور اُس کے ہونٹوں پر بڑی ہی اداس مسکراہٹ آ گئی۔ وہ جیدا کے ٹخنے کے زخم کو صاف کر کے اُس پر دوائی لگا چکا تھا۔ چپ ہو کر اس زخم کو دیکھتا رہا۔ بولا — "اس پر پٹی نہ باندھنا، خراب ہو جائے گا" — اُس نے آہ بھری اور کہنے لگا — "جسم کے زخم ٹھیک ہو جایا کرتے ہیں، دل کے زخم ہمیشہ ہرے رہتے ہیں۔ رِستے رہتے ہیں.... میری عمر دس سال سے زیادہ ہو چکی تھی اور گڈی سات سال کی ہو گئی تھی۔ وہ جوں جوں بڑی ہوتی جا رہی تھی، ماں کی طرح خوبصورت نکلتی آ رہی تھی۔"

"غریب کی بیٹی کو خوبصورت نہیں ہونا چاہیئے" — جیدا نے کہا — "تمھاری ماں کو اُسی آدمی نے غائب کیا ہو گا جس نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا اور جس پر تمھارے باپ نے چھری سے حملہ کیا تھا۔ تم جوان ہوتے تو اس کی گردن پر جا چھری رکھتے۔ تمھاری ماں برآمد ہو جاتی۔"

"میں جوان ہونے سے پہلے ہی جوان ہو گیا تھا" — بوڑھے ستار نواز نے اپنے دونوں ہاتھ جیدا کے سامنے کر کے کہا — "میرے یہ ہاتھ جن کی انگلیاں ستار کے تاروں پر رقص کرتی اور ان نغموں کو جنم دیتی ہیں جنہوں نے تم جیسے پتھر دل ڈاکو کو مسحور کر لیا ہے، یہ ہاتھ اُس آدمی کے خون سے رنگے ہوئے ہیں جسے قانون سزا نہیں دے سکا تھا۔ اسے ان ہاتھوں نے سزائے موت دی تھی.... جیدا بیٹے! میں پیدائشی موسیقار نہیں ہوں۔ میں تمھاری دنیا کا آدمی ہوں جسے لوگ زمین دوز دنیا کہتے ہیں۔ تم استاد ہو۔ میں بھی استاد رہا ہوں۔"

جیدا نے اُسے چونک کر دیکھا۔

"تمھارے دل کا درد میرے سوا کوئی نہیں جانتا" — بوڑھے نے کہا — "تم بمبئی میں رہے ہو۔ اگر کسی سے پوچھتے کہ بمبئی میں کیسے کیسے استاد ہو گزرے ہیں تو لوگ "کلّو بمبیا" کا نام بھی لیتے۔ میرا نام لقمان تھا۔ ماں باپ نے مجھے لوقی منّا کہا اور بمبئی کی سوسائٹی نے مجھے "کلّو بمبیا" بنا دیا.... میں تمھیں سنا رہا تھا کہ میرا

باپ میری ماں کی عزت پر قربان ہو گیا۔ میری ماں اپنے بچوں پر قربان ہو گئی اور میں نے اپنا بچپن، کھیل کود اور ماں باپ کی یادیں اپنی بہن گڈی پر قربان کر دیں۔ میں نوکری کے لیے گھر گھر پھرا مگر کسی نے نہ رکھا۔ دو گھروں میں مجھ سے میرے ماں باپ کے متعلق پوچھا گیا۔ میں نے بتایا تو دونوں گھروں سے مجھے دھتکار کر نکال دیا گیا اور کہا گیا کہ یہ اُس عورت کا بیٹا ہے جس کے آشنا کو اُس کے باپ نے چھری سے زخمی کیا تھا۔ ایک گھر میں کہا گیا 'ایسے لڑکوں کو گھر کے قریب سے بھی نہ گزرنے دو۔ یہ چوروں بدمعاشوں کی اولاد ہے'....

"چھوٹے سے ایک ہوٹل میں جو دراصل تھرڈ کلاس سی کینٹین تھی، مجھے پانچ روپے ماہوار اور روٹی کپڑے پر نوکری مِل گئی۔ میں پھولا نہ سمایا۔ صبح سے رات گئے کھڑے ہوتے تک میں گاہکوں کے آگے چائے اور کھانا رکھتا اور جھوٹے برتن اٹھا اٹھا کر دھونے والے کو دیتا۔ جسم ٹوٹ جاتا تھا لیکن مجھے خوشی ہوتی تھی کہ میں اپنی بہن کو محنت کی حلال کمائی کھلا رہا ہُوں۔ اپنے ماں باپ کو میں نے دل میں دفن کر دیا اور گڈی سے اتنا پیار کیا کہ وہ بھی ماں باپ کو بھولنے لگی....

"ہوٹل کا مالک نیک آدمی تھا۔ ایک روز اُسے بتایا کہ میں کیوں نوکری کر رہا ہُوں۔ گڈی کے متعلق بتایا کہ وہ سارا دن گھر میں اکیلی رہتی ہے۔ مالک نے کہا کہ اپنی بہن کو ساتھ لے آیا کرو۔ اُسے بھی اپنے ساتھ کھانا کھلایا کرو اور شام ہوتے ہی بہن بھائی گھر چلے جایا کرو.... میں یہی چاہتا تھا۔ اب گُڈی بھی میرے ساتھ آنے لگی۔ وہ کھیلتی رہتی اور میں اپنے کام میں لگا رہتا۔ میں اُسے ہوٹل سے کھانا کھلاتا۔ وہ جو فرمائش کرتی وہ پوری کرتا۔ اسے اچھے اچھے کپڑے پہناتا....

"اس ہوٹل میں کام کرتے چھ سات مہینے گزر گئے۔ ایک روز میں دوپہر کا کھانا کھانے لگا تو گڈی کو بلانے نکلا۔ وہ باہر نہ ملی۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ کہیں بھی نظر نہ آئی۔ میں دوڑا دوڑا گھر گیا۔ چابی تو میرے پاس تھی۔ گڈی وہاں بھی نہیں تھی۔ اِدھر اُدھر کے گھروں میں جا کے دیکھا۔ گڈی نہ ملی.... وہ آج تک نہیں مِلی"۔

رات گزرتی جا رہی تھی۔ بوہری بازار ابھی تک جل رہا تھا۔ فائر بریگیڈ نے بہت حد تک آگ پر قابو پا لیا تھا۔ کراچی پر خوف و ہراس طاری تھا۔ اس آگ کا جلا ہُوا جیدا ایک دل جلے کی زندگی کی کہانی سن رہا تھا۔

"میری گڈی بمبئی کی اندھی گلیوں میں کھو گئی۔ ہوٹل کے مالک نے تھانے میں رپورٹ درج کرادی"

—بوڑھا موسیقار کہہ رہا تھا— "تم پولیس کو اچھی طرح جانتے ہو۔ مجھے صرف ایک بار تھانے بلایا گیا۔ تھانیدار نے کہا، جا لڑکے! تیری بہن مل گئی تو تجھے اطلاع کر دیں گے۔ میں بہت رویا اور اس کے آگے ہاتھ جوڑے کہ وہ میری بہن کو ڈھونڈ نکالے۔ اس نے مجھے تسلی دی اور چلتا کیا....

"جس طرح تم روٹی کے ایک ٹکڑے کی خاطر ایک استاد کے ہاتھ چڑھ گئے تھے، اسی طرح میں اپنی گُڈی کی تلاش میں بھٹکتا ان لڑکوں سے جا ملا جو گینگسٹر کہلاتے تھے۔ ان کا کام یہ تھا کہ رات کے وقت سنسان گلیوں میں چھپ جاتے۔ کوئی اکیلا دوکیلا آدمی گزرتا تو اسے روک کر اس کی جیب خالی کرا لیتے۔ میرے پاس کٹیا جیسا اپنا مکان تھا۔ ہم نے اسے خفیہ اڈہ بنا لیا۔ وہاں جُوا بھی ہونے لگا۔ میں نے ہوٹل کی نوکری چھوڑ دی۔ ایک بار ہم تین لڑکے پکڑے گئے۔ ہم نے رہزنی کی تھی۔ ہم تینوں کو تین تین ماہ سزائے قید ہُوئی۔ اس سے یہ فائدہ ہُوا کہ پولیس اور جیل کا خوف دل سے اُتر گیا....

"میں تمہیں کیا سناؤں بیٹا! تم اسی راستے کے مسافر ہو۔ جو منزلیں تم نے طے کی ہیں وہ میں نے تین برسوں میں طے کر لیں۔ عمر ابھی چودہ سال تھی۔ ایک روز ایک آدمی مِلا۔ میں اُسے جانتا تھا۔ وہ جرائم پیشہ تو نہیں تھا لیکن اُس کا شمار بدمعاشوں میں ہوتا تھا۔ اس نے مجھے کہا— 'تم اتنے بدمعاش بنے پھرتے ہو۔ اپنی ماں کی بے عزتی اور باپ کی موت کا تو انتقام لو'— معلوم نہیں اُس نے مجھے یہ الفاظ کیوں کہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ میں اُس آدمی کو نہیں جانتا۔ اس نے کہا کہ آؤ تمہیں دکھاتا ہوں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا اور وہ آدمی دکھایا۔ مجھے آج تک معلوم نہیں کہ وہ کیا کام کرتا تھا۔ میں نے اُسے دیکھا اور اُس کا گھر بھی معلوم کر لیا....

"اُس روز اپنے دو دوستوں کو بتایا کہ اس آدمی نے میری ماں کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا اور مجھے اُس نے یتیم کیا ہے، اور میں اس سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔ میرے یہ دونوں دوست میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئے.... دو روز گزر گئے۔ ہم تینوں کے پاس لمبے لمبے چاقو تھے۔ شام کے بعد ہم اُس کے گھر کے سامنے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ اُس کے گھر میں اندھیرا تھا۔ دروازہ دیکھا۔ تالا لگا ہُوا تھا۔ ہم میں ایک لڑکا دماغی طور پر بہت ہوشیار تھا۔ اُس نے ایک آدمی سے پوچھا کہ یہ صاحب کہاں چلے گئے ہیں۔ جواب مِلا کہ اس شرابی کبابی کا کیا پتہ کہاں چلا گیا ہے۔ نہ آئے تو ساری رات نہ آئے۔ آئے گا تو شراب کے نشے میں جھومتا آئے گا....

"اتنی لمبی باتوں کو چھوڑو۔ ہم اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے رہے۔ کوئی دو گھنٹوں بعد وہ آگیا۔ تالا کھول کر اندر چلا گیا۔ بمبئی کا وہ علاقہ زیادہ آباد نہیں تھا۔ وقت بھی ایسا ہو گیا تھا کہ علاقہ سنسان تھا۔ ہم تینوں اُس کے پیچھے اندر چلے گئے۔ وہ دوسرے کمرے میں جا چکا تھا۔ ہم نے اپنے اپنے منہ پر رومال چڑھا رکھے تھے۔ آنکھیں ننگی تھیں۔ ہم اس کمرے میں گئے۔ فرنیچر اور کمروں کی سجاوٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ امیر آدمی ہے۔ وہ ابھی کھڑا تھا۔ ہمیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ہمارے ہاتھوں میں کھلے ہوئے چاقو تھے....

"میں نے اپنے باپ کا نام لے کر کہا— 'اعتبار خان کی بیوی کہاں ہے؟'— اُس نے کہا کہ وہ کسی اعتبار خان کو یا اُس کی بیوی کو نہیں جانتا۔ ہم تینوں نے اسے گھیر لیا اور چاقوؤں کی نوکیں اُس کے جسم کے ساتھ لگا دیں۔ میں نے کہا— 'زندہ رہنا چاہتے ہو تو بتا دو اعتبار خان کی بیوی اور اُس کی بیٹی کہاں ہیں'— اس کے ساتھ ہی میں نے چاقو کی نوک اُسے چبھوئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے تسلیم کر لیا کہ میری ماں اور بہن کو اُسی نے اغوا کرایا تھا اور اس نے دونوں کو بیچ دیا ہے لیکن میری ماں کے متعلق اُس نے بتایا کہ اُسے خریدنے والوں نے اسے ایک کمرے میں رکھا۔ رات کو اس نے اپنے آزار بند کا پھندہ بنا کر خودکشی کر لی تھی۔ میری بہن کے متعلق اُس نے بتایا کہ وہ دلّی میں کہیں ہو گی....

"تمہارے لیے یہ باتیں انوکھی نہیں۔ تم نے بھی ناز کو خریدا تھا۔ تم نے بھی بچیاں اور نوجوان لڑکیاں اغوا کرائی ہیں۔ اس آدمی کا ظاہری کاروبار کچھ اور تھا لیکن وہ دراصل بردہ فروشوں کی دنیا کا تاجر تھا۔ میری ماں اور بہن کو اُس نے انتقاماً اغوا کرایا تھا کیونکہ میرے باپ نے اُس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اُس نے جب میری ماں اور بہن کے متعلق یہ انکشاف کیے تو خون میرے دماغ کو چڑھ گیا۔ مجھے اپنی بہن کے خریداروں کا اتا پتہ پوچھنا چاہیے تھا مگر میں ناتجربہ کار تھا۔ میں نے پاگل ہو کر چاقو اُس کی پسلیوں کے نیچے پوری

طاقت سے مارا اور چاقو کو ایک طرف جھٹکا دیا۔ اُس کا پیٹ کٹ گیا۔ وہ آگے کو جھکا تو میرے دونوں دوستوں نے اس کے پہلوؤں میں چاقو اتار دیے۔ وہ گر پڑا....

"میرے اُس دوست نے جو بہت ہوشیار تھا، تپائی پر تالہ پڑا دیکھ لیا۔ اُس نے تالا اٹھا لیا۔ ہم تینوں نے اُس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ریچھ ساڑھے چھ سو روپیہ نکلا۔ ہم نے بتی بجھائی۔ باہر آئے اور باہر کے دروازے کو تالا لگا کر غائب ہو گئے۔ ہم تین روز بعد اُس کے گھر کے سامنے سے گزرے، وہاں تالا لگا ہُوا تھا۔ وہ بدنام آدمی تھا اِس لیے کسی نے بھی معلوم نہ کیا کہ وہ کہاں ہے۔ چوتھے دن اڑوس پڑوس والوں نے بدبو سے تنگ آ کر واویلا بپا کیا تو اُس کا تالا توڑا گیا۔ پولیس نے اُس کی لاش نکالی ہم کئی دن دیکھتے رہے۔ پولیس تفتیش کرتی رہی اور کوئی قاتل گرفتار نہ ہُوا....

"میری ماں تو مر چکی تھی۔ گڈی زندہ تھی اور وہ دلّی میں تھی۔ ہم نے مقتول کی جیب سے جو رقم نکالی تھی وہ تینوں نے بانٹ لی۔ میں نے مکان دوستوں کے حوالے کر دیا اور دلّی چلا گیا۔ میں بیوقوف تھا۔ مجھے صرف یہ سہولت حاصل تھی کہ میں جرم اور غنڈہ گردی کی دنیا کا آدمی تھا۔ میں عصمت فروشوں اور ناچنے گانے والیوں میں اجنبی نہیں تھا۔ میں اُن کی زبان میں باتیں کر سکتا تھا۔ ان کے اشارے اور ان کی خفیہ بان بھی سمجھتا تھا۔ میں نے وہ سارا بازار چھان مارا۔"

"تم واقعی بیوقوف تھے بڑے میاں!" —— جیدا نے کہا —— "نازو کو کوئی کراچی میں ڈھونڈ سکتا ہے؟"

"نہیں ڈھونڈ سکتا" —— بوڑھے نے کہا —— "میں بیوقوف نہیں پاگل ہو گیا تھا۔ رات کو خیال آ جاتا کہ میری گڈی عصمت فروشوں کے پاس ہے تو اٹھ باہر کو دوڑ پڑتا تھا.... میں نے پانچ سال دلّی میں گزارے جیبیں کاٹیں۔ چوریاں کیں۔ جوا تو میرا شغل تھا۔ جوا کھلانے کا تجربہ حاصل کیا اور خوب کمایا اور سب اجمیری گیٹ میں اڑایا۔ دلّی کی ہر ناچنے گانے والی کے ہاں گیا مگر مجھے اپنی گڈی نظر نہ آئی....

"میری عمر بیس برس ہو چکی تھی اور میں دلّی کے نامی گرامی داداگیروں میں مقبول ہو چکا تھا۔ میرے اندر سکون نہیں تھا۔ چین نہیں تھا۔ میری اپنی ضرورت صرف اتنی تھی، روٹی کپڑا اور شراب۔ چرس سے مجھے نفرت رہی ہے۔ میری ایک عادت یہ تھی کہ میں طوائفوں کے ہاں جاتا تھا اور صرف باتیں کر کے انہیں پیسے دے دیتا اور واپس آ جاتا۔ مجھے ان کے جسموں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی.... جانتے ہو کیوں؟ —— مجھے ہر طوائف کا چہرہ گڈی کا چہرہ لگتا تھا۔ طوائفیں میری واقف ہو گئی تھیں۔ وہ جان گئی تھیں کہ میں بمبئی کا گینگسٹر اور دلّی کا دادا ہوں۔ وہ مجھے پیسے واپس کرتی تھیں تو میں کہتا تھا کہ میں بدکاری کے لیے نہیں، دو باتیں کرنے اور سننے کے لیے آتا ہوں....

"اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں موسیقار اور ستار نواز کیسے بنا۔ گانے بجانے کا شوق شروع سے تھا۔ ایک رات ایک گھر میں چوری کے لیے گیا۔ تمہاری طرح میں نے بھی دو مُخبر لڑکے رکھے ہوئے تھے۔ ایک نے بتایا کہ گانے والی بیسواؤں کو گانا سکھانے والا ایک استاد ہے۔ اُس کے گھر بہت رقم ہے جو وہ الماری میں رکھتا ہے۔ رات ابھی آدھی نہیں ہُوئی تھی۔ میں استاد کے گھر میں آسانی سے داخل ہو گیا کیونکہ دروازہ کھلا تھا۔ وہ ایک کمرے میں فرش پر بیٹھا ستار بجا رہا تھا۔ وہ بوڑھا تھا اور لاش کی مانند لاغر۔ اُس نے مجھے دیکھا اور سر کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا....

"میں نے پیشہ ور چوروں کی طرح اُسے چاقو دکھا کر کہا —— 'میں بیٹھنے نہیں آیا، کچھ لینے آیا ہوں۔ رقم میرے حوالے کر دو' —— اُس نے ایک الماری کی طرف اشارہ کر کے بے نیازی سے کہا —— 'وہ کھولو۔ درمیان والے خانے میں کپڑوں کے نیچے کچھ پیسے پڑے ہیں۔ جاؤ لے جاؤ' —— میں نے الماری کھولی۔ کپڑوں کے نیچے ہاتھ پھیرا تو وہاں دس دس اور پانچ پانچ کے بہت سے نوٹ پڑے تھے۔ وہ ستار میں مگن رہا جیسے اُسے خبر ہی نہ ہو کہ اُس کا گھر لُٹ رہا ہے۔ میرا ہاتھ رک گیا اور میں کبھی یہ سوچتا کہ میں بزدل ہوں جو مریل سے ایک موسیقار کو لوٹ رہا ہوں۔ پھر خیال آتا کہ میں چور ہوں، ڈاکو ہوں۔ یہ بوڑھا مریض میرا کیا بگاڑ سکتا ہے....

"میں نے نوٹ نکال لیے۔ ایک ہاتھ میں نوٹ اور دوسرے میں چاقو تھا۔ وہ ابھی تک ستار میں مگن تھا۔ میں جب الماری سے ہٹ کر دروازے کی طرف چلا تو وہ ستار رکھ کر آہستہ آہستہ اُٹھا۔ میں اُس کے قریب سے گزرنے لگا تو اُس نے اپنا دایاں ہاتھ اس طرح میری چاقو والی کلائی پر مارا جس طرح قصائی ہڈی توڑنے کے لیے چھُرا مارا کرتا ہے۔ یوں لگا جیسے میری کلائی ٹوٹ گئی ہو۔ چاقو میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ اُس نے ایک گھونسہ میرے پسلیوں کے نیچے مارا۔ میرا سانس رک گیا اور میں دوہرا ہو گیا۔ اُس نے چھُرے کی طرح ایک ہاتھ میری گردن پر مارا۔ میں مُنہ کے بل گرا۔ یوں لگا جیسے میری گردن پر ڈنڈا پڑا ہو۔ نوٹ بھی میرے ہاتھ سے گر پڑے اور بکھر گئے....

"اُس نے میرے سر کے بال مٹھی میں لے کر اتنی زور سے کھینچے کہ میں اٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس نے قصائی کے چھُرے کی طرح ایک ہاتھ میری شہ رگ پر مارا۔ یقین کرنا کہ میں پیچھے کو جا پڑا۔ اُس نے میرا چاقو اٹھا لیا۔ یہ سب کچھ صرف دو سیکنڈ میں ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ مشین کی طرح چلے تھے۔ مجھے سنبھلنے اور سوچنے کا موقع ہی نہ ملا۔ اُس نے گرج کر کہا —— 'اُٹھو' —— میں اٹھا تو اُس نے کہا —— 'یہ نوٹ اٹھا لو' —— میں نے سدھائے ہُوئے جانور کی طرح نوٹ اٹھا لیے۔ اُس نے کہا —— 'اپنی جیب میں ڈال لو' —— میرا ہاتھ رک گیا۔ اُس نے پھر کہا —— 'میں کہتا ہوں یہ رقم اپنی جیب میں ڈال لو'....

"میں نے نوٹ اپنی جیب میں ڈال لیے تو اُس نے بیٹھنے کو کہا اور پوچھا —— 'کون ہو تم؟ کیا نام ہے تمہارا؟' —— میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس نے مجھے کس اثر میں لے لیا تھا۔ میں تنومند جوان اور وہ لاش کی طرح بُوڑھا جسم مگر اس کے سامنے میری طاقت سلب ہو گئی جیسے رگوں میں خون جم گیا ہو.... پھر یوں ہُوا کہ جس طرح تم نے مجھے اپنے بچپن سے لے کر اب تک کی اپنی زندگی کی کہانی سنائی تھی، اسی طرح میں نے اُسے اپنی زندگی کی کہانی سنا دی۔ یہی کہانی جو میں تمہیں سنا رہا ہُوں۔"

جیدا اس کی کہانی میں گم ہو گیا تھا۔ رات گذرتی جا رہی تھی۔

بوڑھا کہہ رہا تھا —— "بات بڑی لمبی ہے بیٹا! میں ذرا مختصر کر دیتا ہوں۔ وہ بُوڑھا مجسّم پیار تھا۔ اُس نے ایک نوجوان گانے والی کے ساتھ شادی کی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ وہ بہت خوبصورت تھی۔ وہ ستار بجایا کرتا تھا۔ ایک بار ایک مُسلمان نواب نے اس کی بیوی کی شہرت سُن کر انہیں اپنے ہاں بلایا۔ نواب لڑکی پر فریفتہ ہو گیا اور اُسے منہ مانگی قیمت پیش کی جو دونوں نے ٹھکرا دی۔ وہ واپس آ گئے اور ایک

ہی مہینے بعد یہ ناچنے والی اغوا ہوگئی۔ یہ آدمی نواب کے ہاں گیا جہاں سے اسے نکال دیا گیا۔ پولیس کے پاس گیا مگر اس کی بیوی برآمد نہ ہو سکی....

"یہ آدمی دل برداشتہ ہو کر گھر میں قید ہوگیا۔ چونکہ استاد ستار نواز تھا اس لیے ناچنے گانے والوں نے اُسے گوشۂ تنہائی سے نکال لیا لیکن اُس نے کسی ایک کی ملازمت نہ کی۔ اُس نے اپنے آپ کو پکے راگ میں ڈبو دیا۔ اس نے شادی کی نہ سوچی۔ ستار ہی اس کی بیوی، اس کی محبوبہ اور اُس کی تنہائی کی ساتھی تھی۔ اُس نے گانے والیوں کو گانے کی تربیت دینی شروع کر دی۔ کسی نے جو دیا اُس نے لے لیا۔ اُسے روپے پیسے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی....

"میں نے اسے اپنی بہن کا حلیہ بتایا۔ نام بتایا۔ اُس نے یاد کرنے کی کوشش کی اور کہنے لگا کہ تین چار سال گزرے وہ ایک بڑی خوبصورت لڑکی کو کتھک ناچ سکھاتا رہا تھا۔ شاید وہ اپنا نام شاہدہ یا گڈی بتاتی تھی۔ اتنا یاد ہے کہ وہ بمبئی سے آئی تھی یا لائی گئی تھی لیکن وہ اب دلّی میں نہیں.... اس موسیقار نے مجھے اپنا مرید بنا لیا۔ میں اس کی خدمت کرنے لگا۔ پہلی ملاقات میں اُس نے مجھے کہا تھا کہ میں سارے نوٹ اپنی جیب میں ڈال لوں میں نے جیب میں ڈال لیے تھے لیکن نکال کر اُس کے آگے رکھ دیئے۔ اس نے مجھے کہا تھا ــــ چور اور گناہگار دلیر نہیں ہوا کرتے۔ ان میں جسمانی طاقت کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، وہ مجھ جیسے بوڑھوں کے ہاتھوں پٹ جاتے ہیں۔ طاقت ایمان اور اخلاق کی ہوتی ہے۔ تم مارے مارے نہ پھرو...."

"میں رو پڑا۔ وہ میرے غم اور گمراہی کی داستان سن چکا تھا جس طرح میں نے تمہیں کہا تھا کہ میرے پاس آیا کرو اور اپنے دل کی سنایا کرو، اسی طرح اُس نے مجھے کہا اور اتنے پیار سے کہا کہ میں اُسی کا ہو رہا۔ اُس نے میرا زہر پیار سے مار ڈالا"

"یہی شکوہ مجھے تم سے ہے" ــــ جیدا نے کہا ــــ "مجھے تمہارے پیار نے بزدل بنایا ہے"

"جسے تم بزدلی کہتے ہو وہ بہت بڑی بہادری ہے" ــــ بوڑھے موسیقار نے کہا ــــ "تم آگے چل کر محسوس کرو گے۔ انسان کو خدا نے صرف نیکی کا جذبہ دیا ہے۔ گناہ کا جذبہ انسانوں کی پیداوار ہے۔ گناہ بھٹکی ہوئی نیکی کو کہتے ہیں۔ نیکی دب جاتی ہے اور ایک نہ ایک دن اُبھر آتی اور گناہوں کو دبا لیتی ہے۔ تم ایک بچے کو پال رہے ہو جس کا کوئی باپ نہیں۔ تم اُسے اٹھا نہ لاتے تو اُس کی ماں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیتی۔ اگر زندہ رہتا تو وہ چور اچکا یا بھکاری بنتا.... تم نے آج اپنے آپ کو آگ میں پھینک کر ایک بچے کو آگ سے نکالا ہے.... کیوں؟ ذرا سوچو، کیوں؟ تمہارے دل میں کوئی لالچ نہ تھا۔ تمہارے اندر وہ انسان زندہ ہے جو نیک ہے۔ اسے پیار کی غذا ملی تو وہ تنومند ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اب جو تم کہتے ہو کہ تمہارا زہر مار دیا گیا ہے، یہ دراصل وہ انسان زندہ ہوا ہے جسے تم نے مار رکھا تھا"

"تم اپنی کہانی سنا رہے تھے" ــــ جیدا نے کہا۔

"ہاں، میں سنا رہا تھا" ــــ بوڑھے موسیقار نے کہا ــــ "کہ میں اس موسیقار کا مرید ہوگیا، پھر میں نے اس سے ستار سیکھنی شروع کی۔ راگ راگنیاں سیکھیں اور اُس کے پیار نے مجھے غنڈوں کے استاد کی بجائے راگ رنگ کا استاد بنا دیا۔ دس گیارہ برس بعد وہ اپنی گدّی میرے سپرد کر کے اور اپنی بیوی کی یاد

دل میں لیے اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ میں نے اس کی گدّی کا احترام کم نہ ہونے دیا۔ میرے پاس جو گانے والی آتی تھی اسے میں گڈی سمجھتا تھا۔ ہر گانے والی مجھے اپنا پیر استاد مانتی تھی.... اور اس طرح میں پیار اور موسیقی کی جنّت میں داخل ہوگیا....

"میں اگست ۱۹۴۷ء میں کراچی آگیا تھا۔ ہندوستان کے کئی شہروں کی ناچنے گانے والیاں یہاں آگئیں۔ میں پہلے تو ٹھکانے کے لیے بھٹکتا رہا۔ ان لوگوں نے مجھے اپنے ہاں جگہ دی لیکن مجھے یہ مکان زیادہ پسند آیا ہے۔ میرے پاس وہی دلّی والی رونق لگ گئی اور میں پیار اور موسیقی کی زندگی میں رواں دواں ہوگیا"

بوڑھے موسیقار نے دیکھا کہ جیدا جو تھوڑی دیر پہلے لیٹ گیا تھا، گہری نیند سو گیا ہے۔ بوڑھا مسکرایا اور زیرِ لب بولا ــــ "تم نے منزل پا لی ہے.... بھٹک بھٹک کر!"

جس وقت جیدا بوڑھے موسیقار کی کہانی سُن رہا تھا، اُس وقت ناز بیتابی سے اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ جیدا زخموں کی مرہم پٹی کے لیے گیا ہے۔ اُسے جلدی واپس آنا چاہیے تھا مگر رات بہت گزر گئی تھی، وہ نہیں آیا تھا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔

کوئی مکان میں داخل ہوا۔ ناز دوڑتی باہر نکلی۔ اُسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ وہ جیدا نہیں، مُنّا اور ٹیپو تھے۔ وہ جھومتے آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے دو لڑکے تھے جنہوں نے دو گٹھڑیاں اور ڈونگ[illegible] اٹھا رکھے تھے۔ [illegible] اُس [illegible] میں سامان لے گئے جہاں چوری کا مال جایا کرتا تھا۔ لوہڑی بازار کی آگ میں انہوں نے خوب ہاتھ مارا تھا۔

"اُستاد کہاں ہے؟" ــــ ٹیپو نے ناز سے پوچھا۔

"آیا بھی ہے یا نہیں؟" ــــ مُنّے نے پوچھا۔

"آیا تھا" ــــ ناز نے بے رخی سے جواب دیا ــــ "کہیں چلا گیا ہے"

"کیا لایا ہے؟" ــــ ٹیپو نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں" ــــ ناز نے جواب دیا ــــ "وہ تو زخمی ہو کر آیا ہے۔ کہتا تھا اُس نے ایک بچے کو جلتی ہوئی آگ سے نکالا اور اُس کی ماں کے حوالے کیا ہے"

"کیا کہا؟" ــــ ٹیپو نے حیرت سے پوچھا ــــ "ایک بچے کو آگ سے نکالا ہے؟"

"ہاں" ــــ ناز نے کہا ــــ "بچے کی ماں نے اُسے سونے کا ہار دیا تھا"

"کہاں ہے وہ ہار؟" ــــ مُنّے نے پوچھا ــــ "تمہارے پاس ہوگا؟"

"نہیں" ــــ ناز نے جواب دیا ــــ "وہ ہار نہیں لایا۔ اُسی عورت کو دے آیا ہے"

ٹیپو نے لڑکھڑاتا ہوا قہقہہ لگایا اور بولا ــــ "وہ بکتا ہے اور تم بکواس کرتی ہو"

"کُتّے.... کمینے!" ــــ ناز نے جھلّا کر کہا ــــ "آنے دو اُسے تمہاری چمڑی اتروا دوں گی"

"میں کہتا ہوں وہ جو مال لایا ہے وہ ہمیں دکھا دو" ــــ ٹیپو نے کہا۔

"وہ کچھ نہیں لایا" ــــ ناز حقارت سے کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اُسی روز ٹیپو اور جیدا نے ایک دوسرے پر چاقو نکال لیے تھے۔ ٹیپو اور مُنّا دیکھ رہے تھے

کہ ناز اُن کے اُستاد کو بیکار کرتی جا رہی ہے۔ اسی پر ان دونوں کا جیدا کے ساتھ جھگڑا ہُوا تھا۔ اگر ایک لڑکا بوہڑی بازار کی آگ کی اطلاع نہ لاتا تو ان کا جھگڑا لڑائی تک یا جدائی تک پہنچ سکتا تھا۔ اب ناز نہیں کہہ رہی تھی کہ جیدا کچھ بھی نہیں لایا تو انہیں شک ہُوا کہ جیدا نے مال ناز کو دے دیا ہے۔ وہ دونوں اپنے کمرے میں چلے گئے

"اب حد ہو گئی ہے مُنّے!" — ٹیپو نے کہا — "اُستاد ہمیں دھوکہ دے رہا ہے۔ کیا تم مان سکتے ہو کہ وہ کچھ بھی نہیں لایا ہوگا؟ اس نے ایک بھی پاکٹ نہیں ماری ہوگی؟"

"اور دیکھو یہ لڑکی کیا جھوٹ بول رہی ہے" — مُنّے نے کہا — "جیدا نے ایک بچے کو آگ سے نکالا ہے اور اُس نے بچے کی ماں کو اُس کا دیا ہُوا ہار واپس کر دیا تھا۔"

دونوں پر شراب کا نشہ طاری تھا اور دونوں جرائم پیشہ تھے۔ شریف لوگ نہیں تھے۔ ان کے جھگڑوں کے فیصلے ان کے چاقو کیا کرتے تھے۔ ٹیپو اُٹھ کھڑا ہُوا اور مُنّے سے کہا کہ میرے ساتھ آؤ۔ دونوں ناز کے کمرے میں چلے گئے۔

"سُن چھوکری!" — ٹیپو نے ناز سے کہا — "آج کی رات گزر رہی ہے۔ ہم تمہیں کل کا دن اور کل کی رات دیتے ہیں۔ اس کے بعد تم ہمیں یہاں نظر نہ آؤ۔ اس حرامی بچے کو ساتھ لے جانا۔ اگر تم یہاں سے نہ گئیں تو ہم تمہیں کوٹھے پر پہنچا دیں گے۔ وہ تمھا اغلام آجاتے جو اُستاد بنا پھرتا ہے تو اُسے بتا دینا کہ میں نے اور مُنّے نے تمہیں کیا کہا ہے"

ناز سُن ہو کے رہ گئی۔

"اگر تم نے جیدا کو ہمارے ساتھ لڑانے کی کوشش کی تو اُس کی لاش بھی گم کر دی جائے گی" — مُنّے نے کہا — "اور تم....."

ناز کو یاد آگیا کہ وہ کہاں ہے اور یہ کون لوگ ہیں۔ اُس کا تو جیسے خون ہی خشک ہو گیا ہو۔ مُنّا اور ٹیپو باہر نکل گئے۔

جیدا بوڑھے ستار نواز کے گھر گہری نیند سویا ہُوا تھا اور ناز اُس کے انتظار میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔

جیدا کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُسے یوں لگا جیسے اُس نے خواب دیکھا ہو۔ وہ خوابوں کی دنیا میں جینے والا آدمی نہیں تھا۔ عادی مجرم جن کے شب و روز جرم اور جیل کے چکر میں گزرا کرتے ہیں وہ خواب نہیں دیکھا کرتے۔ ان کی نظر حقیقت پر ہوتی ہے۔ وہ صرف اُس چیز کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں جسے وہ دیکھ سکیں اور جسے وہ چُھو سکیں۔ وہ جب کسی گھر کا تالا توڑتے ہیں تو اُن کے ذہن میں جیل کا تالا ہوتا ہے۔ کسی ناچنے گانے والی کے کوٹھے پر جب وہ گھنگھروؤں کی یا کسی طوائف کی چوڑیوں کی جھنکار سنتے ہیں تو انہیں ہتھکڑیوں کے چھنّاکے یاد آجاتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اِس قسم کے خواب نہیں دکھایا کرتے کہ وہ ہتھکڑیوں سے بچے رہیں گے۔

جرائم پیشہ لوگ حقیقت پر نظر رکھتے ہیں اور ان کا وجود معاشرے کی بڑی تلخ حقیقت ہے مگر معاشرہ اس حقیقت سے جو اس کی اپنی پیداوار ہے، نظریں چراتا ہے اور اپنے کیے کی سزا بھگت رہا ہے۔

جیدا نے اپنے سر میں گرانی محسوس کی۔ اُسے یاد آگیا کہ رات اُس نے شراب نہیں پی۔ چرس کا بھی کش نہیں لگایا۔ اُس کی مجرمانہ زندگی میں یہ پہلی رات تھی کہ اُس نے شراب پی نہ چرس۔ کیوں؟ اُس کا ذہن اس سوال کے جواب میں اُلجھ گیا کہ رات کون سی قیامت ٹوٹی تھی کہ اُس کا پینے پلانے کا معمول ٹوٹ گیا اور وہ اس پر بھی پریشان ہونے لگا کہ اُس کی آنکھ اتنی سویرے کبھی نہیں کھلی تھی۔ کھل بھی جاتی تو وہ کروٹ بدل کے سو جایا کرتا تھا لیکن اُس صبح اُس نے کروٹ بدلی تو سو جانے کی بجائے ذہن اور زیادہ بیدار ہو گیا، اور اُسے کان کے پیچھے درد محسوس ہُوا۔ پھر ٹخنے سے درد کی ٹیس اُٹھی۔ وہ پُوری طرح بیدار ہو گیا اور اُٹھ بیٹھا۔

کمرے میں ابھی تاریکی تھی۔ کھڑکی کے شیشوں میں سے اُس نے باہر دیکھا۔ باہر بھی ابھی صبح کے کوئی آثار نہیں تھے لیکن جیدا کی نیند پوری ہو چکی تھی۔

"خواب تھا" — اُسے خیال آیا — "کہتے ہیں بھولی بسری باتیں خواب میں یاد آیا کرتی ہیں۔ یہ بمبئی والی آگ تھی جو میں نے لگائی تھی اور خواب میں دیکھتا رہا ہوں کہ کراچی کے کسی بازار میں آگ لگی ہوئی ہے۔"

اُس کا بھٹکا ہُوا، فریب خوردہ اور فریب کار ذہن بہت ہی آہستہ آہستہ، بڑی ہی مری مری چال سے حقیقت کی طرف آرہا تھا لیکن ایک آواز نے اسے روک لیا — یہ ایک بڑی ہی سریلی، پُرسوز اور وجد آفریں آواز تھی — یہ آواز نہیں ایک لَے تھی، الاپ سا تھا جیسے ویرانے میں تھوڑی ہی دُور کوئی اکیلا مسافر گنگناتا جا رہا ہو۔

جیدا نے اپنے موسیقار بابا کے کمرے کی طرف دیکھا۔ اُسے خیال آیا کہ بابا ریاض کر رہا ہے اور یہ مترنّم گونج اُس کے تانپورے کی ہے مگر جیدا کا ذہن زیادہ نہ اُلجھا رہا۔ اس ریاض کے الاپ کے الفاظ شفاف پانی میں رنگ برنگی مچھلیوں کی طرح اُس کے سامنے سے تیرتے ہُوئے گزرنے

لگے — اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوم .... اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوم .... اللہ اکبر .... اللہ اکبر ....

یہ الفاظ وہ پہلی بار نہیں سن رہا تھا۔ یہی الفاظ سنتے سنتے وہ اس عمر کو پہنچا تھا مگر اُس نے انہیں کبھی اہمیت نہیں دی تھی۔ اذان کی مقدس آوازوں کو اُس نے ٹریفک کی آوازوں اور گردوپیش کے دیگر شوروغوغا سے کبھی الگ کر کے نہیں سُنا تھا۔ مسجدوں کے لاؤڈ سپیکروں کی پھٹی پھٹی چیختی چلاتی اس آواز کو اُس نے شہر کی دوسری آوازوں سے الگ کرنے کے کبھی قابل نہیں سمجھا۔ کبھی کوئی بھدی اور بےسُری آواز میں اذان دیا کرتا تو جیدا کوفت سی محسوس کیا کرتا تھا، اس لیے نہیں کہ وہ اذان کے تقدس کو سمجھتا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ آوازوں کے ترنم اور موسیقیت کا قائل تھا۔ اسی ترنم اور موسیقیت نے اُسے اس بوڑھے ستار نواز کے سامنے گھٹنوں بٹھالیا تھا، اور یہ بوڑھا اُس کے ذہن، اُس کے دل اور اُس کی سوچوں پر مجسم طلسم بن کر چھا گیا تھا۔

یہ پہلی اذان تھی جس نے اس پر سحر طاری کر دیا۔ آواز ہی کچھ ایسی تھی۔ یہ اذان پہلی بار شہر کے شوروشر سے الگ تھلگ، تن تنہا اُس تک پہنچ رہی تھی۔ جرائم پیشہ کراچی ابھی گہری نیند سو رہا تھا۔ سڑکوں پر ابھی ٹریفک کی دوڑ شروع نہیں ہوئی تھی۔ خوانچوں اور ریڑھیوں والے ابھی گھاس پھوس کی چھتوں اور مٹی کی دیواروں میں سوتے ہوئے تھے۔ شہر خاموش تھا۔ فضا چپ چاپ تھی، اور اس فضا کے سکوت میں اذان کی مترنم گونج تیرتی آرہی تھی۔

جیدا اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے کان کے پیچھے اور ٹخنے کے زخم میں درد کی ٹیس محسوس ہی نہ کی۔ وہ یوں کھڑکی کی طرف بڑھا اور کھڑکی کھول دی جیسے کسی غیبی قوت نے اُس پر غالب آکر اُس سے یہ حرکت کرائی ہو۔ ہوا کا ایک سرد جھونکا اس سے لپٹ گیا اور اس جھونکے کے ساتھ مترنم اور مقدس لَے اس کی بلائیں لینے لگی — ”لا الٰہ الا اللہ“ — اور پھر فضا خاموش ہو گئی۔

وہ انتظار کرنے لگا کہ فضا اس مقدس ترنم سے ایک بار پھر مرتعش ہو گی اور اُس کی بھٹکی ہوئی زخم خوردہ روح کو سہلائے گی مگر آوازوں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ بیک وقت کئی لاؤڈ سپیکر چنگھاڑنے لگے۔ کوئی قریب سے، کوئی دُور سے اور کوئی بہت ہی دور سے۔ کسی کی آواز موٹی اور بھدی تھی، کسی کی کرخت اور چیخ نما اور کچھ آوازیں بہت ہی بوڑھی تھیں۔

جیدا نے کھڑکی بند کر دی اور اُس آواز کو اپنے ذہن میں محفوظ کرنے کی کوشش کرنے لگا جو اُس نے سب سے پہلے سُنی تھی اور جس نے اُسے مسحور کر کے کھڑکی کھلوادی تھی۔ وہ تصور میں یہ آواز سننے لگا اور جس طرح اُس نے کھڑکی کھولی تھی اسی طرح اس کی ذات کا یا اُس کی روح کا دریچہ کھلنے لگا۔ وہ اپنے آپ میں ایک اثر سا سرایت کرتا محسوس کرنے لگا۔ یہ اثر کبھی اُسے سکون دیتا کبھی وہ مضطرب اور بے چین ہو جاتا۔

”جاگ اُٹھے بیٹا!“ — اُسے بوڑھے ستار نواز کی آواز نے اس کیفیت سے نکال لیا۔ بوڑھے نے کمرے کا بلب جلا کر کہا — ”لاؤ دکھاؤ ذرا، زخموں میں درد تو نہیں؟“ — اور وہ اُس کے قریب آگیا۔

جیدا نے بوڑھے کو حیران سا ہو کے دیکھا اور سہمی ہوئی سی آواز میں بولا — ”زخم؟.... اوہ.... میں نے رات خواب نہیں دیکھا تھا.... مجھے یاد آرہا ہے.... ہاں ہاں.... مجھے یاد آگیا ہے۔“

ستار نواز مسکرا رہا تھا۔

”میں نے اذان سُنی ہے“ — جیدا نے کہا — ”آواز تمہاری طرح بہت پیاری تھی۔ میرے دل پر اس کا اثر ہُوا ہے.... میں بتا نہیں سکتا یہ کیسا اثر ہے“ — اُس نے لپک کر کھڑکی کھول دی اور بولا — ”میں نے صبح کبھی نہیں دیکھی تھی۔“

”تم نے اپنے آپ کو اللہ کے نُور سے محروم کر رکھا تھا“ — موسیقار نے کہا — ”میں عالم فاضل نہیں کہ تمہیں سمجھا سکوں کہ تمہاری ذات میں یہ انقلاب کیسے آیا ہے۔ گھبرا نہ جاؤ میرے عزیز! میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ یہ انسان کی فطرت کے کرشمے ہیں۔ انسان چاہے تو اتنا کمزور اور بُزدل بن سکتا ہے کہ چوہیا سے بھی ڈر کر بھاگ جاتے اور اتنا طاقتور ہو سکتا ہے کہ ساری دنیا سے ٹکر لینے کو اُٹھ کھڑا ہو۔ میں نے کتابیں نہیں پڑھیں، انسانوں کو پڑھا ہے۔ گِرتوں کو اُٹھتے دیکھا ہے اور سینہ تان کر اور گردن اکڑا کر چلنے والوں کو اوندھے منہ گرتے دیکھا ہے۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں گرا دیا جاتا ہے، بعض خود ہی گِر پڑتے ہیں.... اور دیکھو بیٹا! جو گِر پڑتے ہیں وہ اُٹھ بھی سکتے ہیں۔“

ستار نواز نے جیدا کو چارپائی پر اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ کہہ رہا تھا — ”میں نے رات تمہارے ساتھ بہت باتیں کی تھیں۔ میں نے شاید وعظ بھی شروع کر دیا تھا۔ یہ میری غلطی تھی۔ وعظ اور پند و نصیحت سے کوئی انسان سُدھر نہیں سکتا۔ حالات اور انسان ہیں جو انسانوں کو بگاڑتے بھی ہیں سنوارتے بھی ہیں، مگر انسان صرف گوشت اور ہڈیوں کا مجسمہ نہیں، اصل انسان روح اور ضمیر ہے۔ وہ جو بگڑ جاتے یا بگاڑ دیئے جاتے ہیں وہ جسم ہوتے ہیں۔ اندر سے انسان کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اصل انسان یہی ہوتا ہے جو بگاڑا نہیں جا سکتا اور اسی اصل انسان کے آگے فرشتوں نے خدا کے حکم سے سجدہ کیا تھا....

”جیل خانے مجرموں کو سزا دیتے ہیں، انہیں پاکباز نہیں بنا سکتے۔ جیل خانے میں جسم کو سزا دی جاتی ہے۔ پیار اور شفقت سے محرومی انسان کو مجرم بنا دیتی ہے۔ اُسے پیار اور شفقت مل جائے تو وہ راہِ راست پر آجاتا ہے.... ایک وقت تھا جو میں نے بھی دیکھا ہے۔ اس ملک میں ایسے ایسے ڈاکو اور رہزن ہُوا کرتے تھے جنہیں پولیس اور فوج بھی نہیں پکڑ سکتی تھی۔ وہ گھیرے میں سے نکل جایا کرتے تھے۔ ان کی دہشت اتنی ہوتی تھی کہ پولیس اور فوج بھی ان سے ڈرتی تھی مگر جب بھی کوئی ڈاکو پکڑا گیا وہ ایک عورت کے ہاتھوں یا عورت کی وجہ سے پکڑا گیا۔ وہ عورت کی محبت میں گرفتار ہُوا اور اُس کی ساری اُستادی اور ساری دہشت ختم ہو گئی۔ اس عورت کے وجود اور پیار میں اسے ماں کا پیار ملا، بہن کا اور بیوی کا پیار ملا تو جس محرومی نے اُسے ڈاکو بنایا تھا وہ پوری ہو کر اس کی کمزوری بن گئی.... ڈاکو اور چور اُچکے آسمان سے نہیں گرا کرتے۔ ماں کی کوکھ سے وہ فرشتوں کی مانند پاک صاف پیدا ہوتے ہیں۔ وہ جب ایسی محرومی اور ایسی تشنگی اور ایسے ظلم اور بے انصافی کا شکار ہوتے ہیں جیسے تم اور میں ہوتے تھے تو وہ چور اور ڈاکو بنتے ہیں۔

”میری استادی اور میری دہشت ناز اور بیچے نے ختم کر دی ہے“ — جیدا نے کہا۔

”تمہاری ذات کا اصل انسان بیدار ہو گیا ہے“ — بوڑھے ستار نواز نے کہا اور لمبی آہ بھر کر بولا — ”انسان کو خدا نے بڑی قوت دی ہے۔ ایک بات یاد آتی ہے۔ معلوم نہیں کہاں تک سچ ہے۔ میرا خیال ہے سچ ہی ہوگی۔ ایک بڑی ہی خوبصورت عورت ایک نیک اور پارسا آدمی کو دل سے چاہتی

تھی مگر وہ آدمی اسے قبول نہیں کر رہا تھا۔ ایک رات وہ اپنے کمرے میں قرآن پڑھ رہا تھا۔ وہ عورت آگئی۔ اس نے اظہارِ محبت کیا اور ایسے انداز سے کیا کہ اس آدمی کے جذبات بھڑک اُٹھے۔ رات، تنہائی اور عورت کے حسن نے اُس کی پارسائی کو جھنجھوڑ ڈالا مگر اس نے شیطان کے آگے ہتھیار نہ ڈالے۔ اس کے سامنے دیا جل رہا تھا۔ اُس نے اپنا ہاتھ دیئے کی لَو پر رکھ دیا۔ ہاتھ جلا تو درد سے اُس کے منہ سے سی نکل گئی اور اُس پر عورت کا جو جادو سوار ہو گیا تھا، وہ اُتر گیا۔ عورت نے سر اُس کے پاؤں پر رکھ دیا اور یہ کہہ کر چلی گئی کہ میں گناہگار ہُوں تمھارے قابل نہیں.... کل تم نے بھی اپنا آپ آگ میں پھینک کر اپنے گناہوں کو جلا ڈالا ہے۔ دل میں پیار کو زندہ رکھو۔"

پیار کے لفظ نے جیدا کو بیدار کر دیا اور وہ اٹھ کھڑا ہُوا۔ بوڑھے نے اُسے کہا کہ وہ ناشتہ تیار کرتا ہے لیکن وہ چل پڑا۔

"ناز انتظار کر رہی ہو گی" — اُس نے کہا اور دوڑتا ہُوا باہر نکل گیا۔

صبح کا اجالا نکھر آیا تھا۔ وہ دوڑتا ہُوا قریبی بس سٹاپ پر پہنچا۔ بسیں چل پڑی تھیں۔ اُس کے نمبر کی بس آئی تو وہ اس میں سوار ہو گیا۔

"یہ آگ تو اللہ کا قہر تھا" — اُسے پچھلی سیٹ سے آواز سنائی دی۔

"ساٹھ برس عمر ہو گئی ہے، ایسی آگ پہلی بار دیکھی ہے" — ایک اور مسافر نے کہا۔

"آپ لوگوں نے شاید دیکھا نہیں" — ایک مسافر نے کہا — "میں وہاں موجود تھا۔ اس بلڈنگ میں رہنے والے بھاگ رہے تھے لیکن ایک آدمی فائر بریگیڈ کی سیڑھی لگا کر جلتی بلڈنگ کی دوسری منزل میں چلا گیا اور ایک بچے کو آگ سے نکال کر سب سے اُوپر والی چھت سے اُڑا اور سامنے والے درخت پر آ گرا.... وہ تو معجزہ تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں دیکھا تو بھی یقین نہیں آیا کہ کوئی انسان اتنی بہادری کر سکتا ہے"۔

"وہ اُس کا اپنا بچہ ہو گا" — ایک اور مسافر نے کہا — "اپنے بچّوں کے لیے بزدل بھی آگ میں کُود جاتے ہیں"۔

"سُنا ہے بچّہ اُس کا اپنا نہیں تھا" — یہ واقعہ سنانے والے نے کہا — "کسی اور کا تھا"۔

"پھر وہ کوئی فرشتہ ہو گا" — ایک مسافر نے کہا — "ورنہ کراچی کا شہر تو چوروں اور اُٹھائی گیروں سے بھرا پڑا ہے"۔

جیدا سُن رہا تھا۔ اس کا سینہ فخر سے پھیلتا جا رہا تھا۔ اُس کے جی میں آئی کہ سب کو سنا دے کہ کسی کے بچے کو آگ سے نکال لانے والا میں تھا اور میں فرشتہ ہوں لیکن وہ جھینپ گیا۔ جیسے اُس نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا تو سب کہہ اٹھیں گے کہ تم جھوٹ بولتے ہو، تم جیب کترے ہو۔ تم ہمارے تالے توڑتے ہو اور ہماری جیبیں کاٹتے ہو، تم پر خدا کی لعنت۔ تم بچوں کو جلاتے ہو۔

اُسے غصہ آنے لگا۔ اُسے بوڑھے موسیقار پر بھی غصہ آیا کہ اُس نے اُسے مرنے نہ دیا۔ اُس کی ستار اُس کے سینے اور خنجر کے درمیان آگئی تھی۔ اُسے اچانک یاد آگیا کہ اُس کا خنجر ستار نواز کی ستار میں رہ گیا ہے۔ وہ خالی ہاتھ کبھی باہر نہیں نکلا تھا۔ وہ جیب کترا بن گیا۔ بس میں کچھ مسافر کھڑے تھے۔

وہ سب کو دیکھنے لگا۔ وہ کوئی شکار دیکھ رہا تھا۔ اچانک بس رک گئی۔ دھچکہ لگا تو اُس نے باہر دیکھا۔ اُسے وہیں اُترنا تھا۔ وہ اٹھا مگر اُس کا انداز جیب کتروں والا تھا۔ صبح کا وقت تھا اور یہ وقت رش کا تھا۔ لوگ فیکٹریوں، دفتروں اور دکانوں کو جا رہے تھے۔ وہ دھکے دیتے اور دھکے کھاتے بسوں پر اُتر اور چڑھ رہے تھے۔ جیب کترے ایسے ہی رش میں اپنا کمال دکھایا کرتے ہیں۔

جیدا بس کے دروازے تک پہنچ گیا۔ اُس نے ایک شکار دیکھ لیا تھا۔ عین اُس وقت ایک بچہ شاید رش سے گھبرا کر چیخ اٹھا اور زور زور سے رونے لگا۔ جیدا چونک اٹھا۔ اسے ایسے لگا جیسے اُس کا بچہ رو رہا ہو۔ وہ دروازے کی طرف لپکا۔ مسافر دروازے میں پھنسے ہوئے تھے۔ وہ انہیں دھکیلتا ہُوا باہر نکل گیا اور اپنے گھر کی طرف دوڑ پڑا۔

دروازہ ناز نے کھولا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دروازے کے ساتھ ہی لگی کھڑی تھی۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی، شب بیداری کے اثرات بھی تھے۔ بال بکھرے بکھرے سے اور آنکھوں کے نیچے سانولے سے حلقے پڑ گئے تھے۔ جیدا نے اسے دیکھا تو پریشان نہ ہُوا۔ ناز اُسے اتنی زیادہ خوبصورت کبھی نہیں لگی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"کہاں غائب ہو گئے تھے؟" — ناز نے پیار اور غصے سے ملی جلی آواز میں پوچھا۔

"تم نے پہلے کبھی نہیں پُوچھا تھا" — جیدا نے مسکراتے ہُوئے کہا — "تمھیں معلوم ہی ہے کہ میں کہاں غائب ہو جایا کرتا ہُوں"۔

"اندر چلو" — ناز نے کہا — "رات تمھاری حالت ایسی نہیں تھی کہ پہلے کی طرح غائب ہو جاتے۔ میں ساری رات سوئی نہیں"۔

جیدا چلتے چلتے رُک گیا اور حیرت سے ناز کو دیکھتے ہوئے بولا — "تم پاگل ہو۔ میرے لیے ساری رات کبھی کوئی نہیں جاگا تھا۔ میرا انتظار کسی نے نہیں کیا تھا"۔

ناز نے کچھ کہنا چاہا۔ اس کے ہونٹ کانپے مگر اُس نے بات نگل لی۔ جیدا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے کمرے میں لے گئی۔ بچہ کھیل رہا تھا۔ جیدا کو دیکھتے ہی "ابّو، ابّو" کرتا اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ جیدا نے جھک کر اُسے اٹھا لیا اور گال اس کے گالوں سے رگڑنے لگا۔ ناز باورچی خانے میں چلی گئی۔ جیدا کے دل میں بچّے کا پیار تو تھا ہی لیکن آج وہ بچے کے گال چاٹ رہا تھا۔ کبھی اُسے ذرا پرے کر کے غور سے دیکھنے لگتا اور پھر اُسے گلے لگا کر بازوؤں میں بھینچ لیتا۔

ناز جب ناشتہ لے کر آئی، بچہ صحن میں چلا گیا تھا اور جیدا ماں اور بچے کی وہ تصویر دیکھ رہا تھا جو ناز نے منگوا کر دیوار سے لٹکائی تھی۔ کسی مصوّر نے ماں کے چہرے پر ماتا کا تاثر اتنی محنت سے اور ماں کے جذبات کے رنگ بھر کے پیدا کیا تھا کہ یُوں لگتا تھا جیسے تصویر ابھی بولنے لگے گی اور بچّہ جو ماں کی گود میں مچل رہا تھا، مسرت کا معصوم سا مجسّمہ تھا۔ ناز نے جیدا کے قریب تپائی پر ٹرے رکھی تو بھی جیدا تصویر کو ہی دیکھتا رہا۔

ناز نے اس کی پیٹھ پیچھے کھڑے ہو کر ایک ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھا اور ہاتھ آگے سرکا کر اس کی قمیض کے اندر لے گئی۔ اس کا یہ ہاتھ جیدا کے ننگے سینے پر رینگنے اور سرکنے لگا۔ ناز نے دُوسرا ہاتھ جیدا کے دوسرے کندھے پر رکھا اور سرکا کر قمیض کے اندر لے گئی، پھر جھکی اور اپنا گال جیدا کے

سر پر رکھ دیا

جیدا بے خیالی سی میں پیچھے ہٹا اور اس کی پیٹھ ناز کے جسم کے ساتھ لگ گئی۔ جیدا نے آہ کے لہجے میں کہا — "ماں ت —" اور اس نے سکون کی لمبی آہ لی۔ ناز کے چند ایک پریشان بال جیدا کے گالوں سے مَس کر رہے تھے۔

"کیا بات ہے" — ناز نے جذبات سے کانپتی ہوئی سرگوشی کی — "آج تمھارے منہ سے نہ شراب کی بُو آرہی ہے نہ چرس کی۔"

جیدا آہستہ آہستہ آگے ہُوا اور بڑی آہستگی سے سر گھما کر ناز کو دیکھا۔ جیدا کی آنکھوں کا تاثر ویران ویران سا تھا جیسے وہ خود حیران ہو کہ آج اُس کا وجود ان بُوؤں سے خالی کیوں ہے۔

"اوہ!" — جیدا نے کراہ کر کہا — "گردن گھمانے سے سر کے زخم میں درد ہوتا ہے۔"

اس ٹیس نے اسے جذبات سے نکال دیا اور اس کے چہرے پر درد کا تاثر دیکھ کر ناز بھی حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی اور اُس سے زخموں کے متعلق پوچھنے لگی۔ جیدا نے درد کے باوجود لاپرواہی سے جواب دیا۔ وہ ناز کو اور زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ناز نے چائے بنا کر پیالی اُس کے ہاتھ میں دے دی۔ جیدا اُسے کھویا کھویا سا، کچھ بدلا بدلا سا لگا۔ ناز نے اُسے غور سے دیکھا۔

"میں نے تمھیں پریشانی کی حالت میں کئی بار گم اور کھویا ہُوا دیکھا ہے" — ناز نے کہا — "آج بھی تم پریشان ہو مگر کچھ بدلے ہُوتے سے لگتے ہو۔ رات کہیں پی نہیں تھی؟"

"ناز!" — جیدا نے کہا — "تم نے پرانے وقتوں کے ڈاکوؤں کی کہانیاں پڑھی ہوں گی... سُنی بھی ہوں گی۔ ان ڈاکوؤں میں سے جو بھی پکڑا گیا وہ عورت کی محبت میں گرفتار ہو کے پکڑا گیا۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ عورت محبت کا فریب دیا کرتی ہے؟" — ناز نے کہا۔

"دونوں باتیں ہیں" — جیدا نے کہا — "پولیس کسی حسین اور چالاک عورت کو فریب دینے کا ذریعہ بناتی ہے اور عورت مخلص ہو تو بھی اس کی محبت مُجھ جیسے ڈاکو کے لیے خطرناک ہوتی ہے۔"

ناز ہنس پڑی اور بولی — "تم مجھے فریبی سمجھ رہے ہو یا میری محبت میں تمھیں خلوص نظر آتا ہے؟"

"تم میری کمزوری بن گئی ہو" — جیدا نے کہا — "تمھاری محبت میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے۔ تمھارے اور اس بچے کے پیار نے میرا زہر چوس لیا ہے۔"

"پگلے جیدے!" — ناز نے کہا — "کیوں اپنے آپ کو فریب دیتے ہو۔ یہ دھندا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ تمھارے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس مکان کے کسی کمرے میں تم نے زیورات وغیرہ بھی دبا رکھے ہوں گے۔ انہیں نکالو اور کراچی سے نکل چلو۔ تم نے دنیا دیکھی ہے۔ تم میں عقل ہے۔ اچھے بُرے کو سمجھتے ہو۔ کسی اور شہر چلے چلتے ہیں۔ وہاں کوئی باعزت کاروبار کر لو۔"

"کسی اور شہر کی نہیں کسی اور مُلک کی بات کرو" — جیدا نے کہا — "اپنے ملک کے ہر شہر

میں پولیس اور ہر شہر میں جیل خانہ ہے، اور میں اس مشینری کا ایک پرزہ ہُوں۔"

"مگر تمھارے خلاف کوئی مقدمہ تو نہیں چل رہا" — ناز نے کہا — "تم ضمانت پر بھی نہیں، پھر تمھیں پولیس اور جیل خانے کا کیا ڈر ہے؟ تم زمین دوز دنیا سے نکل کر اوپر آجاؤ۔ تم ارادہ کر لو کہ یہ دھندا چھوڑ دینا ہے" — ناز نے مُسکرا کر کہا — "تمھیں شاید یہ ڈر ہے کہ میں تمھیں دھوکہ دوں گی۔"

"تم مجھے دھوکہ دے چکی ہو" — جیدا نے کہا — "مجھے لوہاری بازار کی آگ میں تم نے پھینکا تھا۔ مجھے میرے دوستوں کے سامنے تم نے شرمسار کیا اور انہوں نے مجھے زن مرید اور بزدل کہا۔ تم مجھے اس منزل پہ لے آئی ہو جو مجھ سے چھین لی گئی تھی اور جہاں میں اب لوٹ کے جانا نہ چاہتا تھا" — اس نے آہ لی اور اپنے آپ سے باتیں کرنے کے انداز سے بولا — "مجھ سے وہ سب کچھ چھین لیا گیا تھا جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر زندہ رہے تو وہ انسان نہیں رہتا۔ میں انسان نہ رہا، درندہ بن گیا۔ میں نے اپنے آپ میں چھین لینے کی طاقت پیدا کر لی۔ پیار کی لاش میرے وجود میں گلتی سڑتی رہی اور زہر بن کر میرے خون میں شامل ہوگئی۔ میں سانپ بن گیا۔ تم جانتی ہو میں لوگوں کو کس طرح ڈس رہا تھا مگر تم نے مجھے دھوکہ دیا۔ مجھے کھوئی ہُوئی محبت دے کر اور مجھ سے چھینا ہُوا پیار مجھے لوٹا کر میرا زہر مار دیا۔ دھوکہ جو تمھیں دیا گیا تھا، تم نے اس کا انتقام مجھ سے لے لیا۔ میں نے تمھیں قید میں رکھا تھا مگر تم نے مجھے زنجیروں میں باندھ دیا۔"

وہ عجیب سے لہجے میں بولتا جارہا تھا۔ ایسے لہجے میں اُس نے پہلے کبھی بات نہیں کی تھی۔ وہ چونکہ ابنارمل ذہن کا آدمی تھا اور انتہا پسند اس لیے وہ اپنی بے بسی کو بھی انتہا تک پہنچا رہا تھا۔ وہ اپنی نفسیاتی کیفیت کی بھول بھلیوں میں کھو گیا تھا۔

"کیا تم میری زنجیر توڑ سکو گے؟" — ناز نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا — "مجھ سے جان چھڑا سکو گے؟"

جیدا بیدار ہوگیا۔ اس نے ناز کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کے چہرے کا تاثر بدلنے لگا۔ اُس کے ہونٹ مسکرائے۔

"نہیں" — جیدا نے کہا — "میں تمھاری زنجیریں نہیں توڑوں گا۔ محبت کا جواب محبت سے دوں گا، لیکن اپنی اس دنیا سے نہیں بھاگوں گا" — اُس کے لہجے کی بے بسی اور جذباتیت ختم ہوگئی اور وہ عادی مجرموں کے استاد کے لہجے میں بولا — "کراچی کے استاد کیا کہیں گے، جیدا جیب کترا پیٹھ دکھا گیا ہے؟ کیا میرے اڈوں کے استاد ٹیپو اور مُنّا ہوں گے؟... میرے ہاتھوں میں جتنے پلے بچے میری گدّی پر نہیں بیٹھ سکتے۔ وہ گلّی، بالی، گلنار اور شمّی کو خراب کر دیں گے۔ یہ میری بے عزّتی ہے کہ میرے علاقے میں کوئی دوسرا اُستاد آئے۔ میں نے وزیروں سے کہہ کر اپنے علاقے کے تھانیدار بدلوائے ہیں۔ ملک کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں ہے" — وہ اُٹھ کھڑا ہُوا اور علاقے کے اُستاد کی حاکمانہ آواز میں بولا — "میں یہ بادشاہی چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔"

"اور میں اس بچے کے ساتھ قید میں پڑی رہوں گی؟" — ناز نے ایسی سنجیدگی سے کہا جس میں غصے کی جھلک بھی تھی۔ کہنے لگی — "ایک نہ ایک دن تمھاری داشتہ کہلاؤں گی، اور پھر ایک دن یہاں

ایک اور ناز آجاتے گی، اور اُس وقت یہ سجھ کراچی میں جیبیں کاٹ رہا ہوگا۔"

"داشتہ نہیں"۔۔۔ جیدا نے کہا ۔۔۔"میں کہہ چکا ہوں کہ محبت کا جواب محبت سے دوں گا۔ تم میری بیوی بنو گی۔"

"اور تھوڑے ہی عرصے بعد میں جیدے جیب کترے کی بیوہ کہلاؤں گی"۔۔۔ ناز نے جلی کٹی آواز میں کہا۔۔۔"اور میں تمہارے قاتلوں کی داشتہ بنوں گی۔ مجھے پولیس کے افسروں کے گھروں میں بھیجا جایا کرے گا، یا میں اُس وقت تک صرف اس قابل رہ جاؤں گی کہ گندے، غلیظ چرسیوں اور افیمیوں کے لیے طوائف بنا دی جاؤں گی۔"

"کیا کہہ رہی ہو ناز؟"۔۔۔ جیدا نے حیرت سے پوچھا۔۔۔"کیسی باتیں کر رہی ہو؟.... قتل؟.... مجھے کون قتل کرے گا؟"

"ہوش میں آ جیدے بدمعاش!"۔۔۔ اب ناز کے لہجے میں حکم اور عتاب تھا۔۔۔"میں جانتی ہوں تم یہ دھندا نہیں چھوڑ سکتے۔ اس چکر سے تم نہیں نکل سکتے لیکن تمہیں کراچی سے نکلنا پڑے گا۔ میں سوچ رہی تھی کہ تمہیں اصل بات بتاؤں یا دل میں رکھوں۔ میں اس کوشش میں تھی کہ تم میری محبت کی خاطر کراچی سے نکلنے پر آمادہ ہو جاؤ۔ میں نے کبھی بھی توقع نہیں رکھی کہ تم شریفانہ زندگی میں واپس چلے جاؤ گے۔ میں نے ناول اور افسانے پڑھے ہیں جن میں ڈاکوؤں اور قاتلوں کو آخر میں زاہد اور پارسا بنا دیا جاتا ہے اور ان کے ہاتھوں میں تسبیح دے دی جاتی ہے۔ یہ سب افسانے ہیں۔ میں انہیں سچی کہانیاں سمجھا کرتی تھی لیکن ڈاکوؤں کی دنیا میں آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ سب من گھڑت قصے تھے۔"

"مجھے وہ بات بتاؤ جو تم دل میں رکھنا چاہتی تھیں"۔۔۔ جیدا نے کہا۔۔۔"اور یہ بھی بتاؤ کہ تم یہ بات مجھ سے کیوں چھپا رہی تھیں۔"

"اس لیے کہ کوئی شاگرد اپنے استاد کے ہاتھوں یا استاد اپنے شاگرد کے ہاتھوں کٹ نہ مرے"۔۔۔ ناز نے کہا۔

"غور سے سنو جیدا!"۔۔۔ ناز نے کہا۔۔۔"کل رات جب تم زخمی حالت میں باہر نکل گئے تھے تو میں سمجھی کہ تم مرہم پٹی کرانے جا رہے ہو۔ میں تمہاری راہ دیکھتی رہی۔ تم نہ آئے۔ بہت دیر گزری تو مُنّا اور ٹیپو آ گئے۔ اُنہوں نے تمہارے متعلق پوچھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ تم زخمی ہو گئے تھے اور کسی ڈاکٹر کے پاس چلے گئے ہو۔ انہوں نے پوچھا کہ مال کہاں ہے۔ میں نے کہا کہ وہ کچھ بھی نہیں لایا۔ وہ شراب میں بدمست تھے۔ کہنے لگے تم بکواس کرتی ہو۔ ہم مان نہیں سکتے کہ اس نے ایک بھی پاکٹ نہ ماری ہو۔ میں نے انہیں بتایا کہ تم نے ایک بچے کو آگ سے نکالا ہے اور زخمی ہو گئے ہو۔ اُنہوں نے قہقہہ لگایا اور کہنے لگے کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ بچے کی ماں نے تمہیں ایک ہار دیا تھا جو تم نے نہیں لیا تھا۔"

جیدا کا چہرہ غصے سے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔

"انہوں نے کہا کہ استاد ہمیں دھوکہ دے رہا ہے"۔۔۔ ناز نے کہا۔۔۔"اور سونے کا ہار تمہارے پاس ہے۔ میں نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانے۔ تب ٹیپو نے مجھے کہا۔۔۔ ہم تمہیں آج اور کل کی رات دیتے ہیں۔ اس کے بعد تم یہاں نظر نہ آؤ۔ اس حرامی بچے کو ساتھ لے جانا۔

اگر تم یہاں سے نہ گئیں تو ہم تمہیں کوٹھے پر پہنچا دیں گے"۔۔۔ وہ بک بک کرتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔"

"یعنی آج رات تمہاری یہاں آخری رات ہے"۔۔۔ جیدا نے طنزیہ کہا اور اپنے ناف پر ہاتھ رکھا، چونک کر بولا۔۔۔"خنجر وہیں رہ گیا ہے"۔۔۔ وہ میز کی طرف بڑھا جس کی دراز میں اُس کا ریوالور پڑا تھا۔

ناز نے لپک کر دراز کھولی اور ریوالور نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"وہ بہت غصے میں تھے"۔۔۔ ناز نے ریوالور اپنے پیچھے کر کے کہا۔۔۔"کسی نہ کسی کا خون ہو جائے گا۔ خون تمہارا بھی ہو سکتا ہے۔ میں ان سے بات کروں گی۔"

"اور میں تمہاری چوڑیاں پہن کر یہاں بیٹھا رہوں گا؟"

"جیدا!"۔۔۔ ناز نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔"ٹھنڈے دل سے سوچ لو۔ مجھ سے غلطی ہوئی جو تمہیں یہ بات بتا دی۔ ذرا رک جاؤ جیدے! میں اپنے آپ کو گولی مار دوں گی، تمہیں مرتا نہیں دیکھ سکتی۔"

"کیا تم انہیں اتنا شیر دلیر سمجھتی ہو کہ مجھے قتل کر دیں گے؟"

"تم ان کے خدا نہیں"۔۔۔ ناز نے کہا۔۔۔"تمہارا رشتہ جرم اور گناہ سے قائم ہے جو کسی بھی وقت ٹوٹ سکتا ہے۔"

اتنے میں صحن میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ جیدا باہر نکل گیا۔ مُنّا اور ٹیپو جا رہے تھے۔

جیدا ان کی پیٹھ پیچھے تھا۔ ٹیپو نے گھوم کے دیکھا اور جیدا کو دیکھ کر رُک گیا۔

"تم آ گئے اُستاد!"۔۔۔ ٹیپو نے کہا۔

مُنّے نے پیچھے دیکھا اور وہ بھی ٹیپو کے پاس آ رُکا۔ ناز کمرے سے نہ نکلی۔

"ہاں!"۔۔۔ جیدا نے استادوں کے لہجے میں کہا۔۔۔"کہو میرے لیے کیا حکم ہے؟ کیا میں بھی اِس کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤں؟"

"ہوش میں آ اُستاد!"۔۔۔ مُنّے نے کہا۔۔۔"کل ہمارے درمیان خنجر اور چاقو نکل آتے تھے۔ کیا یہ اچھی بات ہے؟.... ایک چھوکری کے پیچھے ہمیں آنکھیں دکھا رہے ہو؟"

"اور اب تم اتنے بے ایمان ہو گئے ہو کہ سارا مال ہضم کر رہے ہو"۔۔۔ ٹیپو نے کہا۔

"اور جھوٹ بھی بول رہے ہو"۔۔۔ مُنّے نے کہا۔

"تم نے آگ میں سے بچے کو نکالا تھا؟"۔۔۔ ٹیپو نے کہا۔۔۔"تم نے؟.... لوگوں کی بچیاں اغوا کر کے بیچنے والا کسی کے بچے کو جلتی ہوئی آگ سے نکال سکتا ہے؟"

"میں اپنے زخم تمہیں دکھاؤں؟"۔۔۔ جیدا نے کہا۔۔۔"کھول کر دیکھ لو۔ یہ چھری چاقو کے نہیں، آگ کے زخم ہیں۔"

"اور سونے کا وہ ہار کہاں ہے جو تمہاری چھوکری کہتی ہے کہ بچے کی ماں نے تمہیں دیا تھا؟"۔۔۔ مُنّے نے کہا۔۔۔"اپنی داشتہ کی طرح کہہ دو کہ تم نے ہار لیا ہی نہیں تھا۔"

جیدا آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ دو تین قدم تو فاصلہ تھا۔ اس نے دھیمی سی آواز سے مُنّے سے

تھا — "ہار تمہیں دے دوں؟" — اور اس کے ساتھ ہی جیدا کے دونوں ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے چلے۔ وہ لڑنے اور گرانے میں مہارت رکھتا تھا۔ اس کا ایک گھونسہ منّے کے پیٹ میں پڑا۔ وہ دوہرا ہُوا تو دوسرا گھونسہ نیچے سے اُس نے ٹھوڑی پر مارا۔ مُنّا چرس زدہ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ گھونسے کاری پڑے اور وہ پیچھے کو گرا۔

ٹیپو نے ناف سے چاقو نکال لیا۔ اُدھر مُنّا اٹھا اور اُس نے خنجر نکال لیا۔ جیدا خالی ہاتھ تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ جرائم پیشہ لوگوں کی لڑائی اُس وقت ختم ہُوا کرتی ہے جب ایک فریق اپنے خون میں نہا کر گر پڑتا ہے۔ جیدا کا گروہ تو کراچی کا خونخوار گروہ مشہور تھا۔

جیدا خالی ہاتھ تھا۔ مُنّا اور ٹیپو لال انگارہ آنکھوں سے اُسے گھورتے اُس کی طرف بڑھے۔ انہیں پتہ چل چکا تھا کہ جیدا خالی ہاتھ ہے۔ اگر اُس کے پاس کوئی ہتھیار ہوتا تو وہ اب تک نکال چکا ہوتا۔ جیدا پیچھے ہٹا اور نہایت تیزی سے اُس نے قمیض اتار کر دونوں ہاتھوں میں لی اور آگے کر دی۔ جرائم پیشہ لوگوں کی لڑائی کے داؤ پیچ کے مطابق اُسے چاقو اور خنجر کے وار قمیض سے روکنے تھے۔ قمیض کی بجائے کوئی اور کپڑا ہو یا چادر ہو تو اس میں چاقو، چھری یا خنجر کے وار لیے جا سکتے ہیں لیکن اس کے لیے قدموں کی تیزی اور جسم کی پھرتی کی ضرورت ہوتی ہے۔

مُنّا اور ٹیپو جیدا کے پہلوؤں کی طرف ہو گئے۔ اس طرح وہ دونوں کے وار بیک وقت نہیں روک سکتا تھا۔ ایک پہلو پر ایک کا وار روکتا تو دوسرے پہلو یا پیٹھ پر دوسرا دشمن وار کر دیتا۔ تینوں خاموش تھے۔ وہ ایک دوسرے کو نہ للکار رہے تھے نہ دھمکی دے رہے تھے۔ اب زبان کو نہیں ہاتھوں کو کام کرنا تھا — جیدا کے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

اچانک ایک آواز سنائی دی — "اگر ایک قدم اور آگے بڑھایا تو..."

تینوں نے اُدھر دیکھا۔ ناز ہاتھ میں ریوالور لیے اُن کی طرف آ رہی تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں باورچی خانے کی چھری تھی۔ اُسے بھی معلوم تھا کہ یہاں ایک کو قتل ہونا ہے اور وہ جیدا ہی ہو سکتا ہے۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ ابّا یہیں قتل ہُوا تھا اور اُس کی لاش یہیں ایک ہیبت ناک کمرے میں دفن ہے۔ ناز مُنّے اور ٹیپو کو ڈرانے کے لیے نہیں آئی تھی، وہ گولی چلانے کا ارادہ لے کر آئی تھی۔

مُنّا اور ٹیپو رک گئے اور قہر بھری نظروں سے ناز کو دیکھنے لگے۔ ناز قریب گئی تو جیدا نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ اُس سے ریوالور لینا چاہتا تھا لیکن ناز نے چھری اس کے ہاتھ میں دے دی اور ریوالور اپنے پاس رکھا۔ نالی مُنّے اور ٹیپو کی طرف تھی۔

"دونوں کی لاشیں ابّا کی ہڈیوں پر پھینک کر اوپر مٹی ڈال دوں گی" — ناز نے کہا۔

جیدا نے اُن سے ہتھیار لینے کی بجائے انہیں کہا — "خنجر چاقو اندر کر لو اور میرے ہاتھوں اپنا خون نہ کراؤ۔"

دونوں نے اپنے ہتھیار قمیضوں کے اندر نافوں میں اُڑس لیے۔

"عورت کو کہاں کہاں ساتھ رکھو گے استاد!" — ٹیپو نے کہا۔

"ہم سے بگاڑ کر پچھتاؤ گے" — مُنّے نے کہا — "زندہ رہنا چاہتے ہو تو اسے کہو کہ ہم پر

گولی چلا دے، پھر ہماری لاشیں ابّا کی ہڈیوں کے ساتھ دفن کر دینا۔"

"ناز!" — جیدا نے اسے کہا — "اندر چلی جاؤ۔ ریوالور اپنے پاس رکھو" — وہ چلی گئی تو جیدا نے مُنّے اور ٹیپو سے کہا — "اب بتاؤ کیا چاہتے ہو۔ میرے پاس کوئی ہار نہیں اور میں نے کل ایک پیسہ نہیں اٹھایا۔"

دونوں اسے ایسی نظروں سے دیکھتے رہے جن میں صلح صفائی کا ہلکا سا بھی اشارہ نہیں تھا۔ ان کی آنکھوں میں قہر اُترا ہُوا تھا۔

"تم جانتے ہو میں نے کسی کو کبھی بخشا نہیں" — جیدا نے ٹھہری ٹھہری آواز میں کہا جس میں دھمکی نہیں بلکہ دوستی کا رنگ تھا۔ وہ کہہ رہا تھا — "تم میرے شاگرد ہو۔ ہم نے بڑا لمبا سفر طے کیا ہے۔ اب ہم اکٹھے نہیں چل سکیں گے۔"

"اس چھوکری کو چلتا کر دو استاد!" — مُنّے نے کہا — "دیکھ لو عورت نے ہماری دوستی پر کیسی چھری چلائی ہے۔"

"اور عورت ذات پر اتنا بھروسہ نہ کر اُستاد!" — ٹیپو نے کہا۔ اُس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ ایک عورت کے ہاتھوں اپنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکا۔ اُس نے کہا — "تو مجھے جانتا ہے۔ میں تیری چھوکری سے بے عزتی کا بدلہ ضرور لوں گا۔"

ہتھیار کپڑوں کے اندر چلے گئے تھے اور تینوں وہیں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ وہ دھیمی آواز میں بول رہے تھے مگر اس دھیمے پن میں ارادے کی پختگی اور قہر تھا۔ تینوں قاتل تھے۔ تینوں کے جسموں پر کئی لڑائیوں کے زخموں کے نشان تھے۔

"سنو دوستو!" — جیدا نے کہا — "تم نے ٹھیک کہا تھا کہ میری اُستادی ہو چکی۔ مجھ سے مت پوچھنا کہ وجہ کیا ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں جا رہا ہوں۔"

"کہاں؟"

"اِس سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں" — جیدا نے کہا — "سمجھ لو میں تھک گیا ہوں۔ سمجھ لو میں ہار گیا ہوں۔ میں ناز اور بچے کو ساتھ لے کے جا رہا ہوں..." جیدا کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے آہ لی اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہاتھوں سے آنکھیں پونچھ کر بولا — "مجھے اب اپنے آپ پر بھروسہ نہیں رہا۔ میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ تم نے تین چار بار دیکھا ہے کہ تم نے مجھے واردات پر ساتھ چلنے کو کہا اور میں نے ٹال دیا۔"

"میں پھر کہتا ہُوں کہ اپنی زندگی برباد نہ کر اُستاد!" — مُنّے نے کہا — "تجھے اپنے آپ پر بھروسہ اس لیے نہیں رہا کہ تو عورت پر بھروسہ کرنے لگا ہے۔"

"نہیں مُنّے!" — جیدا نے کہا — "میں اب تمہارے کام کا نہیں رہا۔"

"سُن استاد!" — ٹیپو نے کہا — "جانا ہے تو جا... جا چلا جا لیکن تو یہ چھوکری ساتھ نہیں لے جائے گا۔ یہ تیری بیوی ہوتی تو بھی میں اسے نہ جانے دیتا.... اندر جو مال پڑا ہے، یہ چاہے تقسیم کر لے، چاہے سارا لے جا۔ چاہے سارا چھوڑ جا۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں لیکن یہ چھوکری یہاں سے نہیں جائے گی۔ چلی گئی تو کراچی سے نہیں نکلے گی۔"

"ٹیپو!" — جیدا نے کہا — "مجھے للکار رہے ہو؟ جاتے جاتے تیری لاش غائب کر جاؤں گا۔ اُد

اور تم منّے! ہوش میں آؤ۔ میرے ہاتھ سے نہ مرو۔ میں نے اپنے دوستوں کا خون کبھی نہیں کیا تھا۔"

منّے نے اُسے گہری نظروں سے دیکھا، پھر ناز کے کمرے کی طرف دیکھ کر بولا — "اِس چھوکری نے ہمیں پستول دکھایا ہے۔ یہ یہاں سے نہیں جائے گی۔ تُو چلا جا جیدے!..... اس نے ہمیں پستول دکھایا ہے۔ ہم اسے کچھ دکھا کر رخصت کریں گے.... ہمیں مرنے سے نہ ڈرا جیدے! ہم زندہ ہی کب ہیں۔ زندگی سے اتنا پیار ہوتا تو یہ دھندا کرتے؟ کراچی بندر کی گودی میں نوکری کر لیتے.... تُو چلا جا۔ اگر یہ چھوکری خود ہمیں دے دے تو ہم تینوں کے لیے اچھا ہے، نہیں تو خون خرابہ ہوگا اور تُو جانتا ہے تیرے لیے جیل کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ ہم سلطانی گواہ ہیں.... سوچ کر بتا دینا تیری کیا مرضی ہے .... چل بے ٹلیو!"

دونوں باہر نکل گئے۔

جیدا سر جھکائے آہستہ آہستہ کمرے میں چلا گیا۔ ناز اُس کے انتظار میں تھی۔ اُس کے چہرے پر پریشانی کم اور غصّہ زیادہ تھا۔ جیدا نے اُسے دیکھا اور کچھ کہے بغیر کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ گہری سوچ میں کھویا ہُوا تھا۔

"کیا کہتے ہیں؟" — ناز نے پُوچھا۔

جیدا نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا۔ ناز کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"میں نے پوچھا ہے وہ کیا کہتے ہیں" — ناز نے غصیلی آواز میں ایسے انداز سے کہا جیسے وہ اپنے نوکر سے بات کر رہی ہو۔ ایسے انداز سے وہ کبھی نہیں بولی تھی۔

"وہ تمھیں مانگ رہے ہیں" — جیدا نے دبی ہُوئی سی آواز میں جواب دیا۔

"تم نے کیا جواب دیا؟"

جیدا کے ہاتھ میں چھری تھی جو ناز نے باورچی خانے سے اُٹھا کر اُسے دی تھی۔ جیدا نے ناز کو کوئی جواب دینے کی بجائے دو انگلیاں چھری کی دھار پر پھیریں۔

"جیدا!" — ناز نے جھنجھلا کر کہا — "میں نے کیا پوچھا ہے؟"

"میں نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا" — جیدا نے ایسے لہجے میں کہا جو کسی غنڈے کا لہجہ نہیں تھا۔ کہنے لگا — "میں نے ایسے چیلنج کا جواب کبھی زبان سے نہیں دیا۔ یہ چھری جواب دے گی"۔

"کیا تم ہوش میں ہو؟" — ناز نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر جھنجھوڑا اور کہا — "ابھی ابھی تمھارے شاگرد تمھیں کاٹ دینے کو آ گئے تھے۔ تم نے خود ہی بتایا تھا کہ تمھاری طاقت تمھارے شاگرد اور پولیس ہے۔ ان کے بغیر تم کچھ بھی نہیں۔ تم نے انہیں یہ بھی کہہ دیا ہے کہ تم جا..... انھوں نے تم سے مجھے مانگا ہے۔ یہ اُن کی ایک شرط ہے جو وہ سمجھتے ہیں کہ پوری کرا لیں گے۔ انہیں یقین ہے کہ وہ مجھے تم سے چھین لیں گے۔ کیا تم ان کی یہ شرط پوری کر دو گے؟ اپنے آپ کو بچانے کے لیے کیا کرو گے؟"

جیدا نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ ناز نے اس کی آنکھوں میں عجیب سا تاثر دیکھا۔ یہ تذبذب اور کچھ بے بسی کا تاثر تھا۔ ناز نے جیدا کے ساتھ اس طرح غصے سے اور تحکمانہ انداز سے کبھی بات نہیں

کی تھی۔ کبھی جرأت ہی نہیں کی تھی۔ وہ تو غنڈوں کے اِس بادشاہ کی قیدی تھی۔ اُس کے رحم و کرم پر تھی۔ یہ تو جیدا کی نفسیاتی کیفیت ایسی تھی کہ اُس نے ناز سے کہہ دیا تھا کہ وہ اُس کے جسم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھے گا اور اسے اونچے درجے کی طوائف بنائے گا۔ اُس نے جرائم پیشہ ہوتے ہُوئے اور اخلاق کی تاریک بستیوں میں رہتے ہوئے بھی یہ کر کے دکھا دیا کہ اُس نے ناز کے اتنے دِل کش اور توبہ شکن جسم کے ساتھ ذرا سی بھی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔

یہ دراصل کردار کی عظمت تھی جس نے ناز کو جیدا کا گرویدہ بنا دیا اور وہ جان گئی کہ اِس درندے کی کھال میں ایک انسان ابھی زندہ ہے۔ ناز پناہیں ڈھونڈ رہی تھی۔ اُسے اس درندے کے سائے میں پناہ مل گئی اور اسی کی ہو کے رہ گئی۔ اُس نے جیدا کے ساتھ محبّت کا جو اظہار کیا اور محبّت میں جو خلوص پیدا کیا تھا، اس میں بناوٹ یا فریب نہیں تھا۔ وہ دنیا کی دھتکاری ہوئی تھی۔ فریب خوردہ تھی۔ اس دنیا کا بھی سامنا کرنے کے قابل نہیں تھی۔

جیدا کو ناز سے محبت نہیں تھی۔ وہ پیار اور محبت کا قائل ہی نہیں تھا۔ اُس کے پاس ایک سے ایک خوبصورت طوائف موجود تھی مگر اس کا نفسیاتی ڈھانچہ ویسا ہی کمزور تھا جیسا ہر عادی مجرم کا ہوتا ہے۔ ناز نے اس کے ساتھ دلی محبت کا اظہار ایسے انداز سے کیا جس میں فلمی مکالموں اور افسانوں کا دخل نہ تھا، بلکہ اس کے انداز میں گھریلو پن تھا۔ اس کی ہر حرکت گھر والی تھی۔ اس کی محبت میں عریانی اور بے حیائی نہیں تھی۔ یہ مستور محبت تھی جس میں جیدا کو ماں کی بھی بو آتی، بہن کی بھی اور جس میں اس نے باپ کی شفقت کا بھی ذائقہ محسوس کیا۔ یہ اس کی کھوئی ہوئی یا اس سے چھینی ہوئی منزل تھی اور وہ بھٹک گیا تھا۔ ناز کے وجود اور اُس کے پیار میں اُسے منزل کے نشان نظر آنے لگے تھے۔

پھر اللّٰہ کی بیٹی کا نوزائیدہ بچہ دنیا میں آ گیا۔ ناز کا خیال صحیح تھا کہ درندے کی کھال میں انسان ابھی زندہ ہے۔ جیدا بچے کو اٹھا لایا اور اس نے جب بچے کو ناز کی گود میں ڈالا تو اسے کچھ ایسا سکون محسوس ہُوا جیسے وہ اپنا غم گزیدہ اور مجبور بچپن اٹھا لایا ہو اور اب وہ اسے اُن خوشیوں سے بھر دے گا جن سے اس کے اپنے بچپن کو محروم کر دیا گیا تھا۔

یہ ایک نفسیاتی عمل تھا۔ جیدا جو کچھ کر رہا تھا وہ اس کے ذہن لاشعور کی ہدایت کاری کے تحت ہو رہا تھا — اور اب وہ یہ جو کہہ رہا تھا کہ اُسے پیار نے ڈس لیا ہے اور پیار نے اُس کا زہر مار دیا ہے یہ غلط نہیں تھا۔ پیار انسانی فطرت کے زہر کو مار دیا کرتا ہے۔ انسانی فطرت خالصتاً پیار ہے زہریلی نہیں اس میں زہر ڈالا جاتا ہے۔

بوڑھے موسیقار نے اسے بیٹا کہا تو جیدا کا گناہگار بُت اوندھے مُنہ گر پڑا۔ پھر جیدا پیار اور خلوص کی ایک مثلث میں قید ہو گیا — ناز، بچہ اور موسیقار — جیدا وہ جیدا نہ رہ سکا جس سے کراچی کے اُستاد بھی ڈرتے تھے۔ وہ ایک بچے کی خاطر آگ میں کود گیا اور جب اُسے کچھ سمجھ نہ آئی کہ اس کے اندر یہ کیا انقلاب آ رہا ہے تو اُس نے اپنی جان لینے کی کوشش کی۔ یہ اُس کی بے بسی کی انتہا تھی۔ انسان فطری طور پر نیک ہے۔ اس میں گناہوں کی آمیزش کی جاتی ہے۔ جیدا تو گناہوں میں ڈوب گیا تھا بلکہ گناہوں کی جھیل کی مچھلی بن گیا تھا۔ اسے جب نیکیوں کی خشکی پر پھینکا گیا تو تڑپنے لگا۔ وہ دو حصوں میں کٹ

گیا ــــ ایک حصہ واپس نیکی اور پیار کی دنیا میں جا رہا تھا اور دوسرا جرم، جیل اور حرص کی دلدل سے نکل نہیں رہا تھا۔

بوڑھے ستار نواز کے ہاں اس کی آنکھ کھلی تو اس کے کانوں میں اذان کی مقدّس آواز پڑی۔ اتفاق سے مؤذن خوش الحان تھا۔ اذان اُس کی روح میں اتر گئی۔ اسے یاد آ گیا کہ اس کا مقام اس جگہ سے کہیں قریب ہے، جہاں سے اذان کی آواز اُٹھ رہی ہے۔ اُس نے ستار نواز کے آگے ہتھیار ڈال کر کہا کہ اُس کی استادی ختم ہو چکی ہے مگر اپنے گھر میں گیا تو اُس کے سامنے مُنّا اور ٹیپو آ گئے جو زمین دوز دنیا کے بھیڑیئے تھے۔ انہوں نے اسے للکارا تو جیدا غنڈہ، جیب کترا اور غنڈوں کا استاد بیدار ہو گیا۔

مگر ناز کے سامنے جا بیٹھا تو ناز نے اُس کے ساتھ ایسے بات کی جیسے سخت طبیعت کی ماں اپنے احمق بیٹے سے جواب طلبی کرتی اور اُسے بھلا بُرا سمجھاتی ہے۔ جیدا کو ناز کے غصے اور پیار میں ماں کی جھلک نظر آنے لگی۔ وہ دبک گیا۔ وہ اس لیے بھی دبک گیا کہ ناز نے مردوں کی طرح سامنے آ کر اسے بچا لیا تھا اور بچایا اِس لیے تھا کہ اس کے دل میں محبت ہے۔ محبت ہی جیدا کی کمزوری تھی۔

ناز اُس سے پوچھ رہی تھی کہ مُنّے اور ٹیپو نے تم سے مجھے مانگا ہے تو کیا ان کی یہ شرط پوری کر دو گے؟ نہیں کرو گے تو اپنے آپ کو بچانے کے لیے کیا کرو گے؟

"معلوم ہوتا ہے ناز" ــــ جیدا نے بے چین سا ہو کے جواب دیا ــــ "مجھے ایک آخری معرکہ لڑنا ہی پڑے گا۔ میں تمہیں ان کے حوالے نہیں کروں گا۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم خاموشی سے یہاں سے نکل جائیں؟" ــــ ناز نے پوچھا ــــ "ہم نکل سکتے ہیں مگر تم پہلے یہ ارادہ پکّا کر لو کہ اس زمین دوز دنیا کو ہمیشہ کے لیے ترک کر دو گے۔"

"ناز!" ــــ جیدا نے آہ لے کر کہا ــــ "میں اب اس دھندے میں رہ ہی نہیں سکتا، اور میں تمہیں اس دھوکے میں نہیں رکھوں گا کہ میں شریف اور پاک صاف انسان بن جاؤں گا۔ میں اِس لیے بھاگ رہا کہ میں بزدل ہو گیا ہوں۔ مجھے نکلنا ہے۔ تمہیں اور اس بچے کو لے کر نکلنا ہے" ــــ وہ سوچ میں پڑ گیا، پھر بولا ــــ "لیکن میں ان دونوں کا بندوبست کر سکتا ہوں.... میں باہر جا رہا ہوں۔ تم دروازہ اندر سے بند کر لینا۔ کوئی بھی دروازہ کھٹکھٹاتے، نہ کھولنا۔ میری آواز پر کھولنا۔ اگر کوئی کسی طرف سے اندر آ جاتے تو ریوالور ہاتھ میں رکھنا۔ ڈر کر گولی نہ چلانا۔ ضرورت سمجھو تو ڈرے بغیر گولی مار دینا۔ میں بہت جلدی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ باہر نکل گیا۔ ناز نے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔

جیدا علاقے کے تھانے میں گیا۔ اے۔ ایس۔ آئی نے اُسے برآمدے میں روک لیا اور اُسے بتایا کہ اُس کے دوست مُنّا اور ٹیپو آئے تھے اور بہت دیر صدیقی صاحب کے پاس بیٹھے رہے تھے۔ سب انسپکٹر مظہر علی صدیقی اس تھانے کا ایس۔ ایچ۔ او تھا۔

"اُن کے جانے کے بعد صدیقی صاحب نے مجھے بلا کر کہا کہ جیدے کا خیال رکھنا۔ سنا ہے کوئی گڑبڑ کر رہا ہے" ــــ اے۔ ایس۔ آئی نے پوچھا ــــ "کیا گڑبڑ ہے اُستاد؟ وہ دونوں یہاں کیوں آئے تھے؟..... اور تم کیوں آئے ہو؟ کسی واردات میں گڑبڑ ہو گئی ہے؟"

جیدا نے اسے ہنس کر یوں ٹال دیا جیسے وہ اے۔ ایس۔ آئی نہیں کوئی چپڑاسی یا کسی کے گھر کا ملازم ہو۔ اُس نے اے۔ ایس۔ آئی کے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور بولا ــــ "تم مت گھبراؤ یار! کوئی گڑبڑ نہیں" ــــ اور وہ تھانیدار کے کمرے میں چلا گیا۔

"کہو اُستاد" ــــ سب انسپکٹر صدیقی نے اسے کہا ــــ "سنا ہے چھٹی کر رہے ہو؟ ایسی کیا مصیبت آ پڑی ہے؟ کیا ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے یا کسی دوسرے شہر میں قسمت آزمانے کا ارادہ ہے؟"

"وہ کیا بتا گئے ہیں؟" ــــ جیدا نے پوچھا۔

"ابھی خبر نہیں سنائی انہوں نے" ــــ تھانیدار صدیقی نے کہا ــــ "کہتے تھے کل کا سارا مال ہضم کر گئے ہو۔ میں تو کل شام سے تمہارے انتظار میں تھا۔ بوہڑی بازار کا مال کہاں گیا؟ میں تو نقد کا انتظار کر رہا تھا مگر مُنّا اور ٹیپو بتاتے ہیں کہ تم نے صاف جواب دیا ہے کہ تمہارے ہاتھ کچھ بھی نہیں لگا۔ میں کیسے مان جاؤں؟"

جیدا نے اُسے اپنے زخم دکھا کر تفصیل سے سنایا کہ وہ ہاتھ صاف کرنے ہی گیا تھا لیکن ایک ماں نے اُس کا دماغ پھیر دیا اور اُس کے بچے کو نکال لانے کے لیے جلتی ہوئی بلڈنگ میں چلا گیا۔ اُس نے یہ بھی سنایا کہ بچے کی ماں اُسے سونے کا بڑا قیمتی ہار دے رہی تھی جو اُس نے نہیں لیا۔

"مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ میں تمہارے اس جھوٹ کو سچ مان لوں گا؟" ــــ سب انسپکٹر نے پوچھا۔

"میں نے آپ سے کبھی جھوٹ تو نہیں بولا تھا" ــــ جیدا نے کہا ــــ "اگر آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں رہا تو میں آپ کی منّت نہیں کروں گا کہ آپ میری بات کو سچ مان لیں۔ آپ کو میرے چھوکروں کی ہر واردات کا حصہ ملتا رہا ہے۔ کبھی آپ کے ساتھ دھوکہ نہیں کیا۔ آپ نے جب بھی گرفتاری کے لیے ایک یا دو چھوکرے مانگے ہیں، میں نے فوراً حاضر کیے ہیں۔ آپ کی عزت کی خاطر میں نے دو دو سال کے لیے چھوکرے جیل بھجوائے ہیں۔ پھر آپ کو یہ وہم کیوں ہو گیا ہے کہ میں آپ کو دھوکہ دے رہا ہوں؟"

"انڈیا جا رہے ہو؟"

"سوچا بھی نہیں" ــــ جیدا نے جواب دیا ــــ "جاؤں گا تو بتا کے جاؤں گا۔"

"پھر کہاں جا رہے ہو؟"

"جہاں انسانوں کی طرح رہ سکوں" ــــ جیدا نے ہارے ہوئے سے لہجے میں کہا ــــ "معلوم نہیں کیا بات ہے صدیقی صاحب! دل بیزار ہو گیا ہے۔"

"اُسے ساتھ لے جا رہے ہو؟"

"کسے؟"

"جسے تم نے گھر رکھا ہوا ہے" ــــ سب انسپکٹر نے کہا ــــ "اتنی مدت گزر گئی ہے، تم نے ذکر تک نہیں کیا کہ اپنے لیے تم نے چُن کے مال رکھا ہوا ہے۔ کیا اس میں ہمارا حصہ نہیں؟.... آج مُنّا اور ٹیپو بتا گئے ہیں کہ اصل مال تو تم نے دبا کے رکھا ہوا ہے.... تم تو اُستاد ہو جیدا سیٹھ! اپنے دوستوں سے بگاڑنے کا نتیجہ دیکھ لیا ہے؟"

"وہ آپ کو کیا بتا گئے ہیں؟"

"مجھے اتنا کچا سمجھتے ہو کہ جو پوچھو گے بتا دوں گا!" — صدیقی نے کہا — "تم بتاؤ کہ کیوں آئے ہو؟"

"آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"اور ہماری ضرورت کون پوری کرے گا؟" — سب انسپکٹر صدیقی نے کہا — "کل کے مال کا حساب دو اور کیا نام ہے اُس لڑکی کا... ناز... اس کی زیارت کرا دو۔ یہ بھی یاد رکھو جیدا استاد! تمہارے چھوکروں کی بے شمار وارداتیں داخل دفتر کر چکا ہوں۔ کتنی کیس رجسٹر ہی نہیں کیے۔ لوگوں کے تالے ٹوٹ رہے ہیں۔ دن دہاڑے چوری کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ جیبیں کٹ رہی ہیں۔ میں نے ہر واردات میں تمہارے سر پر ہاتھ رکھا اور اپنی نوکری کو خطرے میں ڈال کر رپورٹ درج نہیں کی۔ اگر درج کی تو داخل دفتر کر دی۔"

"آپ نے ہر بار پوری فیس لی ہے" — جیدا نے کہا — "میں آپ کو حق سے زیادہ دیتا رہا ہوں۔"

"کسی دن کا کوئی سا اخبار پڑھ لو" — صدیقی نے کہا — "اخباروں میں مطالبے ہو رہے ہیں کہ تھانیداروں کے خلاف مقدمے چلائے جائیں کہ وہ اپنے فرائض میں کوتاہی کر رہے ہیں۔ سیاسی لیڈر اور وزیر بھی اخباروں میں بیان چھپوا رہے ہیں کہ ملک میں جرائم اتنے بڑھ گئے ہیں کہ لوگ دن کے وقت بھی دروازے اندر سے بند رکھتے ہیں۔"

"سیاسی لیڈر؟... جیدا ہنس پڑا — "اور وزیر... کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لیڈر اخباروں میں جو بیان چھپواتے ہیں وہ ان کے دلوں سے نکلتے ہیں یا وہ ایسے بیان دیانتداری اور خلوص سے دیتے ہیں؟ آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ لیڈروں کی سیاست مجھ جیسے غنڈوں اور بدمعاشوں کے بغیر چل ہی نہیں سکتی۔ وہ جرائم کو کیا روکیں گے۔ ہر سیاسی پارٹی کا اپنا ایک گروہ ہے۔ جو بھی سیاسی لیڈر اقتدار میں آتا ہے وہ اپنے گروہ کو وارداتیں کرنے کی کھلی چھٹی دے دیتا ہے۔ اقتدار کی کرسی کے لیے مجھ جیسوں کو خوش رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ آپ بھی اسی مشین کا ایک حصہ ہیں۔ میرے سر پر ایک وزیر کا ہاتھ ہے جو آپ جانتے ہیں کون ہے مگر میں نے آپ کو آپ کے حق سے کبھی محروم نہیں کیا۔ آپ کی قسمت میرے ہاتھ میں ہے۔"

"شاید اب نہ رہے" — سب انسپکٹر نے کہا — "اب تم اپنی قسمت میرے ہاتھ میں دے رہے ہو... لمبی چوڑی باتوں کو چھوڑو یار! دیکھو، ہم پرانے ساتھی ہیں۔ ہماری دوستی بڑی پکّی رہی ہے۔ مجھے اپنی ناز دکھا دو اور لوہڑی بازار کے مال کا حساب دے دو... یار! تم ایسے تو نہ تھے۔"

"اگر میں ایسے کے بجائے ویسا بن گیا تو میرا کیا بگاڑ لو گے؟" جیدا نے کہا — "اگر میرے دو آدمی میرے خلاف ہو گئے ہیں تو کیا تمہارے ڈی۔ ایس۔ پی اور ایس۔ پی بھی میرے خلاف ہو جائیں گے؟... صدیقی بھائی! کوشش کرو کہ میں آپ کو بھائی کہتا رہوں۔ مُنّے اور ٹیپو نے مجھے دھوکہ دیا ہے تو وہ آپ کو بھی دھوکہ دے سکتے ہیں۔ آپ انہیں میرے خلاف سلطانی گواہ بنانے کی سوچ رہے ہیں تو وہ کورٹ میں منحرف ہو کر آپ کی تھانیداری کو باہر فٹ پاتھ پر پھینک سکتے ہیں۔ مجھے میری جس واردات میں گرفتار کرو گے اُس میں آپ بھی شامل ہوں گے۔ ملک کی سیاست کا پانسہ پلٹ دینے والا آدمی ایک سب انسپکٹر کا تو بیڑہ غرق کر سکتا ہے۔"

سب انسپکٹر کھسیانہ سا ہو کے بولا — "میں تمہارے مکان پر چھاپہ مار کر ناز کو برآمد کروں گا اور تمہارے خلاف مغویہ لڑکی سے دھندہ چلانے کا پرچہ کاٹوں گا۔"

"اور یہی لڑکی کورٹ میں بیان دے گی کہ سب انسپکٹر صدیقی نے مجھ پر مجرمانہ حملہ کیا ہے" — جیدا نے کہا — "ایک درجن رنڈیاں شریف عورتوں کے روپ میں آپ کے خلاف گواہی دیں گی... صدیقی بھائی! میں کسی اور مقصد کے لیے آیا تھا مگر آپ نے اناڑیوں کی سی باتیں شروع کر دی ہیں۔"

"پولیس مقابلہ جانتے ہو کیا ہوتا ہے؟" — صدیقی نے پوچھا۔

"کر کے دکھا دوں گا" — جیدا نے کہا۔

"تمہاری لاش مقابلہ نہیں کر سکے گی" — سب انسپکٹر صدیقی نے کہا — "تم جانتے ہو کہ جس کے خلاف پولیس مقابلہ ہوتا ہے، اُسے پہلے قتل کیا جاتا ہے پھر پولیس مقابلہ ہوتا ہے۔"

"یہ مقابلہ اگلے دن اخباروں میں ہوتا ہے" — جیدا نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ کہنے لگا — "آپ میری بات سمجھ نہیں سکے۔ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی آپ نے؟" — اور وہ باہر نکل گیا۔

سب انسپکٹر مظہر صدیقی نے اپنے تھانے کے اے۔ ایس۔ آئی اللہ داد کو بلایا اور اُسے اپنے قریب بٹھا لیا۔

"جیدا کیوں آیا تھا؟" — اللہ داد نے پوچھا — "بڑے غصّے میں گیا ہے۔"

"اس کا غصہ ٹھنڈا کرنا ہے" — سب انسپکٹر نے کہا — "مُنّا اور ٹیپو اس کے متعلق کچھ گڑبڑ بتا گئے ہیں۔ سالا ہمیں دھوکہ دے رہا ہے۔"

"غصہ کیسے ٹھنڈا کرنا ہے؟" — اے۔ ایس۔ آئی اللہ داد نے پوچھا — "کیا اس کا غصہ آپ ٹھنڈا کر سکتے ہیں؟"

"میں جانتا ہوں اللہ داد تم کیا کہنا چاہتے ہو" — صدیقی نے کہا — "لیکن ہم پولیس آفیسر ہیں۔ ہماری کچھ پوزیشن ہے، کوئی حیثیت ہے۔ ایک ہسٹری شیٹر ہمیں تھانے میں آکر دھمکیاں دے جائے اور ہم جی حضوری کریں۔"

اللہ داد ہنس پڑا اور طنزیہ لہجے میں بولا — "پولیس آفیسر... پوزیشن... حیثیّت... کیا بات کر رہے ہیں آپ صدیقی صاحب! کہاں ہے آپ کی پوزیشن؟... ہماری حیثیت کیا رہ گئی ہے؟ ہم نے اپنی پوزیشن اور حیثیت رہنے کب دی ہے؟ حکومت اس شخص کی ہے جو عادی مجرم ہوتے ہوئے دندناتا تھانے میں آیا اور آپ کو للکارتا نکل گیا ہے۔ کیا آپ اسے گرفتار کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں؟ اِدھر آپ اسے حوالات میں بند کریں گے اُدھر سے ٹیلیفون آجائے گا کہ اسے چھوڑ دو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے تھانے سے لے جانے کے لیے کسی وزیر کی کار آجائے۔"

"میں سب کچھ جانتا ہوں اللہ داد!" — مظہر صدیقی نے پریشان سا ہو کے کہا — "لیکن میں اپنی یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں استعفٰی دے دوں گا۔ غنڈوں اور وارداتیوں کی دھونس نہیں سہہ سکتا۔"

"صدیقی صاحب!" — اے۔ ایس۔ آئی نے سب انسپکٹر کی طرف جھک کر رازداری سے کہا — "ہم ان غنڈوں اور وارداتیوں کا دیا کھاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ برا نہیں مانیں گے۔ آپ کے گھر میں چوری کا سامان اور فرنیچر موجود ہے۔ میرے گھر میں بھی موجود ہے۔ ہم سیاسی لیڈروں کے غنڈوں اور سرکاری غنڈوں کے سامنے عدالت میں کھڑے ہونے کے قابل نہیں۔ آپ کیوں

پریشان ہوتے جارہے ہیں؟ ہمارے لیے حکم ہے کہ وزیر، وزیرِ اعلیٰ اور وزیرِاعظم اور گورنر کسی جلسے یا تقریب میں جاتیں تو سارا شہر اُٹ جاتا ہے تو لُٹ جانے دو، حاکم کی سیکورٹی کا فوراً بندوبست کرو۔ آپ سے کسی نے کبھی پوچھا ہے کہ ہماری فائلوں میں جیب تراشی سے قتل تک کے کیسوں کی جو بھرمار ہے ان کی تفتیش کیوں نہیں ہو رہی؟ ہم بہت سی وارداتیں درج رجسٹر ہی نہیں کرتے شہریوں کو ڈرا دھمکا کر بھگا دیتے ہیں۔ اخباروں میں ان کے مراسلے چھپتے ہیں اور کسی ایڈیٹر کو جس روز کوئی اور موضوع نہیں ملتا، وہ ہمارے خلاف ایڈیٹوریل لکھ مارتا ہے۔ آپ سے کبھی جواب طلبی ہوتی ہے کہ اخباروں کے الزامات کا جواب دو۔ ہمارے ہاتھوں ایڈیٹروں کو گرفتار کرایا گیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ایڈیٹر وہی گرفتار ہوتا ہے جو برسرِ اقتدار سیاسی لیڈر کے کرتوت بے نقاب کرتا ہے۔"

"میں اس سیاسی نظام کو نہیں بدل سکتا"۔۔۔ سب انسپکٹر نے کہا ۔۔۔ "میں مارشل لاء نافذ نہیں کر سکتا میں کسی سیاسی لیڈر کے خلاف آواز نہیں اٹھا رہا۔ میں اپنی ذات کی بات کر رہا ہوں اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اس میں تمہارا کچھ فائدہ بھی ہے۔"

"ہاں، بتائیں"۔۔۔ اللہ داد نے کہا ۔۔۔ "میں آپ کی مدد کیوں نہیں کروں گا۔ یہ تو میں نے آپ کو یاد دلایا ہے کہ سیاسی لیڈروں کی حکومت میں ہماری پوزیشن اور حیثیت کیا ہے۔ آپ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں مجھے بتائیں۔ آپ کا پورا پورا ساتھ دوں گا۔"

"جیدا کے دو آدمی مُنّا اور ٹیپو، اس کے دشمن ہو گئے ہیں"۔۔۔ صدیقی نے کہا ۔۔۔ "یوں سمجھو کہ یہ دو اس کے بازو تھے جو کٹ گئے ہیں۔ جیدا اس شہر سے کھسک رہا ہے۔ میں کبھی نہیں مان سکتا کہ وہ شریفانہ زندگی بسر کرنے کا ارادہ کر چکا ہے۔ وہ بیوقوف نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ وہ اس جال میں سے زندہ نہیں نکل سکتا۔ اس کے سینے میں جو راز ہیں وہ اس کی موت کا باعث بنیں گے۔ اسے میں نے یا ہمارے کسی بڑے صاحب نے یا کسی سیاسی لیڈر نے نہ مروا دیا تو اس کے ساتھی اسے مار ڈالیں گے۔ وہ زندہ رہا تو سب کو بلیک میل کرے گا۔ تم جانتے ہو وہ کتنا گھاگھ اُستاد ہے....

"وہ خزانہ اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔ مجھے اب پتہ چلا ہے کہ اُس نے ایک بڑی ہی خوبصورت لڑکی اپنے پاس رکھی ہوتی ہے۔ وہ اس لڑکی پر فریفتہ ہو چکا ہے اور وہی اسے کراچی سے نکل چلنے پر اکسا رہی ہے۔ یہ لڑکی اس نے اڑائی تھی۔ کل بوہڑی بازار کی آگ سے اُس نے بڑا مال سمیٹا ہے۔ اتنا زیادہ کہ اس نے اپنے ساتھیوں سے بھی چھپا لیا ہے۔ مُنّا اور ٹیپو مجھے بہت کچھ بتا گئے ہیں۔ اُس کی دوسری وارداتوں کو بھول بھی جاؤ تو بھی میں اسے پھانسی کی کوٹھڑی تک پہنچا سکتا ہوں۔ وہ جس مکان میں رہتا ہے۔ اس کے ایک کمرے میں ڈاکے کی ایک واردات کا سلطانی گواہ دفن ہے۔ اُس کا نام ابّن تھا۔ مُنّا اور ٹیپو ثابت کریں گے کہ اس سلطانی گواہ کو جیدا نے قتل کیا تھا۔"

"مجھے یہ بتائیں کہ آپ جیدا کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں یا مروانا چاہتے ہیں؟"۔۔۔ اللہ داد نے کہا ۔۔۔

"ہم نے اسے گرفتار کیا تو وہ اگلے روز ہی رہا ہو جائے گا۔ دوسرا کام آسان ہے۔"

"میں اس کے مکان پر چھاپہ مار کر اس کی داشتہ کو قبضے میں لینا چاہتا ہوں"۔۔۔ سب انسپکٹر نے کہا ۔۔۔ "اور تم جانتے ہو کہ وہاں جو مال ہے وہ اپنا ہی ہے۔ تم ساتھ ہو گے۔ اپنا حصہ وصول کر لینا۔ چھاپے

کے دوران اسے پار کر دیں گے۔ ایک گولی اُسے مار کر باقی گولیاں ہوا میں چلائیں گے اور پولیس مقابلہ ہو جائے گا۔"

"اس کارروائی سے آپ سے بازپرس ہوگی کہ جیدا کے گھر چھاپہ مارنے کی اجازت کس نے دی تھی؟"۔۔۔ اللہ داد نے کہا ۔۔۔ "اسے اس کے اپنے آدمیوں کے ہاتھوں کیوں نہ مروا دیا جائے۔ کیا مُنّا اور ٹیپو اس کام کے لیے تیار ہیں؟"

"وہ تو اتنے بھڑکے ہوتے ہیں کہ سورج غروب ہونے سے پہلے اس کا کام تمام کرنے کو تیار ہیں"۔۔۔ صدیقی نے کہا

"پھر آپ سوچ کیا رہے ہیں؟"۔۔۔ اللہ داد نے کہا ۔۔۔ "ان دونوں کو تیار کرو، اور جلدی کرو، ورنہ کہیں نکل جائے گا۔"

"نکل کہاں جائے گا"۔۔۔ سب انسپکٹر نے کہا ۔۔۔ "میں نے مُنّے اور ٹیپو سے کہہ دیا ہے کہ اُس پر نظر رکھیں۔ وہ اِدھر اُدھر ہو تو مجھے اطلاع دیں.... تم یوں کرو اللہ داد! ان دونوں کو پھر بلاؤ مگر یہاں رات کو آئیں ہمیں بڑی ہوشیاری سے بندوبست کرنا پڑے گا۔ جیدا کراچی کے بہت سے غنڈوں کو اپنے ساتھ ملا سکتا ہے اور اس کی پیٹھ پر سیاسی لیڈروں کا ہاتھ ہے۔ ہمیں بھی کچھ آدمیوں کی مدد لینی ہوگی۔"

"ضروری نہیں"۔۔۔ اللہ داد نے کہا ۔۔۔ "خاموشی سے مروا دیں گے۔ غائب کرا دیں گے۔ کسی بس یا کار کے نیچے دلا دیں گے۔"

جیدا اپنے علاقے کے تھانیدار سب انسپکٹر مظہر صدیقی کے ساتھ صلح اور سمجھوتے کی بات کرنے گیا تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ یہ تھانیدار خوش ہوگا کہ کراچی سے ایک جرائم پیشہ کم ہو رہا ہے اور یہ گروہ ٹوٹ جائے گا۔ جیدا سوچتا جا رہا تھا کہ سب انسپکٹر صدیقی اگر عقل سے کام لیتا تو وہ اُس سے اس قسم کی سودا بازی کر سکتا تھا کہ اپنے گروہ کے دو چار آدمی پکڑوا دو اور چوری کا کچھ مال برآمد کرا دو۔ تھانیدار کی قابلیّت اور اہلیّت اسی سے ظاہر ہوتی ہے کہ اُس نے اپنے علاقے کی وارداتوں کا سراغ لگایا، مجرم پکڑے اور مال برآمد کیا۔ پولیس کا محکمہ اپنی کوتاہیوں اور دیگر دھاندلیوں پر اسی طرح پردہ ڈالا کرتا ہے کہ جرائم پیشہ اُستادوں سے ان کے دو چار آدمی اور کچھ مال لے لیتا ہے اور خبریں اخباروں میں چھپوائی جاتی ہیں۔ جیدا کے دور میں تھانیدار خود ہی اخباروں میں خبریں اور تصویریں چھپوا دیا کرتا تھا۔

سب انسپکٹر مظہر صدیقی نے جیدا کو اپنی شہرت کا ذریعہ نہ بنایا۔ اس کی بجائے اُس نے جیدا سے اُس مال میں سے حصے کا مطالبہ کیا جو اُس کے خیال کے مُطابق جیدا نے بوتری بازار کی آگ میں سے لُوٹا تھا اور اُس نے جو جیبیں کاٹی تھیں۔ مُنّا اور ٹیپو اُسے یہ بھی بتا گئے تھے کہ جیدا نے ناز نام کی ایک مغویہ لڑکی اپنے پاس رکھی ہوئی ہے جو بہت خوبصورت ہے۔ سب انسپکٹر صدیقی نے جیدا سے اس لڑکی کی بھی فرمائش کر دی۔

جیدا کے یہ دونوں شاگرد اُس کے کچھ راز بھی تھانیدار کو بتا گئے تھے جن میں سب سے زیادہ خطرناک راز یہ تھا کہ اِبّن کو جیدا نے قتل کیا تھا اور اُس کی لاش اُس کے گھر کے ایک کمرے میں دفن ہے۔ اُنہوں نے ایک مخبری یہ بھی کی کہ بادل کو جیدا نے قتل کرایا تھا۔ اُنہوں نے تھانیدار کو اُن دو شاگردوں کے نام بھی بتائے جنہوں نے جیدا کے حکم پر بادل کو قتل کیا تھا۔

جیدا ہتھیار ڈالنے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ سب انسپکٹر مظہر صدیقی کے ساتھ دھمکی آمیز باتیں کر کے تھانے میں سے نکل گیا۔ اُس نے ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ گیا۔ اُس نے بے خیالی سی میں ڈرائیور کو بتایا کہ کہاں جانا ہے۔ وہ خیالوں اور سوچوں میں یوں اُلجھ گیا تھا جیسے دوپٹہ کانٹوں والی جھاڑی سے اُلجھ جاتا ہے۔ دوپٹہ ایک طرف سے کانٹوں سے چھڑا کر دوسری طرف سے چھڑانے لگو تو کانٹوں سے الگ کیا ہُوا حصہ پھر کانٹوں میں اُلجھ جاتا ہے۔

اُس نے جرم و گناہ کی زندگی ترک کر دینے کی قسم تو نہیں کھائی تھی۔ توبہ بھی نہیں کی تھی۔ وہ مجرمانہ سرگرمیوں کو بُرا سمجھتا ہی نہیں تھا۔ اس پر کسی کے وعظ کا اثر نہیں ہُوا تھا۔ یہ تو اس کی فطرت کی پیاس تھی جو پیار نے بجھا دی تو جیدا کے سینے میں بھڑکتے ہوئے شعلے بجھ کے رہ گئے۔ وہ پیار کی ایسی مثلث میں گرفتار ہو گیا جس میں نفرت اور حقارت جو اُس کی فطرت میں بھری ہوئی تھی غبارے میں سے ہوا کی طرح نکل گئی تھی مگر سب انسپکٹر مظہر صدیقی نے اُسے چیلنج کیا تھا، اُسے للکارا تھا۔ وہ چیلنج کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اُس نے ارادہ کر لیا کہ للکار کا جواب للکار سے دے گا۔

"اپنی ناز کی ایک جھلک دکھا دو" — جیدا کو سب انسپکٹر صدیقی کے الفاظ سنائی دینے لگے۔

جیدا کا خون کھولنے لگا۔ اگر صدیقی اُس سے کوئی طوائف مانگتا تو وہ آدھی درجن طوائفیں حاضر کر دیتا مگر اُس نے ناز کی فرمائش کی تھی اور فرمائش کے انداز میں حکم تھا، چیلنج تھا۔ اُسے یاد آنے لگا کہ مُنّے اور ٹیپو نے بھی اُسے کہا تھا کہ اُستاد! ہم ناز کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکو گے۔ ناز یہاں سے نہیں جائے گی۔

جیدا یوں تن کے بیٹھ گیا جیسے اُسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ وہ جیدا غنڈہ اور بدمعاش بن گیا جس نے سیاسی پارٹیوں کے جلسے اکھاڑ کر اور جلسوں کا تحفظ کر کے ملک کی سیاست کے اکثر پانسے پلٹے تھے — وہ تصوّر میں سب انسپکٹر صدیقی سے انتقام لینے لگا۔ مُنّے اور ٹیپو کو عبرت ناک مزہ چکھانے لگا۔ اُس کا جسم اکڑتا گیا اور اس نے سر کو ذرا سا جھٹکا دیا تو کان کے قریب درد کی ٹیس اُٹھی۔ اُس نے غصّے سے پاؤں ٹیکسی کے فرش پر مارا تو ٹخنے سے درد کی ایسی ٹیس اُٹھی کہ اُس کا سر چکرا گیا۔

"اُف" — اُس کے ہونٹوں سے کراہتی ہُوئی سسکی نکل گئی اور اس کی آنکھوں کے آگے شعلے ناچنے لگے۔ پھر شعلوں نے اُسے نرغے میں لے لیا۔ اُسے ایک بچّے کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ اُس کے ساتھ ہی اس احساس نے جیدا کی دلیری اور مجرمانہ استادی کو دبوچ لیا کہ وہ بہت کمزور آدمی ہے۔ وہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور اُسے ناز کو اور اِبّن کی بن بیاہی بیٹی کے بچے کو بچا کر کراچی سے نکلنا ہے۔

ٹیکسی رُکی تو اُسے یاد آیا کہ وہ ٹیکسی میں بیٹھا ہے اور اُسے یہاں اترنا ہے۔ یہ کراچی کے ایک اور استاد بشیرے کا ٹھکانہ تھا۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے پیسے پوچھے بغیر پانچ روپے کا ایک نوٹ ٹیکسی کی اگلی سیٹ پر پھینکا اور بڑی تیزی سے ٹیکسی سے نکل گیا۔ بشیرا گھر میں مل گیا۔

"اوئے، کس سے لڑائی ہوئی ہے جیدے!" — بشیرے نے ہاتھ آگے بڑھا کر جیدا کا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا — "تمہارا رنگ کیوں اڑا ہُوا ہے؟ ارے گورنمنٹ تیری اپنی ہے۔ ہم تو تجھ سے ڈرتے ہیں اُستاد!"

"بشیرے!" — جیدا نے دبی دبی آواز میں کہا — "میرا علاقہ سنبھالو گے؟"

"کب تک؟"

"ہمیشہ کے لیے" — جیدا نے کہا اور اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آ گئی جو بشیرے نے جیدا کے ہونٹوں پر کبھی نہیں دیکھی تھی۔

"معلوم ہوتا ہے جیدے استاد، گانجے کا کش لگا کر آتے ہو۔"

"ہوش میں ہوں یار!" — جیدے نے کہا — "پورے ہوش میں ہوں.... دل بیزار ہو گیا ہے۔"

"ہونا تھا" — بشیرے نے کہا — "ہونا ہی تھا۔ چھوکری کے چکر میں جو آیا وہ گیا۔ مجھے معلوم ہے تم نے داشتہ رکھی ہُوئی ہے۔ تم اناڑی تو نہیں جیدے! وہ تمہیں کہاں لے جا رہی ہے؟"

"وہ نہیں، اُسے میں کہیں لے جا رہا ہوں" — جیدا نے کہا۔

"کہاں؟"

"یہ تم سے پوچھنے آیا ہوں" — جیدا نے کہا — "تم مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہو۔"

"دھندا بھی چلے گا؟"

"نہیں" — جیدا نے کہا — "دھندا چھوڑ رہا ہوں۔"

بشیرے نے اُوپر دیکھا اور لمبی آہ بھری، پھر وہ جیدا کو یوں دیکھنے لگا جیسے اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"تمھارا دماغ چل گیا ہے" — بشیرے نے کہا — "یا شاید کل لوہاری بازار کی آگ نے تمھارا پیٹ بھر دیا ہے۔ میرے چھوکروں نے بھی خوب ہاتھ مارا ہے۔ ایک چھوکرا تو جیتی جاگتی عورت کے گلے سے سونے کا ہار اُتار کر لے آیا ہے۔"

"اور میں ایک عورت کے گلے سے اُترا ہُوا ہار اُس کے گلے میں ڈال آیا ہُوں" — جیدا نے کہا — "اور لوہاری بازار کی آگ نے مجھے یہ زخم دیے ہیں" — اُس نے بشیرے کو اپنے زخم دکھائے۔ جیدا نے اُسے تفصیل سے بتایا کہ وہ اب اس دھندے میں چل ہی نہیں سکے گا اور کیوں نہیں چل سکے گا۔

"اس سے بہتر ہے کہ پھانسی چڑھ جاؤ" — بشیرے نے کہا — "تم مجھے ایک آدمی بتا دو جو اس جال سے نکل کے گیا ہو۔ کوئی گمنام چور اور اُٹھائی گیرا اِدھر اُدھر ہو جائے تو کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ ہم تم وزیروں، لیڈروں، پولیس کے افسروں اور اپنے ساتھ کے استادوں کے راز اپنے سینوں میں لے کر کہاں جا سکتے ہیں؟ تم اس زمین پر نہیں چل پھر سکتے۔ سمندر پار چلے جاؤ۔ سرحد پار کر جاؤ۔"

"ہندوستان؟"

"ہاں" — بشیرے نے کہا — "تمھیں صرف ہندوستان میں پناہ مل سکتی ہے۔ وہاں چاہے یہی دھندا چلاؤ چاہے شریفوں کی زندگی بسر کرو۔"

"بشیرے استاد!" — جیدا نے کہا — "میرا تمھارا کوئی مذہب نہیں۔ ہم جیسوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، کوئی ملک نہیں ہوتا مگر جب مجھے ہندو یاد آتے ہیں تو یہ بھی یاد آجاتا ہے کہ میں مسلمان ہُوں اور میں پاکستانی ہُوں۔ یہ الگ قصّہ ہے کہ ہم اپنے لیڈروں اور حاکموں کے ساتھ مل کر اپنے ملک کا بیڑہ غرق کر رہے ہیں لیکن ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ ہندو ہمارے ملک کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے۔ میں ۱۹۴۷ میں اُدھر سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ میرا پیشہ یہی تھا۔ میں کوئی شریف آدمی نہیں تھا لیکن اتنا سا احساس تو موجود تھا کہ جنہیں ہندو اور سکھ قتل کر رہے ہیں اور جن عورتوں کو وہ گھسیٹ گھسیٹ کر لے جا رہے ہیں وہ مسلمان ہیں۔ میں وہ قتل و غارت اور مسلمانوں کے جلتے ہوئے مکان اور ان میں جلتے ہوئے بچوں کو نہیں بھول سکتا۔"

"مجھے کیا بتاتے ہو جیدا سیٹھ!" — بشیرے نے آہ بھر کے کہا — "میں اُس وقت لاہور میں تھا۔ میرا بھی یہی پیشہ تھا۔ یہی دھندا تھا۔ یہ میرا خاندانی دھندا ہے۔ پناہ گزینوں کے جو قافلے میں نے دیکھے تھے وہ آج بھی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ میرا باپ انڈیا کا مانا ہُوا قفل شکن تھا۔ وہ بھی لاہور آگیا تھا۔ اُس نے مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے قتلِ عام کے قصے سنائے تھے۔ مجھ جیسے پتھر کے بھی آنسو نکل آتے تھے۔"

"اور یہ جو میں نے تمھیں سنایا ہے کہ کل میں نے لوہاری بازار کی آگ سے ایک بچّے کو زندہ نکالا ہے

اس میں شاید میرا کوئی عمل دخل نہیں تھا" — جیدا نے کہا — "وہ میں نہیں تھا۔ وہ شاید وہ جیدا تھا جس نے ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے جلتے ہُوئے مکان اور ان میں زندہ جلتے ہُوئے بچّے دیکھے تھے۔ لوہاری بازار کی آگ میں ایک ماں کی چیخوں نے میرا روپ بدل دیا اور مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے اس ایک بچّے کو زندہ جلانے کے لیے ہندوؤں نے اتنی بلڈنگوں کو آگ لگا دی ہے۔ میرے اندر سے جیسے کسی نے مجھے للکارا ہو — جیدے! تیرے ملک میں کوئی بچّہ زندہ نہ جلے۔ کُود جا اس آگ میں — اور میں آگ میں کُود گیا۔"

"ادے جیدے!" — بشیرے نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "تم اب ہماری منڈلی میں بیٹھنے کے قابل نہیں رہے۔ تم تو تعلیم یافتہ آدمیوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ اگر تمھارے اندر تعلیم زور مار رہی ہے تو اِدھر اُدھر ہو جاؤ، لیکن جاؤ گے کہاں؟ ناجا ملتانی یاد ہے تمھیں؟ پانچ چھ سال کی بات ہے۔ اُس نے بھی توبہ کر لی اور الگ ہو بیٹھا تھا۔ سات آٹھ روز بعد اخباروں میں چار کانسٹیبلوں، ایک ہیڈ کانسٹیبل اور ایک اے۔ ایس۔ آئی کی فوٹو چھپی تھی۔ ان کے سامنے ناجے ملتانی کی لاش پڑی تھی۔"

"ہاں۔ مجھے یاد ہے" — جیدا نے کہا — "ساتھ خبر تھی کہ بدنام ڈاکو ناجا ملتانی پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔"

"یہ میں جانتا ہوں کہ اُسے کہاں بلا کر پیچھے سے ریوالور کی ایک گولی ماری گئی تھی" — بشیرے نے کہا — "اور لاش پر رائفلوں کی پانچ گولیاں چلائی گئی تھیں۔ کھاڑدر کے جبّارے کی لاش برنس روڈ پر پڑی ملی تھی۔ خبر چھپی تھی کہ رات ایک کار اسے کچلتی ہوئی گزر گئی ہے۔ کار کا سراغ نہیں لگایا جا سکا۔ اُس نے ملک سے باہر جا کر حلال کی کمائی کا ارادہ کیا تھا۔ اس کے سینے میں نیپیئر روڈ کی گانے والی انوری بھوپالی کے قتل کا راز تھا۔ اُسے آج کا وزیر تمھارا آغا اپنی داشتہ بنانا چاہتا تھا اور وہ نہیں مان رہی تھی۔"

"وہ تو انڈیا کے مہاراجوں کی چیز تھی یار!" — جیدا نے کہا — "بہت خوبصورت تھی۔"

"اُسے جبّارے کے ہاتھوں قتل کرایا گیا تھا" — بشیرے نے کہا — "جبّارے نے اُسے قتل تو کر دیا لیکن اُس نے دوسرے دن انوری کی پوسٹ مارٹم کی ہوئی لاش دیکھی تو اُس کا دماغ پھر گیا۔ اُس نے سب سے کہا کہ وہ ملک سے باہر جا رہا ہے۔ آغا اور پولیس کے ایک افسر کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ جبّارے جیسا ظالم ڈکیت کیوں منہ پھیر گیا ہے۔ وہ نہ مانا تو اُسے آدھی رات کے بعد اُسی کے دو ساتھی ایک شکار کا لالچ دے کر برنس روڈ پر لے آئے۔ اُدھر سے ایک بس آئی جو جبّارے کو کچل کر غائب ہو گئی۔"

بشیرے نے اُسے تین چار اور جرائم پیشہ آدمیوں کے قصّے سنائے اور کہا — "سرکاری غنڈہ گردی میں بہت پیسہ ہے جیدا بھائی! بڑی عیش ہے۔ وزیر بدلتے رہتے ہیں۔ ہمیں کوئی نہیں بدل سکتا۔ حکمرانوں کے مخالفوں کے خلاف جو جھوٹے مقدمے بنائے جاتے ہیں ہم ان میں جھوٹی گواہی دینے کے لیے ہر وقت اور ہر کسی کے لیے تیار رہتے ہیں۔ وزیروں کے نیچے سے کرسیاں سرکتی رہتی ہیں ہماری بادشاہی قائم رہتی ہے مگر ہم اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتے۔ حاکم ہم پر نظر رکھتے ہیں۔ جو راز ہمیں معلوم ہوتے ہیں وہ نئے حکمران کو معلوم نہیں ہوتے۔"

"اس کے باوجود مجھے یہاں سے جانا ہے" — جیدا نے کہا۔

"میرا باپ انڈیا سے آگیا تھا" — بشیرے نے کہا — "تمھیں بتا چکا ہوں کہ تالے توڑنے والے استادوں کا استاد تھا لیکن اُس کا اُٹھنا بیٹھنا سیاسی لوگوں میں تھا۔ اُس کے لباس اور اُس کی باتوں سے کوئی شک بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ آدمی قفل شکن ہے۔ اُس نے پاکستان مانگنے والے مسلمانوں کے خلاف بہت کام کیا تھا۔ وہ دو مسلمان جاگیرداروں کا آدمی تھا۔ وہ دونوں انگریزوں کے آدمی تھے۔ میرے باپ نے اُن کی پشت پناہی سے اپنے علاقے کے مسلمان لیڈروں اور کام کرنے والوں میں سے کئی ایک کو قتل اور ڈاکے کی دھمکیاں دے دے کر پاکستان کے راستے سے ہٹا دیا تھا۔ اُس نے دو آدمیوں کو قتل کیا اور دو کے گھروں میں نقب لگائی تھی....

"اُنہی علاقوں میں جب مسلمانوں کو ہندوؤں اور سکھوں نے قتل کرنا شروع کر دیا اور مسلمان عورتوں کی آبروریزی ہونے لگی تو میرے باپ کا دل ایسا مڑا کہ اُس نے اپنے پیشے پر اور اپنے آپ پر سَو سَو لعنت بھیجی اور وہ لاہور آگیا۔ ایک سال بعد جب پاکستان بنانے والا قائدِ اعظم دنیا سے اٹھ گیا تو انگریزوں کے وہی جاگیردار جو پاکستان کا نام لینے والوں کو قتل اور ڈکیتی کی دھمکیاں دلاتے تھے اور جنہوں نے قتل کرائے بھی تھے پاکستان کے سیاسی میدان میں آ گئے۔ وہ یہاں بھی جاگیردار تھے۔ میرے باپ کی بدقسمتی کہ میرا باپ اُن کے سامنے چلا گیا اور ایسے طریقے سے قتل ہو گیا کہ پولیس قاتل کا سراغ نہ لگا سکی۔"

"تم میری مدد کر سکتے ہو؟" — جیدا نے کہا — "مُنّا اور ٹیپو میرے دو بازو تھے۔ دونوں ٹوٹ گئے ہیں اور اُنہوں نے علاقے کے تھانیدار کو بھی میرا دشمن بنا دیا ہے۔"

"تم دراصل اُکھڑ گئے ہو جیدے بھائی!" — بشیرے نے کہا — "ورنہ مُنّے اور ٹیپو کی کیا حیثیت ہے اور علاقے کے تھانیدار کی کیا مجال کہ سر بھی اٹھا سکے۔ حکومت تمھارے ہاتھ میں ہے.... سوچ لو۔ پھر سوچو۔ ایک عورت کے پیچھے اپنی حیثیت تباہ نہ کرو۔ اپنی جان خطرے میں نہ ڈالو۔ اگر طبیعت پھر بھی نہ جمے تو مجھے بتانا۔ گاڑی دوں گا۔ اپنے آدمی دوں گا۔ جہاں کہو گے وہاں چھوڑ آئیں گے۔"

جیدا پیدل چلا جا رہا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ فٹ پاتھوں پر لوگوں کے ہجوم میں اور ہجوم کی رفتار میں اضافہ ہو گیا تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت بڑھ گئی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سورج غروب ہوتے ہی شہر جاگ اٹھا ہو اور لوگ جیسے گھروں سے نکل آئے ہوں۔ فٹ پاتھوں پر چلنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ سیلاب کی طرح ہجوم فٹ پاتھوں سے سڑکوں پر بہہ نکلا تھا۔ بسیں مسافروں سے اٹی ہوتی تھیں۔ دن بھر کی مشقت کے مارے ہوئے لوگ گھروں کو جا رہے تھے اور جو دن بھر گھروں میں بیٹھے رہے تھے وہ کراچی کی رونق دیکھنے کے لیے سڑکوں پر نکل آئے تھے۔

یہ انسانوں کا سیلابی دریا تھا جس میں جیدا بہا چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنے زور پر اور اپنے قدموں سے چلنے والا انسان تھا مگر آج شام وہ دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے سے دھکے کھا رہا تھا۔ اُس کے کندھوں سے لوگ ٹکراتے جا رہے تھے۔ کراچی کے ہجوم میں کسی کو اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ کسی کو دھکا یا کندھا لگ جائے تو معذرت کر لے۔ وہاں دھکے دینے اور دھکے کھانے کا رواج ہے۔ کسی کی تھوکی ہوئی پان کی پیک کسی کے کپڑوں پر پڑ جائے تو بھی معذرت اور معافی کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی البتہ

گالی گلوچ کر لی جاتی ہے۔

جیدا ایسے ہجوم دیکھ کر بہت خوش ہُوا کرتا تھا۔ اُسے شکار اسی ہجوم میں ملا کرتا تھا، یا اُسے مسافروں سے اٹی ہوئی بسوں میں شکار ملا کرتا تھا۔ بسوں میں رَش کے دو وقت ہی ہوتے تھے۔ ایک صبح کو جب لوگ روزمرہ کام کاج کے لیے گھروں سے نکلتے تھے اور دوسرا وقت شام کا تھا جب لوگ گھروں کو واپس جانے کے لیے بسوں پر ہلّہ بول دیا کرتے تھے مگر آج شام جیدا سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔

وہ لاشعوری طور پر رک گیا۔ ذرا سا گھوما اور دو سیڑھیاں چڑھ کر ایک دروازے میں داخل ہو گیا تب اُسے خیال آیا کہ وہ اپنے پسندیدہ ہوٹل میں آ گیا ہے۔ دو بیرے دوڑے آئے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ جیدا اُستاد ہے۔ پانچ روپے کے بل پر دس روپے بھی دے جاتا ہے۔ جیدا نے انھیں دیکھا تو اسے بھوک کا احساس ہُوا۔ صبح سے اُس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اُس نے بیروں سے کہا کہ کھانا لے آؤ، جو جی میں آتے لے آؤ۔

کھانا آنے تک وہ خیالوں اور یادوں کی وادیوں اور سنگلاخ گزرگاہوں میں بھٹک گیا۔ اُسے اپنا بچپن یاد آیا۔ ماں یاد آئی، باپ یاد آیا، ان کا پیار یاد آیا، ماں کی گود کی تپش اور سرور یاد آیا — اور پھر اُسے وہ تلخیاں یاد آنے لگیں جن میں سے اُسے ماں اور باپ کی موت نے گزارا تھا۔ اس سے پہلے اُسے وہ دَور کم ہی کبھی یاد آیا تھا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اِس عمر میں بھی اُسی دور کی مسرّتوں اور ملال، شیرینی اور تلخیوں کے زیرِ اثر ہے اور وہ ذہنِ لاشعور کے حکم سے زندگی گزار رہا ہے۔ اب جب اُسے گم گشتہ پیار مل گیا تھا، اس کے ذہنِ لاشعور کے پٹ کھل گئے اور اس میں جو زہریلا دُھواں بھرا ہُوا تھا، وہ نکل گیا۔

اُس کے اندر جو نفسیاتی انقلاب آ گیا تھا، اسے وہ سمجھنے سے قاصر تھا اور اس کے آگے وہ بے بس تھا۔ اتفاقات نے اس کا وہ علاج کر دیا تھا جو نفسیات کا کوئی ڈاکٹر برسوں تک نہ کر سکتا۔ وہ اب اُس کش مکش کے مرحلے میں تھا جو دیوانگی اور فرزانگی کے درمیان ہوتی ہے۔ وہ یوں بھی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ ریگزار میں بڑا ہی لمبا سفر کر کے نخلستان میں پہنچا ہو۔ وہ سکون اور قرار سا محسوس کرنے لگا مگر یہ نخلستان اُسے آسیب زدہ نظر آ رہا تھا۔ اس پر آسیبی سائے پڑ رہے تھے۔

"کہیں لڑائی ہو گئی تھی اُستاد؟" — بیرے کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ بیرا کہہ رہا تھا — "سر پر پٹیاں کیوں باندھ رکھی ہیں؟"

جیدا ہنس پڑا۔ وہ ہنسی آتے بغیر اس خیال سے ہنسا تھا کہ بیرا مایوس نہ ہو۔ میز پر کھانا پڑا تھا۔ جیدا نے بیرے کو ویسے ہی کوئی جواب دے کر ٹالنے کی کوشش کی مگر بیرے نے میز پر ہاتھ رکھ دیے اور اِدھر اُدھر دیکھ کر اُس پر جھک گیا۔

"استاد!" — بیرے نے کہا — "دن کو مُنّے اور ٹیپو نے یہیں کھانا کھایا تھا۔ تمھارے ساتھ ان کی کوئی گڑبڑ تو نہیں؟"

"کیا کہتے تھے؟"

"مجھ سے تو اُنہوں نے کچھ نہیں کہا" — بیرے نے جواب دیا — "آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں ان کے آگے کھانا رکھ رہا تھا تو ٹیپو مُنّے سے کہہ رہا تھا کہ بس آج کی رات، کل کا دن اور کل کی رات

دیکھیں گے۔ اگر کل رات تک سیدھے راستے پر آجاتا ہے تو دوستی پکی رکھیں گے۔ اگر نہیں تو پرسوں سویرے اُس حرامزادی ناز کو یہیں رکھیں گے۔ پھر اُنھوں نے تمھیں گالی دے کر کہا تھا کہ اسے ابّن کے ساتھ لٹا دیں گے.... اور مُنّے نے کہا تھا کہ دوستی پکّی رہے تو اچھا ہے نہیں تو اپنی بے عزّتی کا بدلہ ضرور لیں گے۔ مُنّے نے یہ بھی کہا تھا کہ صدیقی مدد کرے گا۔ وہ دھوکہ نہیں دے گا.... اُستاد! صدیقی بھاینیدار تو نہیں؟"

"شاید وہی ہو۔"

"میں نے ان سے تمھاری پوچھی کہ اُستاد کیسا ہے تو دونوں نے ایسے جواب دیئے کہ صاف پتہ چلتا تھا کہ تمھارے ساتھ ان کی کوئی کھٹ پٹ ہو گئی ہے۔"

یہ بیرے جرائم پیشہ استادوں کے بھی مخبر ہوتے تھے اور پولیس کے بھی۔ ہوٹلوں میں لوگ آتے ہی رہتے تھے۔ بہت دیر بیٹھتے بھی تھے۔ ہر قسم کی باتیں کرتے تھے۔ ان میں کچھ باتیں راز کی بھی ہوتی تھیں۔ کچھ دلچسپ خبریں اور کچھ باتیں کسی کے کام کی ہوتی تھیں۔ بیرے بظاہر انجان بنے رہتے جیسے انہیں کسی کی باتوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ ہو مگر کام کی باتیں اُس آدمی تک پہنچ جاتی تھیں جس کے کام کی ہوتی تھیں۔ یہ بیرا جو جیدا کو مُنّے اور ٹیپو کی باتیں سنا رہا تھا، اُس کا مُخبر تھا۔ جب کبھی اسے جیدا کے کام کی کوئی بات معلوم ہوتی وہ اُس تک پہنچا دیا کرتا تھا۔

جیدا نے کھانا کھا کر اُسے بل کے علاوہ کچھ پیسے دیئے اور ہوٹل سے نکل گیا۔

"آج کی رات۔ کل کا دن۔ کل کی رات"۔۔۔ جیدا سوچتا جا رہا تھا۔۔۔ "کل رات اُسے ناز اور بچّے کو کہیں غائب کرنا ہے.... کہاں؟.... کہاں؟.... بوڑھے موسیقار کے گھر؟.... نہیں۔ مُنّے اور ٹیپو کو وہ ٹھکانہ معلوم ہے.... مُنّے اور ٹیپو کے ساتھ اب دوستی نہیں ہو سکتی۔ دشمنی پکّی ہو چکی ہے۔"

اس نے سوچا کہ اپنے گروہ کے دوسرے آدمیوں کو مدد کے لیے اکٹھا کر لے لیکن مُنّے اور ٹیپو کے ساتھ لڑائی کا خطرہ تھا۔ وہ لڑائی سے ڈرنے والا نہیں تھا مگر اب ڈر یہ تھا کہ وہ پکڑا جائے گا، پکڑا نہ گیا تو مارا جائے گا، زخمی ہو جائے گا اور ناز کو مُنّا اور ٹیپو لے جائیں گے۔

اُسے اُس وزیر کا خیال آیا جسے کامیاب کرنے کے لیے اُس نے اُس کے مخالف لیڈروں کے جلسے اکھاڑے تھے مگر وہاں بھی یہی خطرہ تھا کہ وزیر اپنی سیاہ کاریوں پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے اُسے پولیس مقابلے میں مروا دے گا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا جا رہا تھا۔ ہجوم سے بچنے کی وہ ذرا سی بھی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ اُسے جیسے گھر جانے کی بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ کبھی وہ اپنے آپ میں شکست خوردگی محسوس کرنے لگتا، کبھی وہ سینہ پھلا لیتا کہ وہ جرم و گناہ کی زندگی کو لات مار چکا ہے۔ وہ انسانوں کے ہجوم میں اور حالات کی آندھی میں تنکے کی طرح اُڑا جا رہا تھا۔ سوچ سوچ کر اُس کا دماغ تھک گیا تھا۔ اُسے یہ بھی احساس نہ تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔

اچانک ایک اور ہی قسم کے شور نے اسے خیالوں اور سوچوں سے بیدار کر دیا۔ اُس نے چونک کر دیکھا۔ آگے ہجوم ایک جگہ رکا کھڑا تھا۔ روشنیاں بے شمار تھیں۔ بہت سے لوگ پیٹرومیکس لیمپ اٹھائے اِدھر اُدھر گھوم پھر رہے تھے۔

یہ لوہڑی بازار کی جلی ہُوئی عمارتیں تھیں۔ وہ اس شاپنگ سنٹر کو پہچان نہ سکا۔ کل ہی یہاں آگ لگی تھی کہیں کہیں سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا۔ سیاہ کالی دیواریں کھڑی تھیں۔ جلے ہُوئے ان کھنڈروں میں لوگ پیٹرومیکس اٹھائے کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ بعض عمارتیں گری نہیں تھیں۔ ایک تو اُن لوگوں کا ہجوم تھا جو یہاں رہتے تھے اور ان سے کئی گُنا زیادہ ہجوم تماشائیوں کا تھا۔

"ملبے سے جلی ہُوئی لاشیں نکل رہی ہیں"۔۔۔ جیدا کے کانوں میں کسی کی آواز پڑی۔

"یہاں کے رہنے والے اپنا سامان نکال رہے ہیں"۔۔۔ ایک اور آواز۔

"سب جل گیا ہے"۔۔۔ کسی اور نے کہا۔۔۔ "اب یہاں کیا ملے گا۔"

جیدا کے اردگرد شعلے ناچنے لگے۔ وہ ان کی ہیبت ناک آواز سُننے اور ان کی تپش محسوس کرنے لگا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ رک کر جلی ہُوئی عمارتوں کو دیکھنے لگا پھر آہستہ آہستہ ہجوم کے قریب ہو گیا۔ اُس کے سر پر ایک بلب جل رہا تھا۔ جیدا کو خیال آیا کہ کراچی کے اٹھائی گیر بھی ملبے اور جلے ہوئے کھنڈروں میں لوگوں کا سامان ڈھونڈ رہے ہوں گے اور جیب کترے بھی اپنا کام کر رہے ہوں گے۔

ایک عورت جلی ہوئی عمارتوں کی طرف دیکھتی جیدا کی طرف بڑھتی آ رہی تھی۔ وہ اسی کھمبے کے پاس آ رکی جس کے ساتھ جیدا لگا کھڑا تھا۔ جیدا نے بھی توجہ نہ دی کہ اُس کے پاس ایک عورت کھڑی ہے۔ عورت نے دو سال کا بچہ اٹھا رکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک آدمی ہاتھ میں لمبے سائز کی ٹارچ اٹھائے کھمبے کی طرف آیا۔ اُس نے ایک سوٹ کیس اُٹھا رکھا تھا۔

"کچھ اور سلامت ہے؟"۔۔۔ جیدا کے پاس کھڑی عورت نے آگے بڑھ کر اس آدمی سے پوچھا۔

"بڑا ٹرنک سلامت ہے"۔۔۔ اُس آدمی نے جواب دیا۔۔۔ "اس کی تپش سے اندر کپڑے نہ جل گئے ہوں۔ مجھ سے اٹھتا نہیں۔"

"میں ساتھ چلوں؟"۔۔۔ عورت نے کہا۔

"نہیں"۔۔۔ آدمی نے کہا۔۔۔ "تم بچے کو اٹھاؤ گی یا ٹرنک اٹھواؤ گی.... میں کسی سے کہتا ہوں لیکن مانے گا کون۔"

"مجھے کہو بھائی!"۔۔۔ جیدا بول پڑا۔۔۔ "اس مصیبت کے وقت کون نہیں مانے گا۔"

"بڑا احسان ہوگا بھائی صاحب!"۔۔۔ اُس آدمی نے کہا۔۔۔ "بڑی نیکی ہوگی۔"

جیدا اُس کے ساتھ جلے ہُوئے کھنڈر میں چلا گیا۔ وہاں بدبُو تھی۔ ہر طرح کی چیزیں جلی تھیں۔ ان میں چمڑے کی چیزیں بھی تھیں۔ لکڑی کی سیڑھیاں مکمل طور پر جل چکی تھیں۔ ایک طرف لوہے کی گول سیڑھیاں تھیں۔ ان سے لوگ اُتر اور چڑھ رہے تھے۔ جیدا اُس آدمی کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ یہ دوسری منزل تھی۔ وہ برآمدے میں چلے گئے۔ ملبے سے بچتے بچاتے وہ ایک کمرے میں داخل ہُوئے۔ اُس آدمی نے ٹارچ روشن کر رکھی تھی۔

کمرے کی دیواریں سیاہ تھیں۔ ایک طرف سے چھت کا کچھ حصہ گرا ہُوا تھا۔ کمرے میں ایک ٹرنک پڑا تھا۔ باقی سب کچھ جلا ہُوا تھا۔

"ساتھ والے کمروں میں کچھ بھی نہیں بچا" ــــ اُس آدمی نے کہا ــــ "یہ ٹرنک رہ گیا ہے۔ آیئے، یہ اُٹھا لے چلتے ہیں"

جیدا کی ہنسی نکل گئی۔

"آپ ہنس رہے ہیں؟" ــــ اُس آدمی نے کہا۔

"ہاں!" ــــ جیدا نے کہا ــــ "مجھے اپنے آپ پر ہنسی آگئی ہے۔ آپ کی تباہی پر تو رونا آتا ہے"

"ہنسی کس بات پر آئی ہے؟"

"آپ یقین نہیں کریں گے" ــــ جیدا نے کہا ــــ "کل جب آگ لگی تو میں بھی دیکھنے آیا تھا۔ باہر سڑک پر ایک عورت کو روتے چلّاتے دیکھا۔ اُس کا بچہ جلتی ہوئی عمارت میں رہ گیا تھا۔ اُس عورت کا خاوند اُسے کہہ رہا تھا کہ بچہ جل چکا ہوگا"

"پھر کیا ہُوا تھا؟" ــــ اُس آدمی نے اشتیاق سے پوچھا۔

"میں نے دوڑ کر فائر بریگیڈ والوں کی سیڑھی اٹھائی اور اُس بلڈنگ کی بالکونی سے لگا کر اوپر چڑھ گیا" ــــ جیدا نے کہا ــــ "میں کمرے میں چلا گیا، پھر میں بچّے کو اٹھا کر آگ سے نکال لے گیا"

"شاید آپ کسی اور کے بچے کی بات کر رہے ہوں گے" ــــ ٹارچ والے آدمی نے کہا ــــ "میرا بھی بچّہ اس کمرے میں رہ گیا تھا اور ایک اجنبی نے اُسے نکال لیا تھا مگر وہ اس بلڈنگ کی سب سے اُوپر والی منزل کی چھت پر چلا گیا اور اس کی منڈیر سے کود کر ایک درخت پر جا پڑا تھا"

"وہ بچّہ آپ کا تھا؟" ــــ جیدا نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ وہ بچّہ میرا تھا"

"اگر بچّے کو بچانے والا آدمی جلتی ہُوئی عمارت کی منڈیر سے درخت پر کُود گیا تھا تو وہ میں تھا" ــــ جیدا نے کہا ــــ "میرا سر زخمی ہُوا اور میری ٹانگ جل گئی ہے"

اُس آدمی نے جیدا کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔

"ہاں" ــــ اُس نے جوشیلی آواز میں کہا ــــ "وہ آپ ہی تھے۔ آپ کی صُورت تو میں ساری عمر نہیں بھول سکتا۔ کیا آپ کو میری بیوی نے پہچانا نہیں تھا؟"

"وہ جو میرے پاس کھمبے کے ساتھ کھڑی تھی؟"

"ہاں جی!" ــــ اُس آدمی نے جواب دیا ــــ "وہی.... وہ میری بیوی ہے اور اُس نے اُس بچے کو اُٹھا رکھا ہے جسے آپ نے آگ سے نکالا تھا"

"اُنھوں نے میری طرف نہیں دیکھا" ــــ جیدا نے کہا ــــ "نہ میں نے انھیں پہچاننے کی کوشش کی تھی"

بچّے کا باپ جیدا سے بغلگیر ہوگیا اور جذبات کا ایسا غلبہ ہُوا کہ اُس کی سسکیاں نکل گئیں۔ اگر جیدا اُسے یہ نہ کہتا کہ آؤ، ٹرنک اُٹھا کر نکل چلیں، تو وہ جیدا کو اپنے بازوؤں کے گھیرے سے کبھی الگ نہ کرتا۔ اُنھوں نے ٹرنک اِدھر اُدھر سے پکڑ کر اٹھایا اور باہر کو چل پڑے۔ قدم قدم پر ٹھوکر لگتی تھی۔ کہیں اینٹیں پڑی تھیں کہیں جلی ہُوئی لکڑی اور کئی اور چیزیں جس برآمدے میں سے وہ گزر رہے

تھے، وہ لرز رہا تھا۔ اس کا فرش جو سب سے نیچے والی منزل کی چھت تھی، اتنے زیادہ آدمیوں کا وزن اٹھانے کے قابل نہیں تھا۔ اسی بلڈنگ کا ایک حصہ گر چکا تھا۔ یہ اُس وقت گرا تھا جب جیدا بچے کو اپنی پیٹھ کے پیچھے باندھ کر آخری منزل کی منڈیر سے درخت پر کود گیا تھا۔

لوگ اپنے اپنے کمروں کی تلاشی لینے آتے تھے۔ عورتیں رو رہی تھیں۔ اُن کے گھر جل گئے تھے۔ دو تین آدمی کہیں کھڑے چلّا رہے تھے ــــ "چھتیں کمزور ہیں۔ اتنے آدمی مت اُوپر جاؤ.... نیچے چلے جاؤ.... یہاں کچھ نہیں رہا" ــــ پھر بھگدڑ سی مچ گئی۔ پولیس اُوپر آگئی تھی اور لوگوں کو نیچے جانے کو کہہ رہی تھی۔ چھتیں اور دیواریں گرنے کا خطرہ تھا۔

جیدا اور بچے کا باپ بڑی مشکل سے لوہے کی گول سیڑھیوں سے اُترے۔ ٹرنک وزنی تھا۔

بچے کی ماں کو جب پتہ چلا کہ اُس کے بچے کو آگ سے زندہ نکالنے والا یہ شخص تھا تو اُس نے بے ساختہ جیدا کا ایک ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ جیدا نے بچے کو دیکھا تو بچہ مُسکرانے لگا۔ جیدا نے اُس بلڈنگ کو دیکھا جس میں سے اُس نے بچے کو نکالا تھا۔ اس کی چار منزلہ بلندی دیکھی پھر سڑک کے دوسرے کنارے اس درخت کو دیکھا جس پر وہ گرا تھا۔ اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا کہ مجھے کوئی اب اُس منڈیر سے درخت پر کُودنے کے عوض ساری دنیا کی بادشاہی دینے کا وعدہ کرے تو بھی میں نہ کود سکوں۔

"بلڈنگ کا وہ حصہ اس کے فوراً بعد گر پڑا تھا" ــــ بچے کے باپ نے کہا ــــ "کیا آپ نے خودکُشی کی کوشش کی تھی یا آپ کو اعتماد تھا کہ آپ درخت تک پہنچ جائیں گے؟"

"خودکُشی" ــــ جیدا نے کہا ــــ "میں جل کر مرنے سے ڈرتا تھا۔ مجھے گر کر مرنا بہتر لگا تھا" ــــ اُس نے ذرا سوچ کر کہا ــــ "میرا خیال ہے کہ انسان کچھ کرنے کا ارادہ کر لے تو اُس میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ ناممکن کو بھی ممکن بنا سکتا ہے"

"اُس روز آپ رُکے نہیں تھے" ــــ بچے کی ماں نے کہا ــــ "اب آپ کو ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا"

"کہیں ٹھکانہ مل گیا ہے؟" ــــ جیدا نے پوچھا۔

"اسی سینیا لائنز کے کوارٹروں میں میرا ایک دوست رہتا ہے" ــــ بچّے کے باپ نے کہا ــــ "اُس کے بیوی بچے یہاں نہیں۔ اُس نے کوارٹر ہمیں دے دیا ہے"

جیدا کو ناز کے پاس پہنچنے کی جلدی تھی مگر بچے کی ماں اور اُس کے باپ نے ایسا بیتابانہ اصرار کیا کہ جیدا اُن کے ساتھ چل پڑا۔

وہ کوارٹر میں داخل ہوئے۔ کمرے کی تیز روشنی میں اُنھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو کوئی شک نہ رہا کہ بچے کو بچانے والا یہی شخص تھا۔ جیدا نے بچے کو غور سے دیکھا تو اُس کی ذہنی حالت کچھ اور ہوگئی۔ اُسے اپنا بچپن یاد آگیا۔ اُس کی آہ نکل گئی جیسے سوچ رہا ہو کہ جس آگ میں وہ برسوں سے جل رہا ہے، اس میں سے اُسے کون نکالے گا۔

"آپ نے ہار کیوں نہیں لیا تھا؟" — بچے کی ماں نے پوچھا — "خدا نے ہمیں یہ بچہ گیارہ سال بعد دیا تھا۔"

"میں ہار لیا نہیں کرتا" — جیدا نے بے خیالی سی میں کہا — "میں ہار اُتارا کرتا ہوں" — یہ کہتے ہی وہ چونک پڑا۔ اُس کی ذہنی کیفیت ایسی تھی کہ یہ الفاظ اُس کے مُنہ سے نکل گئے۔

بچے کے ماں باپ ہنس پڑے جیسے جیدا نے مذاق کیا ہو۔

"آپ کیا کام کرتے ہیں؟" — جیدا نے بات کا رُخ بدلنے کے لیے بچے کے باپ سے پوچھا۔

"میں پولیس کے محکمے میں ہوں" — اس نے جواب دیا — "میرا نام اِمتیاز ہے۔ میں آئی جی کا سٹینو ہوں۔ پولیس سے کوئی کام ہو تو مجھے بتانا۔"

"ہاں جی، ضرور بتانا" — بچے کی ماں نے کہا — "ہم آپ کی اتنی زیادہ خدمت کرنا چاہتے ہیں ..... اتنی زیادہ کہ ..... آپ کچھ بتائیں ....."

"آپ میری اتنی زیادہ خدمت نہیں کر سکیں گے" — جیدا نے امتیاز سے کہا — "میری خدمت کوئی نہیں کر سکتا۔"

"آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

"میں پولیس کا قریبی عزیز ہوں" — جیدا نے کہا۔

"اچھا۔ اچھا" — امتیاز نے ہنس کر کہا — "آپ کا کوئی عزیز پولیس میں ہے۔"

"جی نہیں" — جیدا نے کہا — "پولیس کو میں عزیز ہوں" — جیدا خاموش ہو گیا اور اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

وہ ایسا بے چین ہُوا کہ امتیاز اور اُس کی بیوی نے اُس کی یہ تبدیلی دیکھ لی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ تب انھیں خیال آیا کہ جیدا کے سر پر پٹی بندھی ہوتی ہے۔

"آپ زخمی بھی ہو گئے تھے؟"

"جی، میں زخمی بھی ہو گیا تھا" — جیدا نے پاجامہ ذرا اُوپر کیا اور کہا — "ٹانگ ذرا زیادہ جل گئی ہے۔"

"اوہ" — بچے کی ماں کو جیسے بہت زیادہ صدمہ ہُوا ہو — "جلن کا زخم تو بہت درد کرتا ہے۔"

جیدا نارمل ذہن کا انسان نہیں تھا۔ اب تو وہ ایسے حالات میں اور ایسی نفسیاتی تبدیلی میں گھر گیا تھا کہ اُس کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ اُس پر جذبات کا غلبہ ہو گیا۔

"جلن کے درد سے میں واقف ہُوں" — جیدا نے کہا — "بلکہ عادی ہُوں۔ میں جلا ہُوا انسان ہوں میری بہن! میں جل رہا ہوں۔ اس آگ سے مجھے کوئی نہیں نکال سکتا۔"

"آپ کچھ دُکھی سے لگتے ہیں" — امتیاز نے کہا — "کیا آپ مجھے اپنا بھائی سمجھ کر اپنے متعلق کچھ بتائیں گے نہیں؟"

"آپ سمجھ نہیں سکے تھے" — جیدا نے کہا — "میرے مُنہ سے نکل گیا تھا کہ میں ہار لیا نہیں کرتا ہار اُتارا کرتا ہوں ..... اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں پولیس کا قریبی عزیز ہوں۔ میں آپ کو صاف بات بتا دیتا ہُوں" — اُس نے امتیاز کی بیوی سے مخاطب ہو کر کہا — "اگر آپ کا بچہ آگ میں نہ رہ

جاتا تو آپ کا ہار میرے پاس ہوتا۔ سارے پاکستان کی پولیس آپ کو ہار واپس نہ دلا سکتی" — اُس نے امتیاز سے پوچھا — "آپ آئی جی کے سٹینو گرافر ہیں۔ شاید آپ نے جیدا کا نام سنا ہو گا جو جیدا جیب کترا کے نام سے مشہور ہے۔"

"میرا خیال ہے میں نے یہ نام سنا ہے" — امتیاز نے کہا۔

"میرا نام جیدا ہے" — جیدا نے کہا — "میں سرکاری آدمی ہُوں جسے لوگ سرکاری غنڈہ کہتے ہیں۔ کراچی کے چور اُچکے مجھے اپنا اُستاد بلکہ پیر مانتے ہیں۔"

کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی۔ امتیاز اور اس کی بیوی کو جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔

"میں قابلِ نفرت انسان ہُوں" — جیدا کہہ رہا تھا — "آپ مجھے اتنی زیادہ خاطر تواضع کے قابل نہ سمجھیں۔ میں نے اگر آپ کے بچے کو آگ سے نکالا تھا تو آپ پر احسان نہیں کیا تھا ..... مجھے معلوم ہی نہیں کہ میں نے کیا کیا تھا۔ میرے کانوں میں جب ایک ماں کی یہ آواز پڑی تھی کہ میرا بچہ جلتے ہوئے کمرے میں رہ گیا ہے تو میں بھول گیا تھا کہ میں یہاں کیوں آیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا اپنا بچپن آگ میں جل رہا ہے ..... اپنے بچپن کی کچھ یادیں سینے میں لیے پھرتا ہوں، پھر میرے بچپن کو آگ میں پھینک دیا گیا تھا ..... میں جل رہا ہوں ..... میرے سینے میں ایک بچہ جل رہا ہے۔ میں نے اُسے آگ سے نکالا تھا مگر وہ آپ کا بچہ نکلا ..... میرے سینے کا بچہ جل رہا ہے۔"

جیدا کے آنسو بہنے لگے۔

"میں مان نہیں سکتا کہ آپ وہ جیدا ہیں جس کا نام آئی جی آفس میں بھی سُنا جاتا ہے" — امتیاز نے کہا — "میں نے اُس جیدا کی جو کہانیاں سُنی ہیں وہ آپ کی نہیں ہو سکتیں۔ ان کہانیوں والا جیدا رونے والا نہیں رُلانے والا ہے۔"

"میں لُٹا ہُوا لٹیرا ہُوں" — جیدا نے کہا — "میں مر کر قاتل بنا ہوں۔ میں تالے توڑتا ہوں کیونکہ میرا دل توڑا گیا تھا ..... آپ ٹھیک کہتے ہیں، میں اُن کہانیوں والا جیدا نہیں رہا جو آپ نے سنی ہیں۔ اب آپ جیدا کی آخری کہانی سنیں گے، پھر جیدا کا نام پولیس کی خفیہ فائلوں میں رہ جائے گا یا اُن سیاسی لیڈروں کے دلوں میں میرا نام کچھ دیر زندہ رہے گا جن کے مخالفین کو میرے گروہ نے دبا رکھا ہے۔ میری جگہ انہیں جو غنڈہ ملے گا اُسے وہ کہا کریں گے کہ تم سے پہلے جیدا ہُوا کرتا تھا۔ بڑے سے بڑے جلسے کو اکھاڑ پھینکتا تھا۔"

امتیاز اور اُس کی بیوی خاموشی سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ اُن کی زبانیں جیسے گنگ ہو گئی تھیں۔

"آپ اتنے حیران کیوں ہوتے جا رہے ہیں؟" — جیدا نے کہا — "تمام پیشہ ور ڈاکو، قاتل، رہزن، چور، جیب کترے، قفل شکن، اٹھائی گیر، بردہ فروش اور عصمت فروش میری طرح انسان ہوتے ہیں۔ انہوں نے درندوں کی کھالیں اوڑھ رکھی ہیں۔"

"پھر بھی میں آپ کو قابلِ نفرت نہیں سمجھتا" — امتیاز نے کہا — "آپ نے میرا گھر لُوٹا نہیں، میرے گھر کی خوشیاں آگ سے بچا کر مجھے دی ہیں۔"

امتیاز کے بولنے سے اُس کی بیوی بھی بول پڑی۔ کہنے لگی "ہمارے لیے تو آپ فرشتہ ہیں۔

ہم آپ کو چوروں کا استاد نہیں کہیں گے۔"

"میں آپ سے ایک بات پوچھوں گا" — امتیاز نے کہا — "آپ کے آنسو کیوں نکل آتے ہیں؟"

"آپ کو اپنا ہمدرد سمجھ کر" — جیدا نے ہاتھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا — "آپ نے کہا تھا کہ پولیس سے کام ہو تو بتاؤں.... میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ مجھے انعام دینا چاہتے ہیں میں اب آپ سے اپنا انعام مانگوں گا۔"

دونوں سُن ہو کے رہ گئے۔ وہ ڈر گئے کہ کراچی کا یہ خطرناک غنڈہ جسے پولیس نے بھی کھُلی چھٹی دے رکھی ہے، نہ جانے کیا مانگ بیٹھے۔ انہوں نے یہ کہنے کی بھی جرأت نہ کی کہ ہاں، ہم انعام دیں گے۔ کہو کیا مانگتے ہو۔

"میں یہ پیشہ چھوڑ رہا ہوں" — جیدا نے کہا — "میں کراچی سے نکل جانا چاہتا ہوں مگر اِس جال سے نکلنا ممکن نظر نہیں آتا۔ جن کے راز میرے سینے میں ہیں وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"کیا آپ شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں؟" — امتیاز کی بیوی نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا شریفانہ زندگی کیا ہوتی ہے" — جیدا نے کہا — "میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میں اب مجرموں کی دنیا میں نہیں رہ سکتا۔ مجھے آپ ناولوں، افسانوں اور فلموں والا ڈاکو نہ سمجھیں جو ڈاکہ زنی سے توبہ کر کے داڑھی رکھ لیتا ہے اور تسبیح ہاتھ میں لے کر مسجد کی طرف جاتا نظر آتا ہے" — اُس نے جھنجھلا کر کہا — "میں نہیں بتا سکتا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ اگر آپ کا تعلق پولیس کے ساتھ نہ ہوتا تو میں آپ کے ساتھ ایسی باتیں نہ کرتا۔"

"آپ اپنی مشکلیں بتائیں" — امتیاز نے کہا — "میں آئی۔ جی سے کہہ کر آپ کا کام کرا دوں گا۔"

"مجھے اپنی بیوی اور بچے کو ساتھ لے کر کراچی سے نکلنا ہے" — جیدا نے کہا — "اگر آپ جانتے ہیں کہ مجھ جیسے جرائم پیشہ آدمیوں کا پولیس اور ملک کی سیاست سے کیا تعلق ہے تو آپ میری مشکل سمجھ جائیں گے۔ مجھے میرے ہی بالکوں کے ہاتھوں مروا دیا جائے گا۔ مجھے پولیس کے ہاتھوں مروا کر مشہور کیا جائے گا کہ میں پولیس مقابلے میں مارا گیا ہوں۔"

"کیا آپ کے خلاف کسی عدالت میں کوئی کیس چل رہا ہے؟"

"نہیں" — جیدا نے جواب دیا — "کسی بھی عدالت میں میرا ایک بھی کیس نہیں۔ اِس لحاظ سے میری تختی صاف ہے لیکن بڑے بڑوں کے اعمال کی تختیاں میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ مجھ سے کوئی سی گارنٹی لے لیں، میں کسی کے خلاف کوئی بات نہیں کروں گا۔"

جیدا نے امتیاز کو تفصیل سے بتایا کہ وہ کیوں یہ پیشہ چھوڑ رہا ہے۔ ناز کا جب ذکر آیا تو وہ ذرا جھجک گیا اور بولا — "میری بیوی ہے اور آپ کی طرح ہمارا بھی ایک ہی بچّہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا بچہ بھی عادی مجرم بنے۔ اُس کی عمر آپ کے بچے جتنی ہے۔ وہ اب اچھا اور بُرا سمجھنے لگا ہے اس سے پہلے کہ اُسے پتہ چلے کہ اس کا باپ جیب کترا اور غنڈوں کا اُستاد ہے، میں اُس کے لیے ایک پاکیزہ اور گھریلو ماحول پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ میں اُسے ایسی جگہ لے جانا چاہتا ہوں جہاں کوئی مجھے نہ پہچان سکے۔"

جیدا جھوٹ بول رہا تھا۔ اُس نے بچّے کے متعلّق یہ کچھ نہیں سوچا تھا جو اُس نے بتایا تھا۔ یہ باتیں اس لیے اُس کی زبان پر آتی تھیں کہ اُس نے ناز کو اپنی بیوی اور اِبّن کی بیٹی کے بچّے کو اپنا بچّہ کہا تھا۔

"....اور میرے ساتھی مجھ پر شک کرتے ہیں کہ میں نے بوہڑی بازار کی آگ سے بڑا مال لُوٹا ہے اور جانے کتنی جیبیں کاٹی ہیں" — جیدا کہہ رہا تھا — "وہ مجھ سے حصّہ مانگتے ہیں میں انھیں بتاتا ہوں کہ میں نے ایک بچّے کو آگ سے نکالا ہے تو انہیں یقین نہیں آتا۔ اس سے ہم میں دشمنی پیدا ہو گئی ہے۔"

"تو کیا آپ ان کے ڈر سے کراچی سے بھاگ رہے ہیں؟" — امتیاز نے پوچھا۔

"نہیں" — جیدا نے کہا — "میں ان سے ڈرا ہُوا نہیں۔ میں انھیں یوں غائب کر سکتا ہوں کہ قیامت تک ان کا سراغ نہ ملے.... میں مر گیا ہوں یا شاید مجھے نئی زندگی مل گئی ہے۔"

جیدا نے اُسے سمجھانے کی پوری کوشش کی اور اُس کی یہ کوشش کامیاب تھی۔ امتیاز اُس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ جیدا کا احسان مند تھا۔

"اگر آپ اپنی بیوی اور بچے کو یہاں لا سکتے ہیں تو لے آئیں" — امتیاز نے کہا — "کل لے آئیں، پرسوں لے آئیں۔"

"آج رات" — جیدا نے کہا — "اگر آپ مجھے پناہ دے سکتے ہیں تو مجھے اپنی بیوی اور بچے کو ابھی لانا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے میں انہیں آسانی سے نہ لا سکوں۔ مجھے اپنی بیوی اور بچے کو اس طرح لانا پڑے گا جیسے انھیں اغوا کر رہا ہوں۔"

دروازہ ناز نے کھولا لیکن پہلے پوچھ کر کہ کون ہے۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ وہ بہت پریشان تھی۔ جیدا نے اُسے کہا کہ فوراً یہاں سے نکلنا ہے، پھر اُس نے مُنّے اور ٹیپو کے متعلق پوچھا۔ ناز نے اُسے بتایا کہ وہ دونوں واپس نہیں آئے۔ جیدا نے اُسے بتایا کہ رقم، زیورات اور کپڑوں کے سوا اور کچھ بھی ساتھ نہیں لے جا سکیں گے۔ اُس نے ناز کو یہ بھی بتایا کہ کہاں جانا ہے، اور یہ بھی کہ وہاں یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ میاں بیوی ہیں اور یہ اُن کا اپنا بچّہ ہے۔

ناز اٹیچی کیسوں میں کپڑے وغیرہ ڈالنے لگی اور جیدا اُس کمرے میں چلا گیا جس میں اِبّن دفن تھا۔ اُس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اُس نے لالٹین رکھ دی اور کمرے کے کونے میں رکھی ہُوئی کدال سے ایک جگہ سے فرش کھودا۔ ٹین کا بکس زیادہ گہرا دفن نہیں کیا گیا تھا۔ جیدا نے بکس باہر نکالے بغیر کھولا۔ اس میں سونے کے زیورات اور نوٹوں کی گٹھیاں پڑی تھیں۔ کچھ اور قیمتی سامان بھی تھا۔ جیدا نے سَو سَو روپے کے نوٹوں کی تین گٹھیاں اور کچھ زیورات نکال لیے اور بکس کا ڈھکنا بند کر دیا لیکن اس پر مٹی نہ ڈالی۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کا حصّہ بکس میں چھوڑ دیا تھا۔

اُس نے لالٹین کی روشنی میں کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ اس ہیبت ناک کمرے میں آ کر وہ خوش ہُوا کرتا تھا۔ اس کے جالوں سے، اس کی بدبُو سے، اس کی بدرنگ دیواروں اور کواڑوں سے اُسے پیار تھا۔ اُس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا کہ اس کمرے میں ایک لاش دفن ہے۔ اُس نے اِبّن کو

سال بھو کا پیاسا رکھ کر مارا تھا۔ اُسے کبھی افسوس نہیں ہُوا تھا مگر آج رات اُسے یُوں لگا جیسے اس کمرے میں کوئی عورت سسک رہی ہو۔ اُسے اپّن کی بیمار بیوی اور اُس کی جوان بیٹی یاد آئیں۔ اُس نے سکون کی آہ لی کہ اپّن کی بیٹی کے بچے کو گود لے کر اُس نے گناہ کا کفّارہ ادا کر دیا ہے لیکن یہ سکون زیادہ دیر قائم نہ رہا۔ اُس پر خوف طاری ہو گیا اور وہ کمرے سے نکل آیا۔ اُس کا دِل بیٹھا جا رہا تھا۔

اُسے یہاں سے جلدی نکلنا تھا کسی بھی وقت مُنّا اور ٹیپو آ سکتے تھے۔ اُسے سب انسپکٹر مظہر علی صدیقی سے بھی خطرہ تھا۔ وہ اپنے کمرے میں گیا۔ وہ ناز سے کہنے لگا تھا کہ بچّے کو اُٹھاؤ اور چلو مگر اُس کی نظریں ماں اور بچے کی تصویر پر جم کے رہ گئیں۔ یہ وہ تصویر تھی جو ناز نے بازار سے منگوا کر اس کمرے میں لٹکائی تھی۔ جیدا کے ریوالور کی دو گولیوں نے شیشہ چکنا چُور کر دیا تھا۔ ایک گولی بچّے کو لگی تھی ایک ماں کو۔ ناز نے تصویر وہیں لگی رہنے دی تھی۔

جیدا اس تصویر کو دیکھتا رہا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ اُسے اچانک ریوالور یاد آ گیا۔ اُس نے ناز سے ریوالور لیا اور بہت سی گولیاں بھی اُٹھا کیس میں رکھ لیں۔

مُنّا اور ٹیپو سب انسپکٹر صدیقی کے پاس تھانے میں بیٹھے ہُوتے تھے۔ اے۔ ایس۔ آئی اللہ داد بھی وہیں تھا۔

"یہ علاقہ تمھارا ہے"۔۔۔ سب انسپکٹر صدیقی انہیں کہہ رہا تھا "جب تک میں یہاں ہوں یہاں بادشاہی کرو۔ جیدا کی میں لاش دیکھنا چاہتا ہُوں۔ وہ اُس لڑکی کو ساتھ لے کر نہ نکل جاتے جو اُس نے اپنے پاس رکھی ہوئی ہے"۔

"جیدا کا دماغ تو اتنا خراب ہو گیا ہے کہ دن کو تم یہاں سے گئے تو وہ آ کر صدیقی صاحب کی بے عزّتی کر گیا"۔۔۔ اللہ داد نے کہا ۔۔۔ "اگر تم اُسے پار کر سکتے ہو تو ہم جو خدمت کر سکتے ہیں کریں گے۔ تم کچھ نہ کر سکو تو جلدی بتا دینا۔ ہم اُس کا بندوبست کر لیں گے"۔

"ہم تو چلے بیٹھے ہیں صدیقی صاحب!"۔۔۔ ٹیپو نے کہا ۔۔۔ "ایک تو وہ سارا مال ہضم کر گیا ہے دوسرے اُس کی چھوکری نے ہمیں پستول دکھایا ہے۔ گھر سے یار کے ساتھ بھاگی ہُوئی اور ہماری خریدی ہُوئی عورت ہم کو پستول دکھائے؟ آپ ذرا اپنی آنکھیں اور کان بند رکھیں۔ ہم نے اُسے کل رات تک مہلت دی ہے۔ وہ چلا جاتے اور چھوکری ہمیں دے جاتے"۔

"وہ زندہ نہ جاتے"۔۔۔ سب انسپکٹر صدیقی نے کہا ۔۔۔ "چھوکری بھاگ کے کہاں جائے گی تم جاؤ۔ اُسی مکان میں چلے جاؤ جہاں رہتے ہو۔ دیکھو وہ وہاں ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو آج رات ہی اُس کا قصّہ پاک کر دو اور اُسی کمرے میں دفن کر دو جہاں تم کہتے ہو کہ اُس نے پولیس کے وعدہ معاف گواہ کو مار کر دفن کیا تھا۔۔۔ میں یہ لاش برآمد کر کے اُسے گرفتار کر سکتا ہوں لیکن اس کی رسائی بہت اُوپر تک ہے۔ صاف بری ہو کر نکل آئے گا"۔

"ہم ابھی جاتے ہیں"۔۔۔ منّے نے کہا ۔۔۔ "آپ کو بڑی اچھی خبر سنائیں گے"۔

دونوں تھانے سے نکل گئے۔

وہ جب اپنے گھر کے دروازے پر پہنچے تو اُنہوں نے دیکھا کہ دروازہ کھلا ہُوا تھا۔ یہ دروازہ

کبھی یوں کھلا نہیں رہا تھا۔ دونوں اندر گئے اور دروازے کی زنجیریں چڑھا دیں۔ تمام کمروں میں اندھیرا تھا۔ وہ جیدا کے کمرے میں گئے۔ وہاں سیاہ کالا سکوت تھا۔ دونوں نے بیک وقت دیا سلائیاں جلائیں اندر کوئی نہیں تھا۔ اُنہوں نے لالٹین ڈھونڈ کر جلائی اور تمام کمروں میں گھوم گئے۔ وہاں جیدا تھا۔ نہ ناز۔ نہ بچّہ۔ وہ دوڑتے اُس کمرے میں گئے جہاں اپّن کی لاش اور بکس دفن تھا۔ دیکھا بکس کھودا پڑا تھا۔ ڈھکنا اُٹھا کر دیکھا۔ زیورات اور نوٹوں کی کچھ گٹھیاں پڑی تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا

"اُس نے مال کھودا ہے، نکالا کچھ نہیں" ٹیپو نے کہا۔

"ہم نے رقم گنی کب تھی"۔۔۔ مُنّے نے کہا ۔۔۔ "وہ کچھ نہ کچھ لے ضرور گیا ہے"۔

"وہ نکل گیا ہے"۔۔۔ ٹیپو نے کہا ۔۔۔ "معلوم نہیں کب آیا تھا اور کب گیا ہے۔ سالا چھوکری کو لے گیا ہے"۔

"ہم اُسے ڈھونڈیں گے"۔۔۔ مُنّے نے کہا ۔۔۔ "چلو صدیقی کو بتا دیتے ہیں۔ وہ اُسے ڈھونڈنے کا انتظام کر دے گا"۔

جس وقت مُنّا اور ٹیپو مکان میں داخل ہُوئے تھے، اُس وقت جیدا ناز اور بچّے کے ساتھ امتیاز کے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ امتیاز اور اُس کی بیوی نے بڑے پیار اور خلوص سے ان کا استقبال کیا۔ وہ سب بیٹھ گئے۔ ناز نے امتیاز کی بیوی کو غور سے دیکھا۔ وہ پہلے ہی ناز کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

"اری، تم ناز تو نہیں ہو؟"۔۔۔ امتیاز کی بیوی نے کہا ۔۔۔ "یا مجھے غلطی لگ رہی ہے"۔

"میں ناز ہی ہوں آپا!"۔۔۔ ناز نے جھینپتے ہوئے مری مری آواز میں کہا۔

"آپ نے شاید اسے نہیں پہچانا"۔۔۔ امتیاز کی بیوی نے ناز کے باپ کا نام لے کر امتیاز سے کہا ۔۔۔ "یہ اُن کی بیٹی ہے جو۔۔۔" اس سے آگے اُس نے کچھ نہ کہا۔ اُسے یہ کہنا اچھا نہ لگا کہ یہ لڑکی گھر سے بھاگ گئی تھی۔

امتیاز اور اُس کی بیوی حیدر آباد کے رہنے والے تھے۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے وہاں آباد ہوئے تھے۔ امتیاز کی بیوی کا گھر ناز کے گھر سے دور نہیں تھا۔ امتیاز کا گھر دُور تھا۔

"تمہیں دیکھ کر مجھے اپنا بھائی اسلم یاد آ گیا ہے"۔۔۔ امتیاز کی بیوی نے کہا ۔۔۔ "اگر تم بُرا نہ مانو تو کہہ دوں۔ لوگ کہتے تھے کہ تم اسلم کے ساتھ چلی گئی ہو مگر یہ بات غلط نکلی۔ میرا بھائی تھا تو آوارہ لیکن ایسا نہیں تھا۔ تمھارے جانے کے بعد وہ گھر آ گیا تھا"۔

اسلم جو ناز کو جیدا کے حوالے کر آیا تھا، امتیاز کی بیوی کا بھائی تھا۔ جیدا کی بلیک میلنگ سے تنگ آ کر وہ کراچی کے ایک ہوٹل کی تیسری منزل سے کود کر خودکشی کر چکا تھا اور اُس کی لاش لاوارث قرار دے کر پولیس نے کہیں دفن کر دی تھی۔

"اسلم آج کل کہاں ہے آپا؟"۔۔۔ ناز نے یوں پوچھا جیسے وہ اسلم کی موت سے بے خبر ہو۔

"کچھ پتہ نہیں"۔۔۔ امتیاز کی بیوی نے کہا ۔۔۔ "وہ بہت ہی آوارہ ہو گیا تھا۔ کراچی کے ایک آدمی نے بتایا تھا کہ وہ انگلینڈ چلا گیا ہے۔ وہ شاید واپس نہیں آئے گا"۔

ناز پریشان ہو گئی اور سوچنے لگی کہ امتیاز کی بیوی کو بتا دے کہ اُس کے بھائی نے اُسے دھوکہ دیا اور اپنے کیے کی سزا پا گیا ہے؟

امتیاز نے جیدا، ناز اور بچے کو پناہ میں لے لیا اور انہیں کہا کہ وہ انھیں کراچی سے نکالنے کا انتظام کر دے گا۔

"آگے یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ جہاں جائیں وہاں اپنا حلیہ ایسا رکھیں کہ کوئی آپ کو پہچان نہ سکے" — امتیاز نے جیدا سے کہا — "آپ کو مرے مٹے ہوئے انسانوں کی طرح رہنا ہوگا..... ڈیڑھ دو سال خیریت سے گزر گئے تو آپ تمام خطروں سے آزاد ہو جائیں گے۔ یہاں حکومتیں بدلتے دیر نہیں لگتی"۔

"ناز!" — امتیاز کی بیوی نے کہا — "تم چھپی رہنا۔ مرد اکیلا پاس سے گزر جائے تو کوئی اُسے آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، لیکن تم جیسی خوبصورت اور اتنے اچھے قد کاٹھ والی لڑکی ہجوم میں جا رہی ہو تو لوگ رُک کر اُسے دیکھتے ہیں۔ تم فوراً پہچانی جاؤ گی"۔

"جیدا بھائی!" — امتیاز نے کہا — "آپ ضرورت سے زیادہ ڈرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں"۔

"میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں کیوں ڈرا ہوا ہوں" — جیدا نے کہا — "صرف ایک بات آپ کو نہیں بتائی تھی..... میں ایک اور انسان سے بھی ڈر رہا ہوں میں اس سے آزاد نہیں ہو سکوں گا۔ یہ میرے ساتھ رہے گا، میرے تعاقب میں رہے گا"۔

"کون ہے وہ؟"

"وہ میں خود ہوں" — جیدا نے کہا — "میری بدنصیبی یہ ہے کہ میں لکھ پڑھ بھی سکتا ہوں۔ میں ایک ڈائری لکھتا رہا ہوں..... جلا ڈالی ہے۔ یہ ڈائری میری دکھیاری تنہائی کی ساتھی تھی۔ یہ میرے دکھ سُن کر اپنے سینے میں ڈال لیتی تھی۔ میرا سینہ ہلکا پھلکا ہو جاتا تھا مگر میں گناہوں کی اس دنیا سے رخصت ہونے لگا تو یہ ڈائری میری دشمن ہو گئی۔ اس میں میری ہر اک واردات لکھی ہوئی تھی۔ یہ ڈائری مجھے پھانسی کے تختے تک پہنچا سکتی تھی۔ میں اسے جلا آیا ہوں..... میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ میں اپنے آپ سے ڈر رہا ہوں۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے اپنے آپ کو جسے آپ ضمیر کہا کرتے ہیں، مارا نہیں۔ میرا جسم جُرم کرتا رہا، ضمیر میرے جسم سے لاتعلق رہا یا میں نے اسے لاتعلق رکھا۔ ضمیر شاید مرا نہیں کرتا۔ اب وہ بھی میرا دشمن ہو گیا ہے۔ مجھے پچھتانے پر مجبور کر رہا ہے۔ مجھے سزا دینے پر تُلا ہوا ہے"۔

"جیدا بھائی!" — امتیاز نے کہا — "فلاسفر بننے کی کوشش نہ کریں۔ سیدھی سی بات ہے کہ آپ اس ذلیل پیشے سے تنگ آ کر جا رہے ہیں۔ اب اسی حقیقت پر نظر رکھیں۔ آپ کا ذہن نارمل نہیں۔ آپ نے سر اور ٹانگ کے زخم کی پٹی بدلوائی نہیں۔ کل میں آپ کو یہاں قریب ہی ایک ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا"۔

"زخم میرے دل میں ہیں" — جیدا نے کہا — "میرا سینہ زخموں سے چھلنی ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا ہے کہ میرا ذہن نارمل نہیں۔ میں سمجھ نہیں سکتا کہ میرے اندر کیا طوفان اُٹھ رہا ہے۔ میں..... میں ایسے محسوس کر رہا ہوں کہ کچھ اور ہونے والا ہے۔ آپ نے یہ بھی ٹھیک کہا ہے کہ میں ضرورت سے زیادہ ڈر رہا ہوں۔ میں بزدل نہیں تھا۔ میں جانتا ہی نہیں تھا کہ ڈر ہوتا کیا ہے مگر میرا دل نہ جانے کیسی گرفت

میں آ گیا ہے۔ میں دوسروں سے جو کہتا پھرتا ہوں کہ مجھے کراچی سے نکالو، وہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے اپنے آپ پر بھروسہ نہیں رہا۔ اگر کسی نے میرا راستہ روکا تو وہ میرے ہاتھوں قتل ہو جائے گا، اور ہو سکتا ہے کہ میں خود ہی اپنے ہاتھوں قتل ہو جاؤں"۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کے سر کو زیادہ چوٹ آئی ہے" — امتیاز نے ہنس کر کہا — "آپ کا دماغ ہل گیا ہے یا آپ پر آگ کی دہشت طاری ہو گئی ہے"۔

جیدا اپنے آپ میں گم ہو گیا۔ اُس نے امتیاز کی بات جیسے سنی ہی نہ ہو۔ وہ اُس کی ہنسی سے لاتعلق رہا۔ اس دوران امتیاز کی بیوی ناز کو دوسرے کمرے میں لے گئی تھی۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ تمہارا خاوند جیب کترا اور غنڈہ بدمعاش ہے" — امتیاز کی بیوی نے ناز سے کہا — "میرے لیے تو یہ فرشتہ ہے۔ شادی کو گیارہ سال ہو چلے تھے، خُدا نے اولاد سے محروم رکھا۔ مجھے تو طلاق مل رہی تھی۔ امتیاز صاحب کو مجھ سے اتنی محبت ہے کہ یہ نہ مانے۔ ان کے والدین نے تو فیصلہ سُنا دیا تھا کہ اولاد کی خاطر بیٹے کی دوسری شادی کرائیں گے۔ اللہ نے میری فریادیں سن لیں اور گیارہویں سال یہ بچّہ دیا۔ یہ دو سال کا ہُوا تو لوہڑی بازار کی آگ کے شعلوں نے اسے گود میں لے لیا۔ جس اللہ نے بچّہ دیا تھا، وہی اسے بچا سکتا تھا۔ اُس نے تمہارے خاوند کے دل میں رحم ڈالا اور اسے ہمّت دی۔ میں تو اپنے بچّے کے ساتھ اس آدمی کو بھی رو چکی تھی۔ اس آگ سے اور وہ بھی دوسری منزل سے زندہ نکل آنا ممکن ہی نہیں تھا لیکن جس طرح یہ شخص آگ سے نکلا..... میں نہیں مانتی" — اُس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر کہا — "نہیں ناز! میں نہیں مانتی۔ میرا بچّہ اور تمہارا خاوند خُدا کے بھیجے ہوئے کسی فرشتے کے پروں پر جلتی ہوئی بلڈنگ کی سب سے اُوپر والی منزل سے اُترے تھے..... ناز! یہ معجزہ تھا..... معجزہ تھا"۔

"اور یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ میں اس شخص کی بیوی ہوں" — ناز نے کہا — "آپ نہیں جانتیں آپا! جیدا انسان نہیں درندہ ہے..... درندہ تھا..... آج دیکھ لو"۔

"یہ غالباً تمہارا کمال ہے"۔

"نہیں" — ناز نے کہا — "یہ اس کا اپنا کمال ہے۔ اس نے اپنے دل میں میری محبت پیدا کی۔ یہ صرف جیب کترا نہیں تھا، بردہ فروش اور عصمت فروش بھی تھا"۔

"تم اس تک پہنچیں کیسے تھیں؟"

ناز کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آنکھیں بے چین ہو گئیں اور وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی جیسے امتیاز کی بیوی کے اس سوال کو ٹال رہی ہو۔

"چلو، دفع کرو" — امتیاز کی بیوی نے ناز کے چہرے کے تاثرات کی تبدیلی بھانپتے ہوئے کہا — "یہ کوئی پوچھنے والی بات نہیں تھی۔ انسان کی جہاں لکھی ہوتی ہے وہیں پہنچ جاتا ہے"۔

"میں انہیں کوسا کرتی ہوں جنہوں نے مجھے گناہوں کی اس دنیا میں پھینکا تھا" — ناز نے کہا — "اور میں ہر سانس میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں جس نے مجھے اس غلاظت سے پاک صاف نکالا"۔

"تمھیں یہاں تک پہنچانے والے کون تھے؟"

"میرے بھائی" — ناز نے کہا — "آپ سے کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں۔ آپ کی تو شادی ہو گئی تھی مگر آپ گھر آتی رہتی تھیں۔ میرے گھر میں جو انقلاب آیا تھا وہ آپ نے دیکھا ہوگا، سنا بھی ہوگا۔ میں اسی انقلاب کا شکار ہوئی تھی.... میرے گھر کا کیا حال ہے؟ میرے بھائی کیسے ہیں؟ لوگ میرے متعلق کیا باتیں کرتے ہیں؟"

"بُرا تو نہیں مانو گی؟"

"بُروں کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی بات کا بُرا مانیں" — ناز نے کہا۔

"تمہارے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ رشوت کی دولت نے بھائیوں کو اندھا کر دیا تھا" — امتیاز کی بیوی نے کہا — "اُنہوں نے اپنی بہن بیچ کھائی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ناز بدکار ہو گئی تھی۔ اپنے جیسے کسی کے ساتھ نکل گئی ہے۔ تمہارے ماں باپ زندہ ہیں مگر وہ تو جیسے مر ہی گئے ہیں۔ ایک طرف بیٹھے اللہ اللہ کرتے رہتے ہیں لیکن محلے کے لوگ ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ان کی مجبوری اور مظلومیت کو ہر کوئی جانتا اور سمجھتا ہے۔"

"بھائی کس حال میں ہیں؟" — ناز نے پوچھا۔

"اپنے کیے کی سزا بھگت رہے ہیں" — امتیاز کی بیوی نے جواب دیا — "دونوں کی شادی ہو چکی ہے۔ برادری سے تو ان کا تعلق ٹوٹ چکا تھا۔ نہ ٹوٹتا تو بھی انہیں شریف گھرانوں کی لڑکیاں نہ ملتیں۔ ایسے چھچھوروں کو کون اپنی بیٹیاں دیتا ہے۔ انہیں ان جیسے مل گئے اور دونوں کو بیویاں مل گئیں۔ ان لڑکیوں کے ماں باپ اور بھائی دولت کے پجاری تھے۔ اُنہوں نے دونوں بھائیوں کو خوب لُوٹا، پھر بھائیوں نے جو کوٹھی بنائی تھی، اس کی تقسیم کا تنازعہ کھڑا ہو گیا۔ دونوں کے سُسرال ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ اُنہوں نے دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنایا۔ دونوں لڑکیاں کوٹھے پر نہیں بیٹھیں، باقی انہوں نے کسر کوئی نہیں چھوڑی۔ ایسی بدکار نکلیں کہ اُنہوں نے اپنے اوپر کوئی پردہ رہنے ہی نہیں دیا۔ اس کے ساتھ یہ مصیبت آئی کہ بڑے بھائی کو ایسے محکمے میں لگا دیا گیا جہاں رشوت کا سوال ہی نہیں تھا۔ آخر اُس کی تنخواہ کتنی کچھ تھی۔ وہ تو شاہانہ ٹھاٹھ سے رہتا تھا۔ صرف تنخواہ میں تو بھرم قائم رکھنا ناممکن ہو گیا۔ یہ بھائی اپنے چھوٹے بھائی سے کوٹھی کا حصہ یا حصے کی قیمت مانگنے لگا اور ان کی دشمنی بڑھ گئی۔ اب وہاں یہ حال ہے کہ جوتوں میں دال بٹتی ہے۔ دونوں کی بیویوں نے باہر یارانے گانٹھ رکھے ہیں اور خاوندوں کی حالت نوکروں کی سی رہ گئی ہے۔"

"انہیں خدا سزا دے رہا ہے" — ناز نے کہا — "مجھے بھی اُنہوں نے عصمت فروش بنا دیا تھا۔"

"میں نے تمہیں بہت تھوڑا بتایا ہے" — امتیاز کی بیوی نے کہا — "تمہارے دل کو تکلیف ہوگی۔ لوگ کہتے ہیں کہ عبرت حاصل کرنی ہے تو ان بھائیوں کو دیکھ لو.... ہاں، اگر عزت ہے تو تمہارے ماں باپ کی ہے.... ناز! تم اپنے ماں باپ کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتیں؟"

"میرا کوئی ٹھکانہ بن جائے تو انہیں لے جاؤں گی" — ناز نے کہا اور لمبی آہ بھری۔ آنسو پونچھ کر بولی — "آپا! اللہ آپ کو اور بچے دے۔ یہ خیال رکھنا کہ لڑکی ہوئی تو پیدا ہوتے ہی اس کے ذہن میں ڈالنا شروع کر دینا کہ تم خدا کی مقدس امانت ہو اور خاندان کی عزت ہو۔ وہ بھلا بُرا سمجھنے کے قابل ہو جائے تو

اسے میری کہانی سنانا۔ کہنا کہ ہمارے محلے میں ایک لڑکی ہوا کرتی تھی...." ناز کو ہچکی سی آئی اور وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

امتیاز کی بیوی خاموش بیٹھی اُسے دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد بولی — "بھول جاؤ ناز! بھول جاؤ تمہارے درندے جو نیکی کی ہے اس کا تم دونوں کو اجر ملے گا۔ تم نے ایک درندے کو انسان بنا دیا ہے۔ یہ کوئی کم نیکی نہیں۔"

ناز اس سوچ میں کھو گئی کہ امتیاز کی بیوی کو بتا دے کہ وہ اس کے بھائی اسلم کے ساتھ گھر سے بھاگی تھی اور اسلم نے اُسے اس درندے کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا جسے وہ اپنا خاوند کہہ رہی ہے؟ اور کیا وہ اسے بتا دے کہ اسلم نے جیدا کے گروہ کی بلیک میلنگ سے تنگ آ کر خودکشی کر لی تھی؟

وہ سوچتی رہی۔ آخر اس نتیجے پر پہنچی کہ نہیں بتانا چاہیے۔ اب تو بہن کو یہ اطمینان تھا کہ اس کا بھائی ملک سے باہر چلا گیا ہے، زندہ تو ہے۔ اس بہن سے یہ اطمینان چھین لینا ظلم ہوگا اور یہ خطرہ بھی تھا کہ یہ عورت جیدا کی دشمن ہو جائے گی۔

"یہ تمہاری غلطی ہے، میری نہیں" — سب انسپکٹر مظہر صدیقی نے مُنّے اور ٹیپو سے کہا — "میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ اُس پر نظر رکھو؟ تم چرس کے کش لگا کر کہیں پڑے رہے اور وہ لڑکی کو بھی لے گیا اور نہ جانے کتنا مال لے گیا ہے۔"

"مال تو بہت لے گیا ہے" — مُنّے نے کہا — "مجھے سولہ آنے یقین ہے کہ بوبڑی بازار سے اُس نے سونا بہت اُٹھایا ہے۔ نقدی بھی ہوگی لیکن میرا دھیان سونے پر ہے۔"

"وہ اور بھی بہت کچھ لے گیا ہے" — سب انسپکٹر صدیقی نے اداس سے لہجے میں کہا — "وہ میری آئندہ ترقی بھی ساتھ ہی لے گیا ہے۔ مجھے خود اُس پر نظر رکھنی چاہیے تھی۔"

صدیقی نے ٹیلیفون سے کسی کا نمبر ملایا اور کسی انسپکٹر چوہدری کے متعلق پوچھا کہ دفتر میں ہیں یا چلے گئے ہیں۔

"السلام علیکم چوہدری صاحب!" — صدیقی نے کہا — "ابھی تک دفتر میں ہی بیٹھے ہیں؟.... اتنی رات ہو گئی ہے.... خبر کچھ اچھی نہیں.... میں نے آپ سے اپنے علاقے کے جیدا کے متعلق آج فون پر بات کی تھی۔ آپ نے کہا تھا کہ اسے جانے نہ دینا.... جی.... وہ گھر سے نکل گیا ہے.... ہاں بھائی! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ غلطی اور سُستی میری ہی ہے۔ میں نے اُسی کے دو آدمی اُس کے پیچھے ڈال دیے تھے لیکن وہ، آپ جانتے ہیں، اُستاد ہے.... ہاں، ہاں، وہ تو میں سمجھتا ہوں.... میں جانتا ہوں بھائی!.... ریلوے سٹیشن پر جانا بیکار ہے۔ آخری گاڑی جا چکی ہے۔ وقت دیکھئے نا! سوا گیارہ بج رہے ہیں۔"

پھر وہ کچھ دیر ہوں، ہاں، اور جی سمجھ گیا، کہتا رہا اور انسپکٹر چوہدری کی باتیں سُنتا رہا۔ اُس نے جب ریسیور رکھا تو خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔

"یہ سی۔ آئی۔ ڈی کا انسپکٹر چوہدری تھا" — سب انسپکٹر صدیقی نے مُنّے اور ٹیپو سے کہا — "اس نے مجھے کہہ رکھا تھا کہ جیدا کو کبھی پھانسنا ہے۔ میں نے آج دن کو اسے فون پر بتایا تھا کہ جیدا

مجھے کہا ہے کہ وہ یہ دھندا چھوڑ کر کراچی سے جا رہا ہے۔ انسپکٹر چوہدری نے کہا کہ اُسے گھیرو اور کراچی سے نکلنے نہ دینا۔ چوہدری کی یہ ذاتی خواہش بھی تھی کہ جیدا زندہ نہ نکلے اور یہ حکم بھی تھا۔ انسپکٹر چوہدری کو جیدا نے ایک بار اتنا نقصان پہنچایا تھا کہ چار سال کے لیے اُس کی ترقی رُک گئی۔ وہ پچھلے سال ڈی۔ ایس۔ پی ہو چکا ہوتا۔ یہ ایک سیاسی چکر تھا۔ وزیرِ داخلہ جیدا کے ہاتھ میں تھا۔ انسپکٹر چوہدری در پردہ ایک اور لیڈر کا حامی تھا۔ جیدا نے چوہدری کو ایسی جگہ پکڑوا دیا تھا جہاں اُسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ تو چوہدری کا اپنا اثر و رسوخ تھا کہ اُس کی سروس ختم ہونے سے بچ گئی۔ اُسے جو سزا ملی، وہ بھی کچھ کم نہیں۔ چار سال کے لیے ترقی کا رُک جانا معمولی سزا نہیں ہوتی۔"

"میں انسپکٹر چوہدری کو جانتا ہوں" — ٹیپو نے کہا — "جیدا نے اُسے ایک بار دھمکی دی تھی کہ انسان کے بچے بن جاؤ، ورنہ انسپکٹری سے بھی اُتروا دوں گا۔"

"ڈی۔ آئی۔ جی بھی جیدا سے جلا بیٹھا ہے" — سب انسپکٹر صدیقی نے کہا — "لیکن جیدا وزیروں کا آدمی ہے۔"

"وہ کسی وزیر کے پاس نہ چلا گیا ہو" — مُنّے نے کہا۔

"اگر اُس نے عقل استعمال کی تو کسی وزیر کے پاس نہیں جائے گا" — صدیقی نے کہا — "وہ کسی وزیر یا کسی اور لیڈر سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کراچی سے جا رہا ہے۔ تمھیں تو معلوم ہے کہ وزیروں کی وہ کون سی بات ہے جو جیدا جیسے استادوں کو معلوم نہیں..... اب باتوں کا وقت نہیں۔ اُٹھو اور اُسے ڈھونڈو۔ اگر وہ کراچی سے نکل نہیں گیا تو تم اُسے ڈھونڈ سکتے ہو۔ تمھیں اُس کے خفیہ ٹھکانوں کا علم ہے۔ میں اپنا انتظام کرتا ہوں۔ انسپکٹر چوہدری نے کہا ہے کہ وہ بھی بندوبست کر رہا ہے..... اور سنو..... اگر وہ تمھیں کہیں مِل جائے تو موقع دیکھ لینا، ممکن ہو تو اُسے ختم کر دینا۔"

اگلی صبح امتیاز دفتر جانے لگا تو اُس نے جیدا سے کہا کہ وہ کہیں باہر نہ جائے۔ امتیاز پر جیدا کا بہت بڑا احسان تھا۔ جیدا نے اُس کے اکلوتے بچے کو بچایا اور انعام بھی قبول نہیں کیا تھا۔ اگر امتیاز پر جیدا کا یہ احسان نہ ہوتا تو وہ اس شخص سے منہ بھی نہ لگاتا۔ جیدا نے ایسی باتیں کی تھیں جن سے شک ہوتا تھا کہ اُس کا دماغی توازن صحیح نہیں۔ امتیاز کو شک ہُوا تھا کہ یہ شخص پاگلوں کی سی باتیں کر رہا ہے۔ ایک ایسا جرائم پیشہ آدمی جس نے پولیس اور لیڈروں کی مدد سے ملک کا قانون بلکہ آئین اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا، وہ اِس پیشے سے بھاگ کیوں رہا تھا، مگر امتیاز نے اس پر زیادہ توجہ نہ دی کہ جیدا کا دماغ ٹھکانے ہے یا اپنی جگہ سے ہِل گیا ہے۔ اُسے خیال آیا کہ جیدا پاگل نہ ہوتا تو اُس کے بچے کو وہ آگ میں سے نہ نکال لاتا۔

امتیاز بس میں دفتر جا رہا تھا۔ بس بوہڑی بازار کے قریب سے گزری تو اُس نے اُدھر دیکھا۔ اُس پر ہول طاری ہو گیا۔ اُس نے نظریں پھیر لیں۔

"کل تم نے اُس آدمی کو تیسری منزل کی منڈیر سے درخت پر کُودتے دیکھا تھا؟" — امتیاز کے آگے بیٹھا ہُوا ایک آدمی اپنے ساتھ بیٹھے ہُوئے آدمی سے کہہ رہا تھا — "کوئی نہیں کُود سکتا۔ اتنی لمبی چھلانگ کوئی نہیں لگا سکتا۔ کہتے ہیں وہ کسی کے بچے کو آگ سے نکال لایا تھا۔"

"ارے کوئی پاگل تھا" — دوسرے آدمی نے کہا — "میں نے دیکھا تھا۔ جس کے ہوش اپنے قابو میں ہوں وہ ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔ وہ پاگل تھا۔ تمھیں شاید معلوم نہیں کہ جس بچے کو وہ آگ سے نکال لایا تھا، اُس کی ماں نے اس شخص کو سونے کا ہار پیش کیا تھا۔ اُس بھلے آدمی نے ہار نہیں لیا۔ اُس کے کان کے قریب سے خُون بہہ رہا تھا اور اُس کی ٹانگ بھی لہُولہان تھی..... تم اتنا قیمتی ہار لینے سے انکار کر دو گے؟ میں تو انکار نہ کروں۔ وہ کوئی پاگل تھا۔ میں نے اُسے دیکھا تھا۔ ہجوم اُسے داد دے رہا تھا مگر اُسے جیسے کسی کا ہوش ہی نہ تھا۔"

"یہ زمانہ بھی آنا تھا" — اُس کے ساتھی نے کہا — "کسی کے بچے کی خاطر اپنی جان کی بازی لگانے والے کو ہم پاگل کہتے ہیں۔"

"یہ ٹھیک کہتے ہیں بھائی صاحب!" — ایک اور مسافر بول پڑا — "ہمارے ملک میں نیکی اور دیانتداری پاگل پن کا ثبوت ہے۔ میرا ایک دوست ہے۔ وہ لاہور سیر کو گیا تو اُس کا ایک دوست جو وہاں کے پاگل خانے میں ڈاکٹر ہے، اُسے پاگل خانہ دکھانے لے گیا۔ میرا دوست کہتا ہے کہ میں جب کُھلے پھرتے ہُوئے پاگلوں میں گھوم پھر رہا تھا تو وہ عجیب و غریب حرکتیں اور باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ان سب کے دماغ صحیح ہیں، میں پاگل ہوں..... یہ مثال ہے ہمارے ملک کی۔ کہا کرتے تھے کہ نیکی کر دریا میں ڈال۔ اب نیکی کرنے والے کو اٹھا کر دریا میں پھینک دیتے ہیں۔ سرکاری محکموں میں جو دیانتداری سے کام کرے، رشوت نہ لے اور فرض کی لگن کی باتیں کرے اُسے اُس کے ساتھی پاگل کہتے ہیں۔ آج کل دماغ انہی کے صحیح ہیں جو ہاتھ کی صفائی سے گھر طرح نوٹوں سے بھر رہے ہیں۔"

امتیاز پیچھے بیٹھا سن رہا تھا۔ وہ انسپکٹر جنرل پولیس کے دفتر کا سٹینوگرافر تھا۔ تیسرے مسافر نے جو رائے دی تھی، اِس کا وہ عینی شاہد تھا۔ اس کے محکمے میں جو کچھ ہو رہا تھا، اِس سے وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس ملک میں پولیس شہریوں کے جان و مال اور آبرو کی نہیں، برسرِاقتدار پارٹی کی حکومت کی محافظ ہے اور اِس کا اوّلین فرض یہ ہے کہ حکمران پارٹی کے مخالفین کو سر نہ اُٹھانے دے۔ پولیس کو اِس فرض کی ادائیگی میں جیدے اور بشیرے جیسے استادوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

بس امتیاز کے سٹاپ پر رُکی تو وہ اپنے خیالوں سے چونک کر بیدار ہو گیا۔ وہ بس سے اُترا اور اتنی تیز چلتا دفتر تک گیا جتنی تیز وہ کبھی نہیں چلا تھا۔ اُسے جیدا کے لیے کچھ کرنا تھا۔ اس نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ ڈی۔ آئی۔ جی سے بات کرے یا آئی۔ جی سے۔ وہ ان بڑے افسروں سے بات کر سکتا تھا۔ انہی کا وہ سٹینو تھا مگر اُسے یاد آ گیا کہ جیدا نے اُسے کسی بڑے افسر سے بات کرنے سے منع کر دیا تھا۔

وہ دفتر میں داخل ہُوا تو اُس کی نظر سی۔ آئی۔ ڈی کے انسپکٹر چوہدری پر پڑی۔ یہ وہی چوہدری تھا جس کے ساتھ سب انسپکٹر مظہر صدیقی نے جیدا کے متعلق ٹیلیفون پر بات کی تھی۔ امتیاز کے ساتھ اُس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ اُس نے چوہدری کے ایک دو کام بھی کئے تھے۔ امتیاز نے اسی سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"کیوں چوہدری صاحب؟" — امتیاز نے پوچھا — "آج اتنی سویرے کیسے؟"

"رات ڈی۔آئی۔جی صاحب سے بات ہوئی تھی" — انسپکٹر چوہدری نے کہا — "انہوں نے کہا تھا کہ صبح سویرے سویرے دفتر آجانا۔ وہ ابھی آئے نہیں"

"کیا بات ہوئی تھی؟"

"ایک ہسٹری شیٹر کے متعلق حکم لینا ہے" — انسپکٹر چوہدری نے کہا — "مفرور ملزم ہے.... امتیاز یار! کسی قاتل اور ڈاکو پر ہاتھ ڈالنے کے لیے حکم لینا پڑتا ہے جہاں آئی۔جی تک مجبور ہوں، وہاں ہم کسی چور اُچکے پر کیسے ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ یہ ملزم سرکار کا خاص آدمی ہے"

"ہٹاؤ چوہدری صاحب!" — امتیاز نے کہا — "آپ کو جو حکم ملتا ہے اُس پر عمل کریں۔ اگر کوئی سرکاری غنڈہ ہے تو آپ کو کیا؟ کل حکومت بدل جائے گی تو تمام سرکاری غنڈے نئی حکمران پارٹی کی سرکار کے خاص آدمی بن جائیں گے.... میرا ایک مسئلہ حل کردیں"

"حکم کرو یار!" — انسپکٹر چوہدری نے کہا — "تمھارے تو ہم خادم ہیں"

امتیاز اُسے اپنی میز تک لے گیا اور اپنے قریب کرسی پر بٹھا کر اُسے کہا — "میں نیکی کے جواب میں ایک نیکی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کام مشکل نہیں۔ ایک پرانا پاپی انسان بن گیا ہے۔ وہ پولیس کے ریکارڈ پر ہے، بلکہ یوں کہ لیں کہ پولیس اُس کے ریکارڈ پر ہے۔ اُس کے خلاف کسی کورٹ میں کوئی کیس نہیں۔ اُسے کراچی سے نکالنا ہے اور ایسا انتظام کرنا ہے کہ اُس کے تعاقب میں کوئی نہ جائے اور ہم سب اُسے بھول جائیں"

"امتیاز دوست!" — انسپکٹر چوہدری نے کہا — "میں تمھاری خاطر یہ قربانی دے سکتا ہوں کہ کام کردوں گا۔ لوں گا کچھ بھی نہیں۔ نہ اُس سے نہ تم سے۔ صرف یہ بتا دو کہ اُس نے تمھارا پیٹ بھر دیا ہے؟ اگر اُس نے تمھیں خوش کر دیا ہے تو میں خوشی سے یہ کام کردوں گا"

"اُس نے مجھے اس قدر خوش کیا ہے کہ آپ تصور میں نہیں لا سکتے" — امتیاز نے کہا — "اُس نے میرا نہیں، میری روح کا پیٹ بھر دیا ہے۔ میں نے اُس سے لیا کچھ بھی نہیں۔ اگر آپ کچھ لینا چاہیں تو میں جو اُسے دینا چاہتا تھا وہ آپ کو دے دوں گا"

"وہ کیا چیز ہے جو تم اُسے دینا چاہتے تھے لیکن مجھے دے دو گے؟"

"سونے کا ہار" — امتیاز نے کہا۔

انسپکٹر چوہدری نے امتیاز کو بڑی غور سے دیکھا اور بولا — "کیا تم رات سوئے نہیں؟ کہیں گانجے کا کش تو نہیں لگا لیا؟.... کیا کہ رہے ہو؟ کس کی بات کر رہے ہو؟"

امتیاز نے گہرا سانس لے کر کہا — "بات اُلٹی سی ہے۔ ڈی۔آئی۔جی صاحب کے آنے تک میری بات سُن لیں۔ ذرا لمبی بات ہے.... آپ شاید اُسے جانتے بھی ہوں گے۔ اُس کا نام جیدا ہے"

"جیدا؟" — انسپکٹر چوہدری نے بدک کر کہا — "جیدا؟.... وہ کہاں ہے؟"

"میرے پاس" — امتیاز نے کہا — "میں جس کوارٹر میں رہتا ہوں، وہاں ہے.... آپ اُسے جانتے ہیں نا؟"

انسپکٹر چوہدری خوشی اور ہیجان سے بے قابو ہو چلا تھا۔ سنبھل کر بولا — "ہاں، ہاں، میں اُسے جانتا ہوں۔ کہلاتا جیب کترا ہے لیکن پولیس اور سیاسی لیڈروں میں اُس کا شہرہ ہے"

"آپ اُسے جیب کترے یا سیاسی غنڈے کی حیثیت سے جانتے ہوں گے" — امتیاز نے کہا — "لیکن میں نے اُسے کسی اور رنگ روپ میں دیکھا ہے۔ میرے لیے وہ فرشتہ ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں لوہڑی بازار میں دوسری منزل میں رہتا تھا"

"ارے ہاں بھائی!" — انسپکٹر چوہدری نے کہا — "میں نے کل سنا ہے کہ تمھارا سب کچھ تباہ ہو گیا ہے۔ بہت افسوس ہے بھائی! کوئی خدمت میں کر سکوں تو بتاؤ"

"اللہ آپ کو خوش رکھے" — امتیاز نے کہا — "ایک دوست نے اپنا کوارٹر دے دیا ہے۔ یہ جو کپڑے پہنے ہوتے ہیں، یہی بچے ہیں۔ اب تو نیا گھر نئے سرے سے بنانا پڑے گا"

"مومن نہ بنو امتیاز!" — انسپکٹر چوہدری نے کہا — "جس شخص کو تم کراچی سے نکلوانا چاہتے ہو، وہ تمھیں اِس قسم کے چار گھر بنا کے دے سکتا ہے۔ تم اُس کے لیے جو کام کر رہے ہو وہ معمولی کام نہیں۔ اِس کے عوض تم اُس سے اپنے جلے ہوئے سامان کی دگنی قیمت وصول کر سکتے ہو اور وہ اتنی قیمت آسانی سے دے سکتا ہے"

"وہ مجھے اتنی زیادہ قیمت دے چکا ہے جو کسی کے تصور میں بھی نہیں آسکتی" — امتیاز نے کہا — "اُس نے میرے بچے کو جلتی ہوئی بلڈنگ سے نکالا ہے.... آپ میری ساری بات سُن لیں"

امتیاز کو جیدا نے اپنی جو کہانی سنائی تھی، وہ اُس نے انسپکٹر چوہدری کو سُنا دی۔ جیدا نے جس طرح امتیاز کے بچے کو آگ سے نکالا تھا، وہ بھی سنا دیا اور جس جذباتی انداز سے جیدا نے امتیاز کو اپنا مسئلہ بتایا تھا، امتیاز نے اسی انداز سے چوہدری کو سُنا دیا۔

امتیاز بات تقریباً مکمل کر چکا تھا کہ ڈی۔آئی۔جی آگیا۔ انسپکٹر چوہدری اُٹھ دوڑا اور اُس کے کمرے میں چلا گیا۔

"انسپکٹر صدیقی کو اگر پتہ چل گیا تھا کہ جیدا اپنے میدان سے نکل رہا ہے تو اُس نے اُس کا پیچھا کیوں نہیں کیا؟" — ڈی۔آئی۔جی انسپکٹر چوہدری سے کہ رہا تھا — "میرا خیال ہے صدیقی نے اُسے نکل جانے میں مدد دی ہے"

"وہ کہیں بھی نہیں گیا سر!" — انسپکٹر چوہدری نے کہا — "وہ آپ کی بغل میں ہے۔ آپ کے سٹینو کے گھر میں"

"امتیاز کے گھر میں؟"

"جی سر!"

"وہاں کیسے پہنچا؟" — ڈی۔آئی۔جی نے پوچھا — "کیا امتیاز نے اُسے پناہ دی ہے؟"

انسپکٹر چوہدری نے اُسے وہ ساری داستان سنا دی جو اُسے امتیاز نے سنائی تھی۔

"امتیاز بے چارے کو کیا پتہ کہ جیدا کیسا گھاگ ہے" — ڈی۔آئی۔جی نے کہا — "چوہدری! کیا تم مان سکتے ہو کہ جیدا شریفانہ زندگی بسر کرنے جا رہا ہے؟.... وہ بکواس کرتا ہے۔ بہت بڑا فریب کار

ہے۔ وہ یہاں سے بے شمار مال لے جا رہا ہے جس سے وہ سمگلنگ کا کاروبار شروع کرے گا وہ وزیروں کا یار ہے۔ تم جانتے ہو چوہدری! ہمارے دو وزیر سمگلنگ کروا رہے ہیں۔ ہمارے سمگلر ہندوستان جاتے ہیں اور ہندوستانی سمگلر اِدھر آتے ہیں۔ ہم سمگلنگ کو نہیں روک سکتے مگر ہم اتنے مُردہ بھی نہیں ہو سکتے کہ سمگلروں کے بھیس میں ہندوستانی جاسوس ہماری سرحد کے اندر آئیں اور یہاں سے قیمتی راز لے جائیں۔ تم جانتے ہو کہ سمگلروں کا درپردہ رابطہ اوپر کے حضرات سے بھی ہوتا ہے۔ اِس لین دین کو تم جانتے ہو۔ جیدا تو سب سے زیادہ خطرناک آدمی ہے۔ اسے ہم گرفتار کر لیں تو صاف بری ہو جائے گا۔ اُس کے خلاف کوئی ایک بھی مقدمہ کامیاب نہیں ہو گا۔ اس کا وہی علاج کرنا ہے۔"

"لیکن سر!" — انسپکٹر چوہدری نے کہا — "امتیاز کو پتہ نہیں چلنا چاہیئے۔"

"کیا تم آج پولیس میں بھرتی ہوئے ہو؟" — ڈی۔آئی۔جی نے کہا — "ذرا عقل اور تجربے سے کام لو۔"

"آپ کا مطلب پولیس مقابلے سے ہے؟"

"کسی حد تک" — ڈی۔آئی۔جی نے کہا — "لیکن تمہیں اس کے لیے بڑا مضبوط جواز پیدا کرنا ہو گا۔"

"وہ میں کر لوں گا" — انسپکٹر چوہدری نے کہا — "میں امتیاز سے کہتا ہوں کہ میں آج رات تین چار آدمی ساتھ لے کر جیدا کو کراچی سے نکال دوں گا۔ اُس کے دشمنوں کو اُس کے قریب آنے کی جرأت نہیں ہو گی۔"

"میں تمہیں بچاتے رکھنے کی کوشش کروں گا۔"

اور اُنہوں نے اس مہم کی تفصیلات طے کر لیں۔

"سنو امتیاز بھائی" — انسپکٹر چوہدری نے کہا — "تم جانتے ہو کہ میں کسی کی ایسی مدد کرنے کا قائل نہیں ہوں جو قانون کے دائرے سے باہر ہو لیکن جیدا نے تم پر جو احسان کیا ہے اور تم نے مجھ پر جو احسان کر رکھے ہیں، ان کے عوض میں تمہارا کام کر دوں گا۔۔۔ یوں کرنا جیدا کو اُس کی بیوی اور بچے سمیت رات ایک بجے تیار رکھنا۔ ایک احتیاط لازمی ہے۔ اُسے یہ نہ بتانا کہ میں اُسے لینے آؤں گا، ورنہ وہ نہیں آئے گا۔ شاید مجھ پر اعتبار نہ کرے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کسی بھی وقت یہ ظاہر ہو سکتا ہے کہ اُسے میں نے کراچی سے نکالا تھا۔ دو آدمی آئیں گے۔ جیدا انہیں پہچاننے کی کوشش نہ کرے۔ اُسے بتا دینا کہ ہمیں کچھ دُور تک پیدل جانا پڑے گا۔"

امتیاز نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی انسپکٹر چوہدری کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ سب کچھ سمجھ گیا ہے۔ وہ بہت ہی خوش تھا کہ وہ احسان کا بدلہ چکا رہا ہے۔ اُس نے دن بڑی مشکل سے گزارا۔ وہ بہت جلد گھر جا کر جیدا کو بتانا چاہتا تھا کہ اُسے کراچی سے نکالنے کا انتظام ہو گیا ہے مگر وہ سٹینوگرافر تھا۔ اُس کے افسر یہ بھی جانتے تھے کہ اس کے گھر کا سارا سامان جل گیا ہے، اسے پھر بھی چھٹی جلدی نہ مل سکی۔

وہ پچھلے پہر گھر گیا اور جیدا کو بتایا کہ رات کو وہ تیار رہے۔ جیدا نے اُس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی — "وہ کون لوگ ہیں؟ کیا امتیاز انہیں قابلِ اعتماد سمجھتا ہے؟ وہ اُسے کہاں تک لے جائیں گے؟ انہیں کچھ دینا دلانا ہے؟" — اور ایسے کئی سوالات تھے جن میں بعض کے جواب امتیاز کے پاس نہیں تھے اور بعض کے جواب یہ کہہ کر نہ دیئے کہ اُسے کہا گیا ہے کہ جیدا کو معلوم نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ کون ہیں۔ جیدا کو امتیاز پر بھروسہ تھا۔

"کہاں جانے کا ارادہ ہے؟" — ناز نے جیدا سے الگ کمرے میں بیٹھ کر پوچھا۔

"یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں" — جیدا نے جواب دیا — "کبھی کبھی راولپنڈی ذہن میں آتا ہے۔۔۔۔ میں داڑھی بڑھا لوں گا۔۔۔۔ اپنے پاس رقم بہت ہے۔ زیورات بھی ہیں۔ وہاں کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں گے سوچ لیں گے ناز! اس جہنم سے نکل جانے دو۔ سوچ لیں گے۔"

"اگر کچھ مشکل پیش آ گئی تو بھی وہ زندگی حسین ہو گی" — ناز نے کہا — "میں محنت مزدوری کر کے زندگی بسر کر لوں گی، تو بھی وہ زندگی حسین ہو گی۔"

"کیا میں جیب تراشی اور چوری چکاری کے سوا اور کوئی کام نہیں کر سکوں گا؟" — جیدا نے کہا — "تم نے مجھے شاید ذہنی طور پر اپاہج سمجھ لیا ہے" — وہ چپ ہو کر سوچ میں کھو گیا، پھر سر جھکا لیا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" — ناز نے بڑے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر سر اُوپر کیا اور مسکرا کر بولی — "پہلے میں تمہاری قیدی تھی، اب تم میرے قیدی ہو۔ اب تمہاری سوچیں بھی قیدی ہیں۔۔۔ کیا سوچ رہے ہو؟"

"سوچ نہیں رہا ناز!" — جیدا نے کہا اور چارپائی سے اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا — "میں شاید پچھتا رہا ہوں۔ میں کبھی پچھتایا نہیں تھا۔ وہ بوڑھا موسیقار ہے نا! اُس نے کہا تھا، گناہ ہو گیا سو ہو گیا۔ کوشش کرو پھر گناہ نہ ہو مگر پچھتاؤ نہیں۔ پچھتاوا آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ نیک ارادوں کو دیمک کی طرح کھا جاتا ہے۔ توبہ کرو اور پچھلے گناہوں کو بھول جاؤ۔"

"بھول جاؤ نا!" — ناز نے کہا — "بھول جاؤ۔"

"میرے گناہ میرے سامنے ناچ رہے ہیں ناز!"

"تم نے ایک بچے کو آگ سے نکال کر گناہوں کا کفّارہ ادا کر دیا ہے" — ناز نے کہا — "تم نے مجھے گناہوں کی دنیا میں لا کر گناہوں سے پاک رکھا ہے۔۔۔"

"میں نے بچے زندہ جلائے بھی ہیں ناز!" — جیدا نے بے چین سے لہجے میں کہا — "میرے ہاتھ انسانی خون سے لال ہیں۔ میرا ضمیر مجھے طعنے دے رہا ہے، للکار رہا ہے جیسے کہہ رہا ہو کہ بچ کے جاؤ گے کہاں۔"

ناز پریشان ہو گئی۔ یہ تو ڈری اور سہمی ہوئی لڑکی ہوا کرتی تھی مگر اب اُس میں دلیری اور خود اعتمادی آ گئی تھی۔ اُس کی پریشانی یہ تھی کہ جیدا اُسے اُکھڑا اُکھڑا لگتا تھا اور اُسے سنبھالنا وہ اپنی ذمہ داری سمجھتی تھی۔

جیدا اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ اُس کا یہ ارادہ پختہ تھا کہ وہ جرائم کی دنیا میں واپس نہیں جائے گا مگر شریفانہ زندگی کی دہلیز پر قدم رکھنے سے گھبرا رہا تھا جیسے اُسے کوئی پیچھے گھسیٹ رہا ہو، جیسے اُسے کوئی اس دہلیز سے آگے قدم رکھنے سے روک رہا ہو۔ یہ پچھتاوا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا اور جس کا اُس نے اظہار بھی کر دیا تھا۔ اسے اُس نے ضمیر بھی کہا تھا۔ یہی وہ ڈر تھا اور یہی وہ جھجک تھی جو اُسے کراچی سے نکلنے سے روکے ہوئے تھی، ورنہ جیدا جیسا خونخوار انسان اور گھاگھ اُستاد کراچی سے اُڑ کر نکل جاتا۔ پولیس اور دیگر دشمنوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل جاتا۔ یہ اُس کی اپنی نفسیاتی کیفیت تھی جو اُسے پولیس، غنڈے، ٹیپو اور سیاسی لیڈروں کی صورت میں نظر آ رہی تھی۔ اُس نے لڑکپن کے آغاز میں مجرمانہ زندگی کا آغاز کیا تھا، اب وہ جوانی کے آخری مرحلے پر اور جرائم کے عروج

پر پہنچ گیا تھا۔ جرم اُس کی فطرت کا حصہ بن گیا تھا۔ وہ گھبرا رہا تھا، ڈر رہا تھا۔ اس پر وہ ہیجان اور تذبذب طاری تھا جو غیر متوقع انقلاب کے وقت یا کسی اَن دیکھی صُورتِ حال میں یا کسی خطرے کے سامنے جاتے وقت ہر انسان پر طاری ہُوا کرتا ہے ۔۔۔ مگر ناز ماہرِ نفسیات نہیں تھی۔

"مجھے اپنے بابا کے پاس جانا ہے" ۔۔۔ اُس نے یوں کہا جیسے ماں سے بچھڑا ہُوا بچّہ کہے کہ امّی کے پاس جانا ہے۔ کہنے لگا ۔۔۔ "وہ مجھے اِس بھنور سے نکال لے گا۔۔۔ ناز! مجھے اُس کے پاس جانے دو۔ آجاؤں گا۔ آدھی رات سے پہلے آجاؤں گا۔"

"نہ جاؤ جیدا!" ۔۔۔ ناز نے کہا ۔۔۔ "نہ جاؤ۔ نہ جانے کیا ہو جائے۔ کل اُسے مِل تو آئے ہو۔"

"اُسے کہوں گا، بابا! مجھے پیار کا سبق دیا ہے تو میرے گناہوں کی آگ بھی بجھا دو۔ میں جل رہا ہوں۔"

اُس نے اٹیچی کیس کو دیکھا جس میں زیورات اور رقم تھی۔ یہ اُس نے کمرے میں دبا رکھی تھی۔ وہ آہستہ اٹیچی کیس تک گیا اور بولا ۔۔۔ "نہیں ناز! یہ اٹیچی کیس ہمارے ساتھ نہیں جائے گا۔ یہ لُوٹ مار کا مال ہے۔ یہ سہاگنوں کے زیورات ہیں۔"

ناز آگے بڑھی۔ جیدا کو کندھوں سے پکڑا اور غصیلی آواز میں گرج کر بولی ۔۔۔ "جیدے! ہوش میں آ۔ بھول جا تُو کون ہے اور تُو کون تھا۔ میں تیرے ساتھ ہوں۔"

جیدا نے ناز کو یوں حیرت سے دیکھا جیسے اُسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ ناز نے اُسے فیصلے کے لہجے میں کہہ دیا کہ اب وہ کہیں نہیں جائے گا ۔۔۔ اور وہ اُن آدمیوں کا انتظار کرنے لگے جو انھیں کراچی سے نکالنے آرہے تھے۔

وہ چار آدمی تھے۔ چاروں انسپکٹر چوہدری کے پاس پہنچ چکے تھے۔ چاروں کے پاس ریوالور تھے اور چوہدری کے پاس بھی ریوالور تھا۔ وہ وردی میں نہیں تھا۔

"تمھیں سب کچھ بتا چکا ہوں" ۔۔۔ انسپکٹر چوہدری نے انہیں کہا اور ایک کی طرف دیکھ کر کہنے لگا ۔۔۔ "خادمے! تم اُسے اچھی طرح جانتے ہو۔ باقی تین اُسے پہچانتے بھی نہیں۔ جیدا کے ساتھ تم ہو گے۔ میں سامنے نہیں آؤں گا اور کام تم کرو گے۔ جگہ ایک بار پھر سن لو۔ ایبے سینیا لائنز کے ساتھ اچھوٹی چھوٹی چٹانیں ہیں۔ اُسے گورا قبرستان کی طرف نہیں لے جانا۔ ان چٹانوں کی طرف لے جانا ہے۔ میں نے اُسے پیغام بھیجا ہے کہ تھوڑی دُور تک پیدل جانا پڑے گا۔ اُسے کہنا کہ جیکب لائنز میں سے گزر کر بندر روڈ تک جانا ہے۔ وہاں جیپ کھڑی ہوگی۔ جب تم ایبے سینیا لائنز کے پیچھے والی چٹانوں میں سے گزرو گے تو ذرا پیچھے ہٹ کر ریوالور نکالنا اور اُسے گولی مار دینا۔ باقی تین آدمی اپنے اپنے ریوالور سے ایک ایک گولی ہوا میں چلائیں گے۔ اُس کے ساتھ ایک جوان لڑکی ہوگی، اسے اُٹھا کر لے جانا ہوگا۔ وہ کوئی شریف لڑکی نہیں۔ وہ گھر سے بھاگی ہوئی اور جیدا کی خریدی ہوئی ہے۔ تین ساڑھے تین سال سے اُس کے پاس ہے۔ وہ شریف ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ خود تمھارے ساتھ چل پڑے گی۔۔۔۔ اور ان کے ساتھ دو تین سال کا ایک بچہ ہوگا۔ اسے آرام سے گولی مار دینا۔"

"چوہدری صاحب!" ۔۔۔ خادمے نے جس کا نام خادم حسین تھا، کہا ۔۔۔ "میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا۔ اب پھر کہتا ہُوں کہ آپ کا ساتھ ہونا ضروری نہیں، نہ ہی چار آدمیوں کی ضرورت ہے۔ ہم دو آدمی کافی تھے۔ میں جیدا اور بچے کو بھی ختم کر دیتا اور لڑکی کو آسانی سے ساتھ لا سکتا تھا۔"

"تم تو کہتے ہو کہ جیدا کو اچھی طرح جانتے ہو" ۔۔۔ چوہدری نے کہا ۔۔۔ "ہوسکتا ہے اُسے کچھ شک ہو جائے، پھر وہ ہم پانچوں کے ہاتھ نہیں آئے گا۔ اُس صُورت میں ہم جو کارروائی کریں گے وہ پولیس مقابلہ ہوگا۔ ہمیں اِدھر اُدھر سے ایک دو آدمی پکڑ کر انھیں گولی مارنی پڑے گی تاکہ کیس پوری طرح مضبوط ہو جائے۔ میری ضرورت اِس لیے بھی ہے کہ وہ بے شمار مال ساتھ لے جا رہا ہے اور اُس کے ساتھ بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ تم جانتے ہو کہ مال اور عورت دشمنی اور فساد کی جڑ ہے۔ تم آپس میں لڑ مرو گے۔ اگر وہ فوراً مارا گیا تو ہم سب لڑکی اور مال کے ساتھ وہاں سے کھسک آئیں گے اور اخباروں میں خبر چھپے گی کہ کراچی کا مشہور غنڈہ جیدا قتل ہو گیا ہے اور پولیس نے نامعلوم قاتل کے خلاف مقدمہ درج کر لیا ہے۔۔۔۔ باقی سکیم تم جانتے ہو۔ تمھیں جو انعام ملے گا، وہ بھی تم جانتے ہو۔ مقابلے کی صورت میں تمھیں سرکاری طور پر الگ انعام دلایا جائے گا اور اخباروں میں تمھاری تصویریں چھپیں گی۔"

رات کا ایک بج رہا تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ جیدا، ناز، امتیاز اور اُس کی بیوی جاگ رہے تھے۔ دستک نے سب کو چونکا دیا۔ امتیاز نے دروازہ کھولا اور واپس آکر جیدا کو بتایا کہ وہ آ گئے ہیں۔ جیدا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اُس نے امتیاز سے ہاتھ ملایا مگر کچھ بولا نہیں۔

"آپا!" ۔۔۔ ناز نے امتیاز کی بیوی سے بغلگیر ہو کے کہا ۔۔۔ "بھول جانا کہ میں آپ سے کبھی ملی تھی۔ حیدر آباد جائیں تو میرے ماں باپ کو نہ بتانا کہ میں آپ سے ملی تھی۔ اُن کے زخم پھر کھُل جائیں گے۔"

جیدا نے اٹیچی کیس اور ناز نے سوتے ہوئے بچے کو اٹھایا اور کچھ کہے بغیر باہر نکل گئے۔ چاندنی شفاف تھی۔ سمندر کی نمی کی وجہ سے کراچی کی چاندنی بہت ہی شفاف ہُوا کرتی ہے۔ دروازے کے ساتھ ایک آدمی کھڑا تھا جس نے سر پر اس طرح کپڑا ڈال رکھا تھا کہ اُس کا چہرہ بھی ڈھکا ہُوا تھا۔

"کون ہو بھئی؟" ۔۔۔ جیدا نے پوچھا۔

اتنے میں تین آدمی اسی طرح منہ اور ناک کپڑوں میں چھپائے ان کی طرف آئے۔ جیدا کے کان میں سرگوشی پڑی ۔۔۔ "وہ آرہے ہیں۔ اب نہ پوچھنا میں کون ہوں؟"

جیدا کچھ چونکا۔ اُس نے پتلون نما پاجامے کی نیفے میں ریوالور اُڑس رکھا تھا۔ اس میں چھ گولیاں تھیں۔ اُس نے کچھ گولیاں ایک کپڑے میں باندھ کر کمر کے گرد قمیض کے اندر لپیٹ رکھی تھیں۔ وہ خطرے کے مقابلے کے لیے تیار تھا۔ اُس کی کمزوری یہ تھی کہ ناز اور بچّہ اُس کے ساتھ تھے۔

وہ اب چار آدمیوں کے نرغے میں ایبے سینیا لائنز کے عقب میں چٹانی راستے پر جا رہے تھے۔ جیدا کو معلوم نہیں تھا کہ اُن کے ساتھ پانچواں آدمی بھی ہے۔ وہ دو ہٹ کر جا رہا تھا۔ جیدا نے ایک بار پھر اِن سب سے پوچھا کہ وہ کون ہیں۔

"بے غم ہو کر چلے چلو اُستاد!" ۔۔۔ اُسے ایک کی آواز سنائی دی ۔۔۔ "بندر روڈ تک پیدل چلنا ہوگا۔"

خاموشی طاری ہوگئی۔ کوارٹر ایک طرف ہٹ گئے تھے۔ وہ اب چٹان کے ساتھ ساتھ جا رہے

تھے۔ پھر وہ چٹان کے اُوپر چلے گئے۔ جیدا اور ناز کے ساتھ ساتھ جو آدمی چلا جا رہا تھا، وہ آگے بڑھ کر اُن دو آدمیوں کے ساتھ ہو گیا جو چار پانچ قدم آگے آگے جا رہے تھے۔ انھیں اُس نے سرگوشی میں کہا کہ وہ اور آگے چلے جائیں۔ وہ پھر پیچھے آنے والے آدمی کے ساتھ ہو گیا اور اُسے کہا کہ وہ چٹان کے اوپر اوپر چلے، پھر وہ جیدا کے ساتھ ہو گیا۔ انسپکٹر چوہدری چٹان کی دوسری طرف جا رہا تھا۔ اُسے اپنے آپ کو چھپا کر رکھنا تھا۔

اس آدمی نے دیکھا کہ اُس کے ساتھی دور ہٹ گئے ہیں تو وہ جیدا کے ساتھ ہو گیا۔

"جیدا اُستاد!" — اُس نے سرگوشی کی — "میں خادم ہوں .... ہیڈ کانسٹیبل خادم حسین میں نے تمہیں خبردار کرنے کا موقع پیدا کیا ہے۔ مجھ سے زیادہ باتیں نہ پوچھنا۔ صرف میری سُننا۔ تم جان کے خطرے میں سے جاتے جا رہے ہو۔ میں جہاں اشارہ کروں، وہاں سے نکل بھاگنا۔ ہمارے ساتھ انسپکٹر خالد چوہدری ہے۔ تم اُسے نہیں دیکھ سکتے۔ مجھے آج شام بتایا گیا ہوتا تو میں تمہیں پہلے ہی خبردار کر دیتا۔ اب تم کمال کر دکھاؤ کہ نکل بھاگو۔ میرے اشارے کا انتظار کرنا .... میرے ریوالور سے گولی نکلے گی مگر تمہیں نہیں لگے گی۔"

"یہ تین آدمی کون ہیں؟" — جیدا نے سرگوشی میں پوچھا۔

"کانسٹیبل ہیں" — خادم حسین نے جواب دیا — "میں زیادہ باتیں نہیں کر سکتا۔ انھیں شک ہو گا۔"

جیدا انسپکٹر چوہدری اور ہیڈ کانسٹیبل خادم حسین کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ چوہدری اُس کا دشمن ہے اور خادم حسین اُس کا دوست ہے۔ جیدا کو یہ بھی معلوم تھا کہ خادم حسین کیوں اسے بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ سال ڈیڑھ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ خادم حسین کسی ایسے جرم میں موقعہ پر پکڑا گیا تھا جو اُس کی سروس بھی ختم کر سکتا تھا اور اُسے ڈیڑھ دو سال کی سزا بھی دلا سکتا تھا۔ جیدا کو پتہ چلا تو اُس نے اپنا ایک آدمی پیش کر کے کہا تھا کہ جرم تو اس آدمی نے کیا تھا اور ہیڈ کانسٹیبل خادم حسین وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس کے علاوہ جیدا نے ایک وزیر سے کہہ کر خادم حسین کو صاف بچا لیا اور اُس کی جگہ اپنے آدمی کو چھ ماہ سزائے قید دلا دی تھی۔

خادم حسین جیدا کا زرخرید غلام بن گیا۔ اب اُسے موقع ملا تھا کہ جیدا کو اُس کی اس نیکی کا صلہ دے۔

وہ جگہ آگئی تھی جہاں خادم حسین کو پیچھے ہٹ کر جیدا پر گولی چلانی تھی۔ آگے والے تین آدمی اور آگے چلے گئے اور پیچھے والا آدمی اور زیادہ پیچھے رہ گیا۔ انسپکٹر چوہدری دُور دُور جا رہا تھا۔ اُس کے کان گولی کی آواز کے منتظر تھے مگر خادم حسین کا ریوالور فائر نہ ہوا۔ چوہدری خادم حسین کو پکار نہیں سکتا تھا نہ وہ اُدھر جا کر دیکھ سکتا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے اور گولی کیوں نہیں چل رہی۔

آگے چٹانوں کی جو تھوڑی سی بلندی تھی وہ ختم ہو رہی تھی اور وہ کوارٹر آگئے تھے جو ایبے سینیا لائنز کی طرح فوجی بارکوں میں بنائے گئے تھے۔ بارکوں میں لمبے لمبے برآمدے تھے۔ وہاں کے رہنے والوں نے اپنے کوارٹروں کے آگے جنتر منتر کی باڑیں اُگا رکھی تھیں۔ بعض پودے اتنے اونچے ہو گئے تھے کہ ان کی اوٹ میں دراز قد آدمی چھپ سکتا تھا۔ بارکوں کے ساتھ ساتھ چند گز اونچی چٹانی زمین تھی۔

انسپکٹر چوہدری پریشان ہو گیا۔ وہ خادم حسین کو کوئی اشارہ دینے کی سوچنے لگا۔ آخر کراچی کی رات ریوالور کے دھماکے سے لرز اٹھی۔ ہیڈ کانسٹیبل خادم حسین کے ریوالور نے گولی اُگل دی تھی مگر گولی ہوا کو چیرتی جانے کدھر نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی انسپکٹر چوہدری کو اُس طرف شور سا اور بھاگ دوڑ سی سنائی دینے لگی۔ تین ریوالور یکے بعد دیگرے فائر ہوئے۔ یہ تین کانسٹیبلوں کو سکیم کے مطابق ہوا میں فائر کرنے تھے۔

انسپکٹر چوہدری اُدھر کو دوڑا گیا۔ اب اُسے آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں — "اِدھر دیکھو۔ میں نے اُسے اِدھر ہی جاتے دیکھا ہے .... جا کہاں سکتا ہے۔ وہ گولی کھا کر کہاں چلا جائے گا۔"

خادم حسین اور اُس کے تین ساتھی اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ چوہدری نے انھیں پکارنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے اُسے خادم حسین کی آواز سنائی دی — "چوہدری صاحب! وہ نکل گیا ہے" — چوہدری اُدھر کو دوڑا۔

"اُسے شک ہو گیا تھا" — خادم حسین نے چوہدری کو بتایا — "میں اُسے گولی مارنے کے لیے پیچھے ہٹا تو پیچھے بڑا سا پتھر تھا۔ اس سے ٹھوکر کھا کر میں پیٹھ کے بل گر پڑا۔ انگلی ٹریگر میں تھی، ریوالور فائر ہو گیا۔ میں جتنی دیر میں اُٹھتا تھا، وہ عورت اور بچّے کے ساتھ چٹان کے اندر ہو کر نکل گیا۔"

پیچھے آنے والے کانسٹیبل نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل کے بیان کی تصدیق کر دی کہ وہ واقعی پیچھے کو گر پڑا تھا اور اُس کا ریوالور فائر ہوا تھا۔ ان میں سے کسی کو شک تک نہ ہوا کہ ہیڈ کانسٹیبل خادم حسین البتہ گرا تھا۔ گرنے سے پہلے اُس نے جیدا کو بتا دیا تھا کہ وہ گرے گا اور جیدا بھاگ جائے۔ جیدا سے اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر ریوالور پاس ہے تو نکال لو، پولیس مقابلہ ہو گا۔

اُس وقت جیدا ایک بارک کے برآمدے میں پہنچ گیا تھا۔ اُس کے لیے ناز اور بچّے نے مشکل پیدا کر رکھی تھی۔ ان کے پاس اٹیچی کیس بھی تھا۔ جیدا نے ریوالور ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اُس نے ناز سے اتنا ہی کہا تھا کہ بھاگو۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" — برآمدے میں پہنچ کر ناز نے جیدا سے پوچھا — "تم بھاگے کیوں تھے اور گولی کس نے چلائی تھی؟"

"دھوکہ ہوا ہے ناز!" — جیدا نے جواب دیا — "مجھے معلوم نہیں یہ دھوکہ امتیاز نے دیا ہے یا کسی طرح میرے ایک دشمن انسپکٹر پولیس کو پتہ چل گیا ہے۔ امتیاز نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ انسپکٹر خالد مجھے لینے آ رہا ہے۔ وہ بتا دیتا تو میں دھوکے میں نہ آتا۔ اگر میں واپس امتیاز کے کوارٹر میں زندہ پہنچ سکا تو اُس کے جس بچے کو آگ سے نکالا تھا، اُسے گولی مار دوں گا۔ مجھے دھوکہ دینے والا کبھی زندہ نہیں رہا۔"

"کیا تم کسی اور طرف نہیں نکل سکتے؟" — ناز نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا — "واپس جانے کی کوشش نہ کرو۔ تم اکیلے ہوتے تو اور بات تھی۔"

"ہاں، ایک ٹھکانہ ہے" — جیدا نے کہا — "بوڑھے ستار نواز کا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ میں وہاں تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ دعا کرو یہ لوگ ہمارے تعاقب سے ہٹ جائیں۔"

وہ لوگ تعاقب سے ہٹنے والے نہیں تھے۔ انسپکٹر چوہدری کے کہنے پر دو کانسٹیبل چلّانے لگے — "چور .... چور .... چور" — اور وہ جیدا کو ڈھونڈنے لگے۔ چوہدری نے سوچا تھا کہ "چور چور" کے شو

پر کوارٹروں میں سے کچھ لوگ باہر آجائیں گے اور وہ کسی ایک کو گولی مار کر کہے گا کہ گولی جیدا نے چلائی ہے تاکہ پولیس مقابلے کا جواز پیدا کیا جا سکے۔ مگر وہ بھول گیا تھا کہ کراچی میں چوروں اور ڈاکہ زنوں کی اتنی بھرمار تھی کہ پڑوس میں سے "چور چور" کا شور اٹھتا تو لوگ گھروں میں دبکے رہتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ رات کو چوروں کی حکومت ہوتی ہے اور لٹا ہوا کوئی آدمی تھانے میں رپورٹ درج کرانے جاتا ہے تو اس کے ساتھ وہاں ایسا سلوک ہوتا ہے جیسے اُس کے گھر چوری ہوئی ہی نہیں اور اگر ہوئی ہے تو چور وہ خود ہے۔

چوہدری نے یہ بھی سوچا تھا کہ لوگ جاگ اٹھیں گے تو جیدا کسی کوارٹر میں نہیں چھپ سکے گا مگر اس شور کا فائدہ جیدا کو ہوا۔ اُسے پتہ چل گیا کہ اُس کا تعاقب کرنے والے کہاں ہیں اور کتنی دور ہیں۔ وہ ناز اور بچے کے ساتھ برآمدے سے نکلا اور ایک اونچی باڑ کی اوٹ میں ہو گیا۔ چاندنی اتنی شفاف تھی کہ چاند بھی جیدا کا دشمن ہو گیا۔

باڑ کی دوسری طرف سے کوئی گزر رہا تھا۔ جیدا باڑ کے سائے میں تھا۔ آدمی کی چال بتا رہی تھی کہ وہ اُسے ڈھونڈ رہا ہے۔ جیدا اور ناز دبکے رہے۔ وہ آدمی ذرا آگے جا کر گھوما اور باڑ کے اندر آگیا۔ وہ چاندنی میں تھا۔ جیدا کو صاف نظر آگیا کہ اُس آدمی کے ہاتھ میں ریوالور ہے۔ وہ دبے پاؤں، بڑی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا جیدا کی طرف گیا۔ جیدا بھاگ نہیں سکتا تھا۔ اُس نے ریوالور سیدھا کیا۔ گولی چلا دی۔ وہ کانسٹیبل تھا۔ وہ رکا اور آہستہ آہستہ اُس کے گھٹنے دہرے ہونے لگے۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور گر پڑا۔

جیدا اُس کی طرف دوڑا اور اُس کا ریوالور اٹھا کر ناز کے پاس گیا۔ ریوالور ناز کو دے کر بولا — "تم نے ریوالور چلایا کبھی نہیں۔ یہ تو جانتی ہو کہ کیسے فائر ہوتا ہے۔ اب ڈرنا اور سوچنا نہیں۔ کوئی بھی سامنے آئے، ریوالور اُس کی طرف کر کے گولی چلا دینا۔"

"میں کسی کو قتل نہیں کر سکوں گی" — ناز نے ڈری ہوئی آواز میں کہا۔

"تمھارے ہاتھوں کوئی بھی قتل نہیں ہوگا" — جیدا نے کہا — "جو کوئی سامنے آئے تم گولی چلا دینا۔ گولی ادھر اُدھر سے نکل جائے گی اور وہ آدمی بھاگ جائے گا۔"

وہ کانسٹیبل گر چکا تھا۔ جیدا نے ناز کو ساتھ لیا اور دونوں دوڑ پڑے۔ بچے کو جیدا نے اٹھا لیا تھا۔ اٹیچی کیس ناز کے ہاتھ میں تھا۔ انہیں انسپکٹر چوہدری اور اُس کے آدمیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جن سے جیدا اُن سے فاصلے اور سمت کا اندازہ کر رہا تھا مگر اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے وہ اور ساتھی کہاں ہیں۔ اُس کے لیے اوٹ کافی تھی۔ آگے جھگیاں آگئیں جو ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں نے بنائی تھیں۔ جیدا نے جھگیوں کے اندر جانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان کی گلیاں بہت تنگ ہیں اور دو تین جھگیوں کے بعد مڑ جاتی ہیں اور بعض گلیاں جھگیوں میں ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ ان میں پھسلن بھی تھی کیونکہ پانی کے نکاس کا کوئی انتظام نہ تھا۔

وہ ان کی اوٹ میں ہو گیا۔ اُسے دور پیچھے سے آواز سنائی دی — "چوہدری صاحب! حفیظ گیا ہے۔ یہ مرا پڑا ہے" — ایک اور آواز آئی — "مت رکو۔ وہ کہیں نہیں جا سکتا۔"

"جیدے!" — یہ انسپکٹر چوہدری کی بڑی ہی بلند للکار تھی — "جہاں کہیں ہو وہیں رک جاؤ۔ میری گولی

نہ مرو... جیدے! مقدمہ لڑ لینا۔ کتے کی موت نہ مرو۔"

جیدا اس للکار کو سنتا آگے بڑھتا گیا۔ اُس نے ناز کو بتایا کہ بابا موسیقار کا گھر دور نہیں، پناہ وہیں ملے گی۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتا آگے بڑھ رہا تھا کہ قریب سے کسی نے چیتے کی طرح جست لگا کر اُسے پیچھے سے دبوچ لیا۔ جیدا کے دونوں بازو جکڑے گئے۔ اُس نے بچے کو بھی اٹھا رکھا تھا۔

"ناز!" — جیدا نے کہا — "اِس کے سر پر ریوالور مارو۔"

ناز اُس کی طرف دوڑی۔ وہ آدمی جھگیوں میں رہنے والا تھا۔ وہ ریوالور کا نام سنتے ہی جیدا کو چھوڑ کر ایک گلی میں غائب ہو گیا۔ ناز نے اُس کے پیچھے ریوالور فائر کر دیا۔ وہ آدمی تو بچ نکلا مگر گولی کے دھماکے نے ان کی نشاندہی کر دی۔ جیدا کے کہنے پر ناز [illegible] کے ساتھ دوڑ پڑی۔ اس کے ساتھ ہی یہ مشکل پیدا ہو گئی کہ بچہ جاگ اٹھا اور رونے لگا۔ جیدا بچے کو پچکارنے لگا۔ ناز نے بھی اُس سے پیار کیا لیکن بچہ بستر پر نہیں تھا اور اُس کے اوپر کسی کمرے کی چھت نہیں تھی۔ وہ جنہیں اپنے ماں باپ سمجھتا تھا وہ دوڑے جا رہے تھے۔ اِس لیے بچہ ڈر کر اور اونچا رونے لگا۔

ریوالور کی ایک گولی فائر ہوئی جو زناٹے سے جیدا کے قریب سے گزر گئی۔ یہ انسپکٹر چوہدری کے ریوالور کی گولی تھی۔ اُس نے جیدا اور ناز کو دیکھ لیا تھا۔ وہ دونوں قریب ہی ایک مکان کی اوٹ میں ہو گئے۔ انہیں انسپکٹر چوہدری کی للکار ایک بار پھر سنائی دی — "جیدے! بزدلوں کی موت نہ مر۔ سامنے آجا۔"

آگے وہ کوارٹر آگئے جن میں سے ایک میں بوڑھا ستار نواز رہتا تھا۔ وہ گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اُس کے دروازے پر بڑی زور کی دستک ہوئی۔ اُس کی آنکھ کھلی تو دستک اور زیادہ زور سے ہوئی۔ وہ کچھ گھبراہٹ اور کچھ غصے میں اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔

"جیدا ہوں بابا جان!" — جیدا نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا — "ناز اور بچہ ساتھ ہیں۔"

وہ دروازے سے ابھی باہر تھے۔ ایک ریوالور فائر ہوا۔ جیدا نے ناز سے کہا کہ اندر ہو جاؤ۔ ناز بجلی کی پھرتی سے جیدا کے ساتھ اندر ہو گئی۔

"بابا جان!" — جیدا نے کہا — "دروازہ بند کر دو۔ ہمارے پیچھے پولیس ہے... تم اندر چلے جاؤ۔ بابا جان! تم اندر چلے جاؤ۔"

وہ جب دروازے پر کھڑے تھے، ایک کانسٹیبل نے انھیں دیکھ لیا تھا۔ دوسری طرف سے انسپکٹر چوہدری آگیا تھا۔ جیدا بوڑھے کو کچھ بھی نہ بتا سکا کیونکہ دروازہ بجنا شروع ہو گیا تھا اور ساتھ یہ للکار —

"دروازہ کھول جیدے! تو نکل کے نہیں جا سکتا۔"

"انسپکٹر چوہدری!" — جیدا نے للکار کا جواب دیا — "تو مجھے جانتا ہے.... دروازہ نہیں کھلے گا بزدل انسان! تو دھوکہ دے کر آیا ہے۔"

"پاگل مت بن جیدے!"

"مجھے پکڑ کر تو ڈی۔ ایس۔ پی نہیں بن سکے گا چوہدری!"

جیدا نے روتا ہوا بچہ ناز کو دے دیا اور سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا ایسی جگہ لیٹ گیا جہاں سے وہ باہر فائر کر سکتا تھا۔ اُس نے ریوالور کی نالی نیچے کر کے گولی چلا دی جو کسی کو بھی نہ لگی۔

"جیدا!" ـــ ناز نے اُسے پکار کر کہا ـــ "مجھے کوئی جگہ بتاؤ۔ میں کھڑی کیا کر رہی ہوں۔"

"اندر ہو جاؤ ناز!" ـــ جیدا نے کہا ـــ "میں عورت کو نہیں لڑاؤں گا۔ مر گیا تو جو سامنے آئے، اُس پر گولی چلا دینا۔"

اتنے میں گشت کی پولیس کے چار کانسٹیبل جن کے پاس رائفلیں تھیں، اِدھر آ گئے۔ وہ گولیوں کے دھماکے سُن کر آتے تھے۔ انسپکٹر چوہدری نے دو کو کوارٹر کے پچھواڑے بھیج دیا اور دو کو ساتھ والے کوارٹر کی دیوار پر چڑھانے لگا۔ خود سامنے والے کوارٹر کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد عورت محاصرے کی ہو گئی۔ سامنے والے کوارٹر کی منڈیر پر چوہدری اور خادم حسین نے مورچہ باندھ لیا۔ ساتھ والے کوارٹر کی چھت پر دو کانسٹیبل چڑھ گئے تھے۔ پچھواڑے بھی کانسٹیبل تھے۔ جیدا نے آخری سیڑھی پر مورچہ باندھ لیا۔ اُس کے آگے اچھی آڑ تھی۔ اُس نے ریوالور فائر کیا جس سے اُس کی نشاندہی ہو گئی۔ اُس پر چار پانچ گولیاں آئیں۔

بوڑھا موسیقار حیران و پریشان کمرے میں کھڑا تھا اور ناز اُسے بتا رہی تھی کہ وہ کس طرح اس پھندے میں آئے ہیں۔ ناز نے بچّے کو اٹھا رکھا تھا اور اُسے بہلا رہی تھی۔ بچّہ اپنے ابّو کو پکار رہا تھا۔

کراچی کی رات گولیوں کے دھماکوں سے لرزنے لگی۔ جیدا کے مُنہ سے کربناک "اوہ" نکل گئی۔ ایک گولی اُس کے بائیں کندھے میں لگ گئی تھی کہیں سے وہ نظر آ رہا تھا۔

"چوہدری!" ـــ جیدا نے بڑی ہی بلند آواز میں کہا ـــ "آج تمہیں بتاؤں گا کہ پولیس مقابلہ کیا ہوتا ہے۔ کل اخباروں میں سچے پولیس مقابلے کی خبر چھپے گی۔ تم ملزم کو دھوکے میں قتل کر کے اسے پولیس مقابلہ کہا کرتے ہو۔"

اُس نے ساتھ والے کوارٹر کی منڈیر پر گولی چلائی۔ "ہائے مارا گیا" کی آواز سنائی دی اور ایک کانسٹیبل ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی جیدا نے اپنی پوزیشن بدلی مگر سامنے والے کوارٹر کی منڈیر سے وہ صاف نظر آ گیا۔ ایک گولی آئی جو اُس کی ہنسلی سے ذرا نیچے سے اُس کے جسم سے پار ہو گئی۔ جیدا لڑھک گیا مگر سنبھل کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک اور گولی آئی جو اُس کے دائیں بازو میں سے گزر گئی۔ بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اُس کے ہاتھ سے ریوالور گر پڑا۔ اُسے چکر آیا مگر اپنے آپ کو سنبھال کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اُس کے جسم سے تین گولیاں پار ہو چکی تھیں۔

وہ صحن میں پہنچا تو گر پڑا۔ ناز نے کمرے میں سے اُسے دیکھ لیا۔ وہ دوڑی آئی۔ اُس نے روتے ہوئے بچے کو اٹھا رکھا تھا۔ وہ جیدا کے قریب بیٹھ گئی اور اُسے بُلایا۔

"ناز!" ـــ اُس نے ناز کے منہ پر ہاتھ پھیرا اور کہا ـــ "معاف کر دینا، تمھاری حفاظت نہ کر سکا۔"

ناز نے چاندنی میں جیدا کو خون میں نہایا ہوا دیکھا تو بپھر کر اُٹھی۔ اُس کے ایک بازو میں بچہ تھا جسے اُس نے سینے سے لگا رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُسے سامنے والے کوارٹر کی منڈیر پر انسپکٹر چوہدری نظر آ گیا۔ چوہدری نے دیکھ لیا تھا کہ جیدا صحن میں گرا پڑا ہے، اس لیے وہ کوئی خطرہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ناز نے ریوالور سیدھا کیا اور گولی چلا دی۔ چوہدری منڈیر سے نیچے آ پڑا۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ والے کوارٹر کی منڈیر سے دو دھماکے ہوئے۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ ایک گولی بچے کی پیشانی میں لگی۔ دوسری ناز کے سینے میں داخل ہو گئی۔ وہ گری لیکن اُس نے بچے کو اپنے بازو میں جکڑے رکھا۔

بوڑھے موسیقار نے دیکھا تو اُس نے برآمدے اور صحن کے بلب جلا دیئے اور صحن میں آ کر بلند آواز سے بولا ـــ "بدبختو! یہ تینوں مر چکے ہیں۔ آ جاؤ" ـــ اور وہ جیدا اور ناز کے پاس بیٹھ کر ہچکیاں لینے لگا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو اُس نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سب سے پہلے ہیڈ کانسٹیبل خادم حسین اندر آیا اور دوڑ کر جیدا کے پاس آن بیٹھا۔

"قسم لے لو دوست!" ـــ اُس نے جیدا سے کہا ـــ "میں نے سب گولیاں ہوا میں چلائی تھیں۔"

جیدا مُسکرایا۔ کانسٹیبل جو بچ گئے تھے اندر آ گئے۔ جیدا نے ناز کو اپنے قریب پڑے دیکھا تو اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے ناز کا ہاتھ پکڑ لیا اور مُسکرایا۔ اُس نے دیکھا کہ گولی ناز کے سینے میں اور بچّے کی پیشانی میں لگی ہے۔

"یاد ہے تمہیں ناز!" ـــ اس نے کہا ـــ "تم نے میرے کمرے میں ماں اور بچّے کی تصویر لگائی تھی اور میں نے ایک دن تصویر پر دو گولیاں چلائی تھیں۔ ایک گولی ماں کے سینے میں اور دوسری بچّے کی پیشانی میں لگی تھی۔ تم نے وہ تصویر وہیں لگی رہنے دی تھی۔ میں یہ تصویر اس دنیا سے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اب ہم آزاد ہیں۔ ہمارے دُکھ ختم ہو گئے ہیں۔"

بچہ مر چکا تھا۔ ناز کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اُس نے جیدا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور اُس نے آخری ہچکی لی۔ اُس کے مردہ ہاتھ کی گرفت جیدا کے ہاتھ پر اور زیادہ سخت ہو گئی۔ جیدا نے بوڑھے موسیقار کی طرف دیکھا، پھر اپنے گرد کھڑے پولیس کے آدمیوں کو دیکھا۔

"میں جا رہا ہوں" ـــ اُس نے کہا ـــ "کل ایک اور جیدا میری جگہ لے لے گا... میں خوش ہوں کہ اپنے گناہوں کی سزا پا لی ہے۔ مجھے سزائے موت ملنی چاہیئے تھی۔ میں نے اسی طرح انسانوں کا خُون بہایا تھا" ـــ اُس کی آواز لڑکھڑانے لگی۔ اُس نے بوڑھے موسیقار کی طرف دیکھا مگر یہ بوڑھا چہرہ دھندلا گیا۔

خاموش فضا میں ایک مترنّم صدا تیرنے لگی ـــ "اللہ اکبر، اللہ اکبر"... جیدا نے آہستہ آہستہ گردن گھمائی جیسے اس مقدّس صدا کو ڈھونڈ رہا ہو۔ وہ ایک طرف لڑھکنے لگا۔ بوڑھے موسیقار نے اُسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا اور گرنے نہ دیا۔ تانپورے کی ملکی ملکی گونج کی طرح جب جیدا کے کانوں میں یہ آواز پڑی ـــ "اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِّنَ النَّوم" ـــ اُس کا سر ڈھلک گیا اور وہ نیند سے جگانے والی مقدّس اور مترنّم صدا پر ابدی نیند سو گیا ـــ سینے میں دُکھوں کا زہر، اور پیار کا تریاق اور پولیس کی تین گولیاں لیے!